دیوانِ مصحفی

۱

ڈنیا سے ہم چلے گئے ناچار مصحفی
اِک یادگار اپنا یہ دیوان رہ گیا

مجلس
اشاعتِ
ادب

دیوانِ مصحفی

(اوّل)

ناشر:۔ مجلس اشاعتِ ادب دہلی

تاریخ اشاعت:۔ جنوری ۱۹۶۶ء

~~قیمت ——— آٹھ روپے~~

قسم اعلیٰ ——— بارہ روپے

مطبع:۔ دلی پرنٹنگ ورکس۔ دہلی

خطِ سرنوشتِ ما

قدیم تذکرہ نویسوں سے جدید تنقید نگاروں تک، سبھی نے مصحفی کے کمال کا اعتراف کیا ہے اور تسلیم کیا ہے کہ میر و مرزا کے سوا شعرائے متقدمین میں کوئی ان کا ہم پلہ نہیں۔ انھیں لکھنؤ اسکول کی صحت مند اقدار کا بانی کہا جائے تو بجا ہے۔ جرأت و انشا کا رنگ مقبول خاص و عام ہونے کے باوجود مصحفی نے اپنے عہد کو سب سے زیادہ متاثر کیا، اور سچ تو یہ ہے کہ شعرا کی آنے والی نسل نے انھیں کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی لیکن کتنا بڑا المیہ ہے کہ ایسے اہم شاعر کا کلیات آج تک قلمی دواوین کی شکل میں ہند و پاک کی دور و دراز مقامات پر واقع مختلف لائبریریوں میں مقفّل تھا۔ اس کا سبب ایک تو ان اصحاب کا تغافل ہے جو "کلیاتِ مصحفی پر تذکرہ ہندی کو ترجیح دیتے ہیں" لیکن اس کی دو وجوہ اور بھی ہیں جن میں سے ایک خود مصحفی کی پُرگوئی ہے۔ مصحفی کا اُردو کلام آٹھ دواوین اور ایک مجموعۂ قصائد (کل تقریباً ساڑھے تین ہزار صفحات) پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے، اتنا ضخیم کلیات شایع کرنے کی ہمّت کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ دوم یہ کہ دواوینِ مصحفی کے نسخے ہند و پاک کے طول و عرض میں بکھرے پڑے ہیں۔ اس لیے پورے کلام کا فراہم کرنا اور تمام نسخوں سے مقابلہ کرنا بڑا صبر آزما کام تھا۔ بالآخر مجلس اشاعتِ ادب نے کلیاتِ مصحفی کی اشاعت کی عظیم ذمہ داری قبول کی۔ دواوین کی نقلیں اور عکس حاصل کیے گئے۔ ہندوستان اور پاکستان میں جتنے نسخے دریافت اور دستیاب ہوئے، اُن سے استفادہ کیا گیا اور اب دیوانِ اوّل پیشِ خدمت ہے۔ اسے کلیّاتِ مصحفی کی اشاعت کے سلسلے میں پہلا قدم سمجھنا چاہیے۔ دیوانِ اوّل کی اشاعت اب سے ایک سال پہلے بھی ممکن تھی، لیکن ہماری

خواہش یہ تھی کہ کلیات کی ترتیب و تدوین کا کام مکمل ہونے کے بعد ہی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا جائے تاکہ پورے سیٹ کے لیے انتظار نہ کرنا پڑے دیوانِ اوّل کے جتنے نسخے ہم دریافت کر سکے ہیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے :-

رام پور رضا لائبریری ، رامپور

(۱) دیوانِ اوّل کا اقدم مخطوطہ رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔ ترقیمے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کتابت ۲۹ رجب ۱۲۱۱ھ، ۲۸ جنوری ۱۷۹۷ء کو ختم ہوئی۔ اس کی ایک اور اہمیت یہ ہے کہ اس پر "گزرانیدہ مصحفی" درج ہے۔ تعجب ہے، اس میں کتابت کی غلطیاں موجود ہیں۔ اگر مندرجہ بالا بیان کو درست تسلیم کر لیا جائے تو بھی یہ بالکل ظاہر ہے کہ کتابت کے بعد مصحفی اِس پر سرسری نظر بھی نہ ڈال سکے۔ تاہم اس کی اوّلیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور یہی اس کی اہمیت ہے۔ متن کی اساس اسی نسخے کو قرار دیا گیا ہے۔ اختلافِ نسخ میں "اصل" سے یہی نسخہ مراد ہے۔

رضا لائبریری کے نسخوں میں اوراق کی ترتیب کسی وجہ سے غلط ہو گئی ہے۔ جن جلدوں پر دیوانِ اوّل، دیوانِ دوم، دیوان سوم اور دیوانِ چہارم درج ہے، دراصل وہ صرف پہلا اور تیسرا دیوان ہیں۔ چوں کہ اس سے نقل کے وقت دوسرے نسخے سامنے نہ تھے، اس لیے ترتیب میں بڑی الجھنیں درپیش آئیں لیکن بہت سا کام نائب مہتمم جناب اکبر علی خان صاحب کے تعاون کے سبب آسان ہو گیا۔

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری ، بانکی پور ، پٹنہ

(۲) بانکی پور کے نسخے بہتر حالت میں ہیں اور ان میں کتابت کی غلطیاں بھی بہت کم ہیں۔ دیوانِ اوّل پر کوئی ترقیمہ موجود نہیں۔ دیوانِ ششم کے ایک نسخے کے علاوہ بانکی پور کا پورا سیٹ ایک ہی کاتب کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔ دیوانِ چہارم کے ترقیمے سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ احمد علی خاں (کاتب) ساکن احمد گنج ملازم توپ خانہ کا بیان ہے کہ نسخوں کی کتابت ۲۵ صفر ۱۲۴۳ھ، ۷ ستمبر ۱۸۲۷ء بعہد غازی الدین حیدر ختم ہوئی۔ کاتب نے یہ بھی صراحت کر دی ہے کہ "حضور والا میاں مصحفی سے بہ دل عقیدت رکھتے تھے اور خود کو ان کے تلامذہ میں شمار کرتے تھے" نیز یہ کہ مصحفی کی وفات کے تین سال بعد

آٹھوں ودّادیں فراہم کر کے لکھے گئے۔

کتب خانہ دار العلوم اسلامیہ دیوبند

(۳) نسخۂ دیوبند مصحفی کی وفات کے ۸ سال بعد ۲ ربیع الاول سنہ ۱۲۴۹ھ ۲۰ جولائی سنہ ۱۸۳۳ء کا مکتوبہ ہے۔ یہ نسخہ اغلاط سے پاک اور بہت مکمّل ہے۔ رامپور اور دیوبند کے نسخوں میں بڑی حد تک مطابقت پائی جاتی ہے۔ اس نسخے تک ہماری رسائی محترم مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی بدولت ہوئی جس کے لیے ہم موصوف کے شکر گزار ہیں۔

لکھنؤ یونیورسٹی ٹیگور لائبریری، لکھنؤ

(۴) دیوان اوّل کا ایک نسخہ ٹیگور لائبریری میں موجود ہے۔ اس کی کتابت ۱۳ صفر سنہ ۱۲۷۹ھ ۱۰ اگست سنہ ۱۸۶۲ء کو ختم ہوئی یہ نسخہ بھی مکمّل، صاف اور خوشخط ہے۔ البتہ بعض جگہ سیاہی اتنی ہلکی ہوگئی ہے کہ الفاظ کا پڑھنا مشکل ہے، اس نسخے سے استفادے کے دوران محترم ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی پروفیسر و صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے مفید مشوروں نے بہت سی مشکلات آسان کر دیں۔ ادارہ موصوف کا ممنون ہے۔

پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور

(۵) پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے اورینٹل سیکشن میں سنہ ۱۲۶۴ھ سنہ ۸-۱۸۴۷ء کا مکتوبہ ایک نادر مخطوطہ محفوظ ہے جس پر "کلیاتِ مصحفی" درج ہے۔ یہ بڑی تقطیع کے ۵۴۰ صفحات پر مشتمل ایک ضخیم نسخہ ہے۔ ہر صفحے پر اوسطاً پچیس اشعار ہیں۔ دیوانِ مصحفی کا کوئی نسخہ اتنا غلط اور بدخط ہماری نظر سے نہیں گزرا لیکن اسی کے ساتھ یہ ایک نمایاں خصوصیت کا بھی حامل ہے۔ اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کاتب کے سامنے رامپور اور پٹنہ کے نسخے یا ان کی نقلیں موجود تھیں۔ نقل رامپوری نسخے کے مطابق ہے لیکن کاتب نے جابجا الفاظ قلمزد کر کے وہ الفاظ لکھ دیے ہیں جو پٹنہ کے نسخے میں موجود ہیں۔ مثال کے لیے ملاحظہ ہو اختلاف نسخ متعلق شعر نمبر ۱۷ صفحہ نمبر ۱۴ اختلافِ نسخ میں اس نسخے کے لیے 'لا' بطور علامت استعمال کیا گیا ہے۔ ادارہ، عبد الرحیم صاحب (لائبریرین) اور لائبریری کمیٹی کا شکر گزار ہے کہ انھوں نے اس مخطوطے کا عکس لینے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

(۶) اسی لائبریری میں دیوانِ اوّل کا ایک مخطوطہ چھوٹی تقطیع پر موجود ہے۔ کتابت صاف اور روشن مگر غلط ہے۔ جو الفاظ کاتب کی سمجھ میں نہیں آئے وہ یا تو بجنسہٖ نقل کرنے کی کوشش کی ہے یا اس کی جگہ جو لفظ کاتب کو مناسب معلوم ہوا وہ لکھ دیا گیا ہے۔ مثلاً مطرد کی جگہ منفرد، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے "مصحفی

اور ان کا کلام" کے لیے اسی نسخے سے اشعار کا انتخاب کیا ہے۔ اختلافِ نسخ میں اس کے لیے 'لب' بطور علامت استعمال کیا گیا ہے۔

(۷) اسی شعبے میں دیوانِ مصحفی اوّل کی ایک ٹائپ شدہ کاپی موجود ہے۔ اس کی مرتب محترمہ فرحت جہاں ہیں، جنھوں نے ایم۔ اے۔ اردو (۱۹۶۳ء) کے لیے یہ دیوان ردیف الف سے ردیف نون تک مرتب کیا ہے۔ افسوس ہے کہ اس میں "لب" کی تقریباً تمام غلطیاں بجنسہٖ منتقل ہو گئی ہیں بلکہ بعض جگہ تو اضافہ ہو گیا ہے۔ دیوانِ اوّل کے مزید نسخے ان کی دسترس سے باہر تھے اور 'لا' کا پڑھنا دشوار تھا مجبوراً موصوفہ نے 'لب' کو اپنے نسخے کے متن کی بنیاد بنایا۔ اختلافِ نسخ میں اس نسخے کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

انڈیا آفس لائبریری، لندن

(۸) محترمی ڈاکٹر افضل امام لکچرر پٹنہ یونیورسٹی کی عنایت سے، انڈیا آفس لائبریری کی ایک نادر بیاض تک ہماری رسائی ہوئی۔ اس کا نمبر $\frac{79\ D\ 117\ U}{B\ 224}$ ہے۔ اس بیاض پر نہ سنِ کتابت درج ہے نہ کاتب کا نام۔ اسی میں مصحفی کے چھ دواوین کا مبسوط انتخاب موجود ہے۔ اس سے دواوین کی ترتیب میں خاص مدد ملی ہے۔

(۹) حکومتِ مغربی بنگال کے ذخیرے سے ہمیں کلامِ مصحفی کی دو ضخیم جلدیں ملیں۔ پہلی جلد ۹۶۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مصحفی کے قصائد ہیں۔ دوسری ضخیم جلد پر نمبر نہیں لیکن صفحات کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے۔ اس میں صرف غزلیات درج ہیں۔ دونوں جلدوں میں سے کسی پر سنِ کتابت درج نہیں۔

انتخابات اور مستند مطبوعہ تذکروں کے علاوہ مندرجہ ذیل قلمی تذکروں سے بھی مقابلہ کیا گیا ہے۔

۱۔ شاہ کمال : مجمع الابیات (سالار جنگ میوزیم لائبریری حیدر آباد)

۲۔ خوب چند ذکا : عیار الشعرار (کتاب خانہ، انجمن ترقیِ اردو، علی گڑھ)

۳۔ سعادت خاں ناصر : خوش معرکۂ زیبا (خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ)

۴۔ قدرت اللہ شوق : طبقات الشعرا (سنٹرل اسٹیٹ لائبریری حیدر آباد)

۵۔ خیراتی لال بے جگر : تذکرۂ بے جگر (عکس مملوکہ مخدومی مالک رام صاحب)

اس دیوان کی ترتیب مخدومی ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صدر و پروفیسر شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی کی توجہ اور رہنمائی سے عمل میں آئی ہے۔ موصوف کے علاوہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، محترم مالک رام صاحب، غلام احمد صاحب علمی اور پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب، محترم رشید حسن خاں صاحب، قاضی عبد الودود صاحب، جناب نشتر خانقاہی، مشیر جھنجھانوی کے مفید مشورے بھی ہمیں حاصل ہوتے رہے ہیں۔ جناب حفیظ عبّاسی نے اس کی ترتیب میں مدد کی اور جناب مودود صدیقی نے طباعت کا اہتمام کیا۔

اختلاف نسخ

اختلاف نسخ دیوان کے آخیر میں درج ہے۔ مختلف نسخوں کے لئے علامات مقرر کی گئی ہیں اور اشاریے میں اس کی صراحت کر دی گئی ہے۔ جہاں یہ یقین تھا کہ یہ محض کتابت کی غلطی ہے اور اس کا درج کرنا غیر ضروری ہے، اس اختلاف کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

اختلافِ نسخ کے سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ مصحفی کو ایک کے بعد دوسرا دیوان مکمّل کرنے کا اتنا شوق تھا کہ اپنے کلام پر نظر ثانی کرنے کی مہلت ہی نہ ملتی ہوگی۔ اس کے ثبوت میں نسخہ رامپور اور نسخہ دیوبند پیش کئے جا سکتے ہیں۔ نسخہ رامپور اقدم اور "گزرانیدہ مصحفی" ہے۔ دیوبند کا نسخہ مصحفی کی وفات کے بعد لکھا گیا لیکن دونوں میں مکمّل مطابقت پائی جاتی ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جن نسخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے، وہ کاتبوں کا پیدا کردہ ہے۔

اِملا

زیر نظر دیوان میں املا موجودہ روِش کے مطابق کر دیا گیا ہے۔ مثلاً ایدھر کی جگہ اِدھر، اُودھر کی جگہ اُدھر لیکن جہاں ایسا کرنے سے مصرع ساقط الوزن ہو جاتا ہے وہاں اُسی طرح رہنے دیا گیا ہے۔ جیسے:-

اپنا بھی یہ چہرہ گلِ خورشید کے مانند
رُخ یار کا جیدھر گیا۔ اودھر ہی گیا پھر

بعض جگہ ہوجیو کو ہوجو، ہوجیے کو ہوجے، نہیں کو نئیں (بروزنِ فع) کوئی کو گئی،

آپ ہی کو آپھی پڑھنا ہوگا۔ ورنہ مصرع وزن سے گر جائے گا۔ اس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:۔

ہُوجو (ہُوجیو)	مت ہوجیو اس بلا میں گرفتار دیکھنا
کوئی :۔	میں سمجھا تھا کُئی قطرہ ہووے گا ان میں
	جو دیکھا تو آنکھوں سے طوفان نکلا
آپھی (آپ ہی)	آپھی دمِ شمشیر ہے، یاں ہم پہ دم اپنا
	کس واسطے کرتا ہے تو تیغا علم اپنا
اُپر (اوپر)	ہزار حیف ہے اس عندلیبِ غافل پر
	کہ آیا جس کے اوپر وقت بے خبر صیّاد
کیدھر :۔	اے میری جان سچ کہہ کیدھر تو چھپ رہا ہے
	سر پیٹتے پھریں ہیں یاں شیخ و شاب اپنا
رنّگا :۔	کیا خون میں رنگّے تھے کہیں رات کو تو نے
	بازی ترے ہاتھوں سے جو گل ہار اٹھا ہے

فرہنگ

فرہنگ کی تیاری میں مندرجہ ذیل لغات سے استفادہ کیا گیا ہے۔

فرہنگ آصفیہ، فیروز اللغات، پلیٹس، اسٹین گاز، لغت آنند راج، بہارِ عجم، اصطلاحاتِ پیشہ وراں، فرہنگِ عامرہ، رسالہ تذکیر و تانیث، غیاث اللغات، وغیرہ۔

یکم جنوری ۱۹۶۶ء

(ادارہ)

اے مصحفیؔ ز گوشۂ خلوت بروں خرام!



غلام ہمدانی مصحفی

۱

لگے گر ہاتھ میرے تار اُس زلفِ معنبر کا
تو ہووے باعثِ شیرازہ ان اجزائے ابتر کا

بہ دورِ مے کشی جب سے تری آنکھوں کو دیکھا ہے
ستارہ تب سے جوں خورشید گردش میں ہے ساغر کا

وہ صیدِ سختِ جاں ہوں میں کہ جس کی سخت جانی سے
ہوا جاتا ہے دم برگشتہ وقتِ ذبح خنجر کا

اڑے ہے بسکہ دل اندر ہوائے نامہ پردازی
ہر اک نالہ ہمارا بال ہے جیسے کبوتر کا

وہ خاکستر نشیں ہوں میں کہ مثلِ اخگرِ آتش
نہ مجھ کو فکر بالاپوش کا ہے اور نہ بستر کا

کلیجا چھن گیا ہے آہ و نالے سے مرا یاں تک
کہ اب جو دم نکلتا ہے تو جیسے دود مجمر کا

نہ ہوگی جاں کنی کے وقت ہرگز تشنگی غالب
کہ تو اے مصحفی مدّاح ہے ساقیِ کوثر کا

۲

خداوندا! نہیں مشتاق میں سرو و صنوبر کا
بروزِ حشر ہو سر پر مرے سایہ پیمبر کا

گیا ہوں جان سے تو بھی تڑپ اک مجھ میں باقی ہے
خدا جانے کہ میں مذبوح ہوں کس دست و خنجر کا

پڑا رہتا ہے اکثر راہ میں دامن درازوں کی
یہ سر مشتاق ہے کیا جانے کن پائوں کی ٹھوکر کا

جوابِ نامہ تو معلوم اس کے پاس سے آنا
کوئی پر اُڑتے اُڑتے شاید آ پہنچے کبوتر کا

غرض ہر وقت روتے ہی رہے ہم دل کے ماتم میں — نہ سُوکھا ایک دم رومال اپنے دیدۂ تر کا
مری آنکھوں سے گر پڑتے ہیں آنسو بیچ مجلس کی — چھلکنا جب کہ ساقی مجھ کو یاد آتا ہے ساغر کا
کئی دن مصحفی ہمسایے ٹک سکھ نیند سوئے تھے
کیا نالوں نے تیرے پھر بپا ہنگامہ محشر کا

۳

روز رومال نیا دیدۂ تر پر رکھا — ایک بہانہ میں ناسورِ جگر پر رکھا
میں اسی رشک سے مرتا ہوں کہ کل غیر نے ہائے — ہاتھ ہنگامِ قسم کیوں ترے سر پر رکھا
جھڑ پڑا داغ چمن میں جو کوئی لالے کا — ہم نے وہ داغ اٹھا اپنے جگر پر رکھا
کیوں نہ دل دیکھ اسے ہاتھ سے جاوے یک بار — ایسے ہی ناز سے جب اُن نے کمر پر رکھا
کیا برا ہے جو رہے مصحفی نت یاں بیٹھا
تم یہی جانیو دربان ہے در پر رکھا

۴

جب سرِ انگشت کو میں دیدۂ تر پر رکھا — نام آنسو نے مری سلکِ گہر پر رکھا
مارے بیتابی کے آیا مرے منہ تک، ہر چند — دستِ تسکیں میں بہت اپنے جگر پر رکھا
اُس کی آنکھوں کو نہ دیکھا کبھی دیں داروں نے — جرمِ نظّارہ عبث میری نظر پر رکھا
حد دغا باز ہے بے تو بھی، کہ کل وعدہ کر — غیر سے شام ملا، ہم کو سحر پر رکھا
کیا بچوں گا میں، کہ دل کے مرے خمیازوں نے — ایک ٹانکا نہ مرے زخمِ جگر پر رکھا
کیا کروں شکر ادا آپ کے آنے کا، کہ رات — جو قدم تم نے کہ رکھا مرے سر پر رکھا
مصحفی چاہیے کیا پھر اسے اُٹھ چلنے کو
جس مسافر نے کہ دل اپنا سفر پر رکھا

۵

شب جو اُس نے قدم اپنا مرے سر پر رکھا
میں نے سر پر سے اٹھا دیدۂ تر پر رکھا

تیرے بیٹھے جو ہمیں یاد بھی آیا کوئی کام
ہم نے موقوف اُسے وقتِ دگر پر رکھا

چونک اٹھا وہ کہ تمھیں خیر ہے صاحب اے واہ
شب جو میں دستِ خیال اُس کی کمر پر رکھا

شوقِ نظارۂ دیدار نے تیرے شبِ دوش
تا سحر دیدہ مرا روزنِ در پر رکھا

چار ٹکڑے ہو مرے داغ کا اُترا جو کھرنڈ
لے کے لالے نے اُسے اپنے جگر پر رکھا

کچھ ادا دیکھی کہ کل کھینچ کے اُس کافر نے
نیمچہ مصحفیِ خستہ کے سر پر رکھا

۶

سو سو طرح کا حادثہ تجھ پر گزر چکا
پر اے دل ایک روز کہیں تو، نہ مر سکا

اتنا بھی خال و خط کا بنانا ہے کیا میاں
بس رکھیو آئنہ کہ یہ مکھڑا اسنور چکا

قیمہ کرے گا کیا کہیں، اب مجھ سے ہاتھ اٹھا
تا قبضہ نیمچہ تو ترا خوں سے بھر چکا

اس ہاتھ سے یہ دل نہ تسلّی ہوا، دریغ
سو مرتبہ میں دل کے اوپر ہاتھ دھر چکا

اے یار وقتِ چہرہ خراشی و مو کنی ق
کیا کیا نہ میرے ہاتھوں سے مجھ پر گذر چکا

اک سر پہ خاک ڈالنی باقی رہی ہے سو
دیکھو گے شام و صبح کہ میں وہ بھی کر چکا

کتنا ہی میں بِسارُوں اسے لیک مصحفی
نقشا اگر یہی ہے تو جی سے بِسر چکا

۷

آج کچھ سینے میں دل ہے خود بخود بے تاب سا
کر رہا ہے بے قراری پارۂ سیماب سا

جوں گلِ تر کیا ہی اس سے جھلکے ہے اس کا بدن
وہ جو پیراہن گلے میں اس کے ہے اک آب سا

یاد میں کس فندقِ پاکی میں روتا ہوں کہ آج
جو سرشک آنکھوں سے گرتا ہے سو ہے عنّاب سا

میں ہوں اور خلوت ہے اور پیشِ نظر معشوق ہے
ہے تو بیداری و لے کچھ دیکھتا ہوں خواب سا

کوزۂ دولاب وش زیر و زبر ہیں آدمی
جب تلک یہ آسماں گردش میں ہے دولاب سا

کل شبِ تاریک میں جوں ہی ہوا وہ بے نقاب
جلوہ گر روئے زمیں پر ہو گیا مہتاب سا

کیا کہوں حسن و لطافت جامۂ شبنم سے ہائے
نکلا ہی پڑتا ہے وہ گورا بدن مہتاب سا

مصحفی کیوں لختِ دل رونے کی کھاتا ہے قسم
ہے نمایاں کچھ تو آنکھوں میں تری خوناب سا

۸

جی جائے گا رائیگاں کسی کا
یوں کرتے ہیں امتحاں کسی کا؟

مکھڑے سے نقاب مت اٹھاؤ
کیا فائدہ، ہو زیاں کسی کا

جز آہ وہاں کوئی کرے کیا
کچھ بس نہ چلے جہاں کسی کا

ہو دیکھے فرشتہ اس پہ عاشق
ہوتا ہے وہ بدگماں کسی کا؟

آزردہ کریں ہیں اس طرح واہ
دل مفت میں، آدمیاں! کسی کا؟

اے مرغِ چمن نہیں، نہ کر شور
میراث ہے گلستاں کسی کا؟

تا فصلِ دگر رہا نہ ہرگز
اس باغ میں آشیاں کسی کا

دیتے نہیں مصحفی پھر اس کو
دل لیویں جو یہ بتاں کسی کا

۹

شب کہ دل درد و الم سے سر بہ سر لبریز تھا
شورِ محشر کی طرح ہر نالہ شور انگیز تھا

ان اداؤں کا کوئی مارا جیے کس طرح ہائے
یا ہے اب یہ گرم جوشی یا کہ وہ پرہیز تھا

ایک ہی تیشے میں سر فرہاد کا دو ہو گیا
کیا کرے فرہاد بے چارہ کہ تیشہ تیز تھا

نو بہاراں میں جو کرتے ہم بھی دعوائے جنوں
مثلِ گل چاکِ گریباں ہم کو دست آویز تھا

کی ٹک اک آبِ دمِ شمشیرِ قاتل نے کمی
ورنہ پیمانہ ہماری عمر کا لبریز تھا

اولیاؤں کو بھی کھینچا اُس نے آخر زیرِ تیغ
تو کہے وہ قاتلوں میں عصر کا چنگیز تھا

بے تہوں کو مصحفیؔ مطلق نہ سوجھا ورنہ یاں
رنگِ خونِ دل مرا ہر اشک میں آمیز تھا

۱۰

عاشقِ بیدل تو مشتاقِ نگاہِ تیز تھا
ہاتھ میں گو اس کے یارو نیمچہ رنگریز تھا

اک نگہ کے بیچ جیسے نیم بسمل کر گیا
قہر تھا، آفت تھا، لڑکا تھا کوئی خونریز تھا!

ہم نے بھی کچھ اپنی دانائی سے کی یہ راہ طے
ورنہ جو کانٹا تھا اس وادی کا، سوزن تیز تھا

ایک دم میں کر دیا یوں اس کو شیریں سے جدا!
خنجرِ شیرویہ کب کا دشمنِ پرویز تھا؟

وہ جو خط بھیجا تھا تو نے چاک کر میرے تئیں
میں جو دکھلاتا تو مجھ کو وہ ہی دستاویز تھا

گھر میں ہمسائے نہ سوئے ایک شب آرام سے
حسن اُس رشکِ پری کا بسکہ عشق انگیز تھا

کہتے ہیں دیکھ اس کی صورت مصحفیؔ کل مر گیا
کیا عجب اس کا، کہ تھا بیمار و بد پرہیز تھا

۱۱

کچھ اعتماد ان کے نہیں ارتباط کا
ہر جائیوں سے فائدہ کیا اختلاط کا

کاہے کو بیٹھوں جا کے میں واں کام کیا مرا
جس بزم میں کہ ذکر ہو عیش و نشاط کا

واشد کی آسماں سے کچھ امید ہی نہیں
روزِ ازل سے بند ہے در اس رباط کا

مستی سے گو کہ میں دمِ شمشیر پر گروں
کب ہے خیال اس کو مری احتیاط کا

گردوں پہ یہ شفق نہیں دیکھا تو مصحفیؔ
خونِ شہاں سے سرخ ہے رنگ اس بساط کا

۱۲

جب سرِ زلفِ صنم خم کھا گیا　　کام اک عالم کا برہم کھا گیا
کان میں پھونکی جو میں اس کے وہ بات　　آج تو سنتے ہی کچھ دم کھا گیا
میں ہوں کس گنتی میں از یک تا ہزار　　گالیاں اس کی تو عالم کھا گیا
تیغ سے اس کی گئے گھایل بہت　　زخم ایسے پر کوئی کم کھا گیا

مصحفی ایسا تھا کب زار و نزار
اس کے تئیں پیارے ترا غم کھا گیا

۱۳

کامِ دل اپنا تو ہرگز نہ بتاں سے نکلا　　کبھی نکلا بھی تو ہاں آہ و فغاں سے نکلا
تم تو کہتے تھے میاں، "دل ترا ہم پاس نہیں"　　سچ کہو، کیوں جی، بھلا اب یہ کہاں سے نکلا!
یوں ہے برقعے سے نمایاں جھلک اس عارض کی　　نورِ مہ پھوٹ کے جیسے کہ کتاں سے نکلا
دل میں کہتے تھے ملے یار تو کچھ اس سے کہیں"　　مل گیا وہ تو نہ اک حرف زباں سے نکلا

دوستاں! مصحفیِ خستہ کی ٹک لیجو خبر
یہ دمِ سرد سا کیا اس کے دہاں سے نکلا؟

۱۴

جو دل اس کے کوچے سے آتا رہے گا　　تو البتہ وہ تلملاتا رہے گا
پس از مرگ کیجو مری خاک تودہ　　کوئی تیر اس پر لگاتا رہے گا
لگا تارِ جاں پر جو ناخن اجل کا　　نہ رشتہ رہے گا، نہ ناتا رہے گا
نہ جاگیں گے خوابیدہ خوابِ عدم سے　　اگر ایک عالم جگاتا رہے گا
گر اس فصلِ گل میں جیے گا دِوانا　　تو ہر سال دھومیں مچاتا رہے گا
یہ شرطِ مروّت ہے اے بے مروّت! ق　　کہاں تک تو مجھ کو کڑھاتا رہے گا؟

جو ملنا ہے تجھ کو تو آ جلد مل لے	کہ پھر ہاتھ سے وقت جاتا رہے گا

نہ ہو مصحفیؔ خصمیِ دل سے ایمن
رہے گا یہ جب تک ستاتا رہے گا

۱۵

ناگہ چمن میں جب وہ گل اندام آ گیا	گل کو شکستِ رنگ کا پیغام آ گیا
اٹھا جو صبح خواب سے وہ مست پُر خمار	خورشید کف کے بیچ لیے جام آ گیا
سوچے تھا، اہلِ جرم سے کس کو کروں میں قتل	اتنے میں اس کو یاد مرا نام آ گیا
افسوس ہے کہ ہم تو رہے مستِ خوابِ صبح	اور آفتابِ عمر لبِ بام آ گیا
ہے جائے رحم حال پہ یاں اس اسیر کے	جو گرتے ہی ہوا سے تہِ دام آ گیا
گو میں تڑپ تڑپ کے دی حسرت میں اپنی جاں	بارے ٹک ایک دم کو تو آرام آ گیا
سمجھو خدا کے واسطے پیارے برا نہیں	دو دن اگر کسی کے کوئی کام آ گیا

کر قطع کب گیا ترے کوچے سے مصحفیؔ
گر صبح کو گیا، وہیں پھر شام آ گیا

۱۶

دل تجھ کو دیا، لے مرا غم خوار یہی تھا	پاس اپنے تو اے شوخ ستم گار یہی تھا
دے داد مری ورنہ میں اٹھ بولوں گا قاتل	کل حشر کے دن بھی "مرا خوں دار یہی تھا"
بے رونقیِ سینہ میں اب کس کو دکھاؤں	داغوں سے بتاں کے کبھی گلزار یہی تھا
اب جس دلِ خوابیدہ کی کھلتی نہیں آنکھیں	راتوں کو سرہانے مرے بیدار یہی تھا
دامن کو کیا رشکِ چمن خوب ہی، شاباش!	رونے کا حق اے دیدۂ خوں بار یہی تھا
لے چٹکی میں دل کھینچ لیا سینے سے اس نے	انصاف کرو تیر کا سوفار یہی تھا؟
بوسے کے عوض تم تو لگے گالیاں دینے	کل تم سے ہمارا میاں اقرار یہی تھا؟

ابرو نے تری دل ہی پہ تلوار چلائی — یعنی صفِ مرداں میں نمودار یہی تھا
یوسف کو ترے حسن پہ دوں کیونکہ بڑائی — اس کے بھی تو خال و خط و رخسار یہی تھا
اُس کو میں جو دیکھا مجھے شب اس نے تو بولا — "لاؤ اسے، کل بھی پسِ دیوار یہی تھا"
بیزاری کے عالم میں کبھی آگے سے میرے — جاتا ہے تو کہتا ہوں "مرا یار یہی تھا"
میرا دلِ پُر داغ پسند اس کی نہ آیا — ہر چند متاعِ سرِ بازار یہی تھا
دیکھی جو مری نعش تو کر اس کو اشارہ — بولا کہ "مری چشم کا بیمار یہی تھا"

کیوں مصحفیِ خستہ کے تئیں تو نے کیا قتل
کیا سیکڑوں عاشق میں گنہگار یہی تھا؟

۱۷

گر اس منہ سے برقع کبھی کھُل گیا — تو دیکھو گے مہ خاک میں رُل گیا
رہے اس کے وابستہ عمرِ دراز — نہ ہم سے یہ سودائے کاکل گیا
گیا جان سے ایک عالم میاں — ولیکن نہ تیرا تغافل گیا
رہا ہے کہاں ہم میں آرام و صبر؟ — وہ طاقت گئی، وہ تحمّل گیا
ہمیں دے گیا داغ جاتے ہوے — غرض اس گلستاں سے جو گل گیا
وہی رنگِ گل ہے، وہی چہچہے — چمن سے کہاں شورِ بلبل گیا
لگی چوٹ دل پر مرے، باغ سے — سحر نالہ کرتا جو بلبل گیا

میں کہتا تھا عاشق نہ ہو مصحفیؔ
تو ایسی ہی باتوں میں تو گھل گیا

۱۸

اب تو پھر کوچے میں اس کے شور و شر رہنے لگا — روز اک بے چارہ یاں آکر کے مر رہنے لگا
یا تو آگے دیکھتے آئینہ شرماتے تھے تم — یا وہ اب تصویر سا پیشِ نظر رہنے لگا

یہ صباحت، یہ لطافت، یہ نزاکت تس پہ ہائے
آگے ہر اک کے کھڑا تو پیشِ در رہنے لگا

اس قدر پرچا، کہ گھر خوش ہی نہیں آتا اسے
دل اُسی کوچے میں اب آٹھوں پہر رہنے لگا

چاکِ در سے جھانکنے کی یا اسے رخصت نہ تھی
یا سر اس کا اب سرِ دیوار پر رہنے لگا

ہائے کیا سر ماروں اے یارو! کہ اس سر کے تئیں
ساری ساری رات اب تو دردِ سر رہنے لگا

خشک ہونے کے قریب آیا تو تھا ٹک داغِ دل
پھر نئے سر سے یہ کچھ ان روزوں تر رہنے لگا

چل بے یاں سے دور ہو ہم تم بھی نئیں اب آشنا
راتوں کو جا جا کے تو غیروں کے گھر رہنے لگا

آگئی کیا جانیے کس بات سے اس پر شکست
اب جو یہ دل اس قدر آزردہ تر رہنے لگا

یا تو ہم نامِ سفر سے بھاگتے تھے لاکھ کوس
یا ہمیں اب ہر گھڑی عزمِ سفر رہنے لگا

مصحفیؔ کو آگے یارو یوں کب آتی تھی غشی
اب تو کچھ دو دو پہر یہ بے خبر رہنے لگا

۱۹

کیا جانے کیا کرے گا یہ دیدار، دیکھنا
اک دن میں آئنہ اسے سو بار دیکھنا

کیسی ہے اس کی ابروے خم دار دیکھنا
لینی ہے مول اس کو یہ تلوار دیکھنا

تنہا ہی جا بھڑا صفِ مژگانِ یار سے
کیا زور ہے یہ دل بھی جگر دار، دیکھنا

یاں حسن کو ہے عشق سے آفت لگی ہوئی
ظالم کوئی نہ ہو جو طرحدار دیکھنا

کھینچیں ہیں اپنی اپنی طرف زلف و خال و خط
کتنے ہیں ایک دل کے خریدار دیکھنا

عالم کو اک نگہ سے کیا تو نے قتلِ عام
ظالم ٹک اس طرف بھی تو اک بار دیکھنا

شاکی ہیں اس کے، جان و دل و دیدہ سب بہم
کس کس کے ہے وہ درپے آزار دیکھنا

کچھ پھر تو لگ چلی ہے صبا اس کی زلف سے
مت ہو جو اس بلا میں گرفتار دیکھنا

گر زلف و خط یہی ہیں تو اک دن تو میری جان
عالم کو اس بلا میں گرفتار دیکھنا

خواہی میں آب خواہ ہوں آئینہ ہر طرح
منظور ہے مجھے ترا دیدار دیکھنا

پھینٹا رکھیں ہیں سر پہ تو وہ بھی ہے یک بلک
خوباں کی کج کلاہیِ دستار دیکھنا

جب دیکھا ہم نے اس کو تو مر مر کے ہم بچے
یعنی ہمیں نہیں ہے سزاوار دیکھنا

جاتے ہی ان کے ساتھ چلی جانِ عاشقاں
ان خوش قدوں کی خوبیِ رفتار دیکھنا

بہرِ خدا تم اُس بتِ آشفتہ زلف کے
ٹک ڈھیلے پیچ ولٹ پٹی دستار دیکھنا

اے مصحفی میں تجھ سے کہوں طرفہ ماجرا
سنتا ہے، اس طرف کو ٹک اے یار دیکھنا

لیکن بشرطِ آں کہ تجھے میری ہے قسم
کیجو کسی سے اس کو نہ اظہار دیکھنا

کچھ ان دنوں میں آگو کی نسبت ترا رفیق
بے طرح ہو چلا ہے بد اطوار دیکھنا

باور نہیں ہے تجھ کو اگر یہ میرا سخن
تو آپ جا کے تو بہ شبِ تار دیکھنا

دیوار و در پہ اس کے ٹک اک رکھ کے گوش و چشم
سننا یہ حرف اور یہی اسرار دیکھنا

چھیڑے ہے اس کو غیر تو کہتا ہے اس سے یوں
"کوئی کھڑا نہ ہو پسِ دیوار، دیکھنا"

پس اس طرح ہی یک دگر اس شمع رُو کے تئیں
ہے ہر کسی سے گرمیِ بازار دیکھنا

اپنی طرف سے ہم تو میاں تجھ کو کہہ چکے
ٹک تو بھی اپنے دل میں تو اک بار دیکھنا

یہ بات ہے مناسبِ غیرت کہ روز و شب
اس کو نشستہ در برِ اغیار دیکھنا

یا تو تو اپنے دام میں لا اس کو صبح شام
یا جا کے کوئی اور طرحدار دیکھنا

۲۰

ٹک دیکھتا تو جا ترا بسمل کدھر چلا
کر ذبح اس کو ہائے تو قاتل کدھر چلا

شرطِ وفا یہی تھی بھلا، کوے عشق میں ؟
تنہا تو مجھ کو چھوڑ کے اے دل کدھر چلا

مانندِ گردباد ہے کچھ رُو بہ آسماں
آوارگانِ شوق کا محمل کدھر چلا

آنکھوں سے بحرِ اشک کو ہونے دے موجزن
ہم تجھ سے تب کہیں گے کہ ساحل کدھر چلا

دل تنگ پہنچ کے تو نے کیا سوے کعبہ رو
اے مصحفی تو چھوڑ کے منزل کدھر چلا

۲۱

صحبت میں غیر کی نہ مرے یار بیٹھنا   بیٹھے بھی گاہے جا کے تو ہشیار بیٹھنا

یہ طرفہ اختلاط نکالا ہے تم نے واہ   آتے ہی پاس چٹ سے وہیں مار بیٹھنا

اٹھ جاویں گر تم ایسے ہی ہوتے ہو بد دماغ   لازم ہے تم کو ہم سے ہو بیزار بیٹھنا ؟

ہو جاویں گے اک آن میں رستے کے رستے بند   جا کر کہیں نہ تو سرِ بازار بیٹھنا

وقتیکہ در کے آگے سے ان نے اٹھا دیا   کیا فائدہ دلا! پسِ دیوار بیٹھنا

خواہی بر آب خواہ بر آتش ہمیں میاں   جس جاگہ تو بٹھاوے گا ناچار بیٹھنا

بیٹھوں میں کیونکہ چین سے یارو کہ اِن دنوں   خاطر سے لے گئی ہے وہ رفتار بیٹھنا

ہوں گرچہ بے گنہ پہ مجھے تیرے روبرو   سر کو جھکائے مثلِ گنہگار بیٹھنا

کیا یہ بھی چڑ نکالی ہے یوں میرے سامنے   آئینہ لے کے ہاتھ میں ہر بار بیٹھنا

اے مصحفی وہ دوست ہی دشمن ہے جان کا
تو اس کے پاس جا کے نہ زنہار بیٹھنا

۲۲

رونے سے سوزِ داغ جگر دور ہو گیا   اس حق میں اشک مرہم کافور ہو گیا

کیا جانے ماہ تھا کہ کوئی آفتاب تھا   سارا گھر اس کے آتے ہی پر نور ہو گیا

اب در تلک اس کے اپنی رسائی ہو کس طرح ؟   سب کوچہ دادخواہوں سے معمور ہو گیا

دینے لگا وہ جام تہی جبکہ غیر کو   پیمانہ کیوں نہ عمر کا معمور ہو گیا؟

آتے ہی اس نے مکھڑے پہ زلفیں جو کھول دیں   روزِ وصال بھی شبِ دیجور ہو گیا

شبنم کو کیا میں روؤں کہ اس گلستان کے بیچ   جو گل کھلا سو کھلتے ہی کافور ہو گیا

واں اس کی چشم سے نہ بہا ایک قطرہ آب   یاں سینہ داغِ عشق سے ناسور ہو گیا

تھا شب کی مے کشی کا مجھے تا سحر صداع   دیکھ آنکھیں اس کی اور بھی مخمور ہو گیا

تو بھی فرو ہوئی نہ ترش روئیٔ شیخ کی   بھڑوا اگرچہ سوکھ کے امچور ہو گیا

اے مصحفی چھپائے ہے کیا تو بھی عشق کو
یہ قصّہ اک جہان میں مشہور ہو گیا

۲۳

پاسِ وفا بتاں سے زبس دُور ہو گیا — فریاد کرتے کرتے میں رنجور ہو گیا
جب آئنے سے اس نے منہ اپنا پھرا لیا — آئینہ جیسے دیدۂ بے نور ہو گیا
پیرانِ مُو سپید سے گرمی نہ ڈھونڈیے — یعنی ہوا جو پیر سو کافور ہو گیا
خوش قسمتی تو دیکھ کہ سینے کے داغ پر — رکھا جو میں نے مشک تو کافور ہو گیا
اوّل تو تھا ہی اس کے تئیں اک غرورِ حُسن — دیکھ آئنے کو اور بھی مغرور ہو گیا
ساقی خبر لے جلد کہ کل آئنے میں شوخ — آنکھوں کو اپنی دیکھ کے مخمور ہو گیا

تجھ کو بھی کتنا دعویِ طاقت تھا مصحفی
بس تو تو ایک ہی زخم میں سب چور ہو گیا!

۲۴

دل و دماغ تھا کب ہم کو ایسی ذلّت کا؟ — خدا کرے کہ برا ہووے اِس محبّت کا
نہ بوسہ لینے کی کر مجھ پہ او میاں تہمت — وہ ہو گا اور کوئی شخص میری صورت کا
شبِ وصال گزر ہی گئی اک آن کے بیچ — پھر آیا دکھ مجھے دینے کو روزِ فرقت کا
جفائے یار سے گزری سو دل ہی پر گزری — زباں پہ حرف نہ آیا کبھو شکایت کا
نہ آفتاب چھپے ہے نہ شام ہوتی ہے — یہ روزِ ہجر ہے یارب کہ دن قیامت کا
مرے جنوں پہ نپٹ تنگ ہے فضائے جہاں — مکان چاہیے اس کو بڑی فراغت کا
نہ دلبری، نہ ترحم، نہ لطف و نے اشفاق — ہو آشنا کوئی کیا ایسے بے مروّت کا
نہیں ہے اور کوئی، اب تو آ گلے لگ جا — ملے گا پھر نہ کبھی ایسا وقت فرصت کا
نہ جان اس کو تو اور عاشقوں سا ہرجائی — ہے مصحفی تو گرَو ایک تیری الفت کا

۲۵

مرا زخمِ جگر کاری ہے اس مرہم سے کیا ہوگا
مو اب میں تو مت روؤ کوئی ماتم سے کیا ہوگا

اس اشک و آہ سے گر دل نہیں کھلتا تو گلشن میں
نسیمِ بوئے گل اور قطرۂ شبنم سے کیا ہوگا

رہا ہے کون عالم میں سدا، عالم یہ فانی ہے
گر اُٹھ جاویں گے ہم بھی ایک دن عالم سے کیا ہوگا

یہی ناروتے روتے جی ہمارا ڈوب جاوے گا
اگر ہنس کر نہ بولو گے میاں تم ہم سے کیا ہوگا

ہمیں آگو ہی اپنا حوصلہ معلوم ہے، سچ ہے
بغیر از نالہ و فریاد و زاری ہم سے کیا ہوگا

ڈبویا خانماں مردم کا ان راتوں کے رونے نے
خدا جانے اب آگے دیدۂ پرنم سے کیا ہوگا

ترا بیمار بچنے کا نہیں اتنا سمجھ لینا
کوئی دم اس میں گر آتا ہے تو اس دم سے کیا ہوگا

دلِ مرحوم پر اب صبر کرنا ہی مناسب ہے
نہ داڑھیں مار روائے مصحفیؔ، اس غم سے کیا ہوگا

۲۶

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا؟
ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا؟

میرے پہلو میں رات جا کر وہ
ماہ تھا یا ہلال تھا کیا تھا؟

چمکی بجلی سی پر نہ سمجھے ہم
حسن تھا یا جمال تھا کیا تھا؟

شب جو دل دو دو ہاتھ اچھلتا تھا
وجد تھا یا وہ حال تھا کیا تھا؟

جس کو ہم روزِ ہجر سمجھے تھے
ماہ تھا یا وہ سال تھا کیا تھا؟

مصحفیؔ شب جو چپ تو بیٹھا تھا
کیا تجھے کچھ ملال تھا کیا تھا؟

۲۷

میں نے کس چشم کے افسانے کو آغاز کیا
جس کو سنتے ہی مری خواب نے پرواز کیا

شبِ وصل ایسے سے ڈھونڈے کوئی کیونکر واللہ
جن نے سو ناز سے اک بندِ قبا باز کیا

میں اس انداز کے صدقے کہ جو کی مجھ پہ نظر — دیکھتے ہی مجھے ان نے نظر انداز کیا
گر کرے ناز تو اس حسن پہ اپنے ہے بجا — کہ خدا نے بھی بنا تجھ کو بہت ناز کیا

مصحفی آفریں اس تیرے لب و لہجے پر
کہ فصاحت نے تری ہند کو شیراز کیا

۲۸

ملنے کا اس کے جب کبھی کچھ ہم نے ڈھب کیا — سو ناتوانیوں نے ہمیں جاں بلب کیا
کب وقتِ بوسہ آگے وہ دیتا تھا گالیاں — ہم نے ہی منہ لگا کے اسے بے ادب کیا
ہوں بسکہ صرف یاد میں میں اس کی ان دنوں — جو کچھ پڑھا تھا میں نے فراموش سب کیا
ضبطِ عطش پہ کیجو نظر اس مریض کے — مرتے بھی وقت جس نے نہ پانی طلب کیا
پیماں شکن تم اتنے تو آگے نہ تھے میاں — جھوٹوں میں لیک نام کو مشہور اب کیا
دن عہد کر گئے تو نہ پھر رات کو ملے — آئے نہ دن کو چل کے جو اقرار شب کیا

اے مصحفی وہ دم میں نہیں اپنا آشنا
تو نے جو اس کو راہ میں ٹوکا غضب کیا

۲۹

گو زخمی ہیں ہم، پر اسے کیا غم ہے ہمارا — اب تک بھی نہ پٹی ہے نہ مرہم ہے ہمارا
جوں شمع سراپا ہیں زبس مائلِ گریہ — جو بال ہے مژگاں کی طرح نم ہے ہمارا
ٹک دیدۂ انصاف سے دیکھو تو عزیزاں — معشوق بھلا اوروں سے کیا کم ہے ہمارا
دل جس کے تئیں دیجے سو ایسا نہیں کوئی — یوں یار اگر پوچھو تو عالم ہے ہمارا
روتے ہیں کھڑے لاش پہ سب دیکھنے والے — یعنی کہ ترے کوچے میں ماتم ہے ہمارا
اٹھ جائیں گے رہنے کے نہیں کوئے بتاں میں — عزمِ سفر اب یاں سے مصمم ہے ہمارا
اے مصحفی اب کوچے میں اس صبح جبیں کی — نئیں اور تو کوئی مگر اک دم ہے ہمارا

۳۰

ہر بات کے کہنے میں جو جاں کن ہے ہمارا — ہم جانے ہیں یہ دل نہیں دشمن ہے ہمارا
پوشیدہ نہیں شمع صفت سوزِ دلِ زار — احوال غرض آپ پہ روشن ہے ہمارا
کیا جامۂ صد چاک کا ناصح تو سیے گا؟ — ثابت نہ تو چولی ہے نہ دامن ہے ہمارا
زلف و خط و کاکل نے چرایا نہیں دل کو — وہ اور ہی ہے جس کے اوپر ظن ہے ہمارا
اندازِ محبّت کے کوئی سیکھے ہم سے — کہتے ہیں جسے عشق، سو وہ فن ہے ہمارا
تکلیف نہ دے ہم کو تو گلگشتِ چمن کی — خود سینہ ترے داغوں سے گلشن ہے ہمارا

پھرتا ہوا آ جائے جو ادھر سے تو ملنا
اے مصحفی اس کوچے میں مسکن ہے ہمارا

۳۱

تجھ سے گر وہ، دلا نہیں ملتا — زہر بھی تجھ کو کیا نہیں ملتا؟
جس کو وہ زلف مار ڈالے ہے — سرِ مو خوں بہا نہیں ملتا
اور سب کچھ ملے ہے دنیا میں — لیکن اک آشنا نہیں ملتا
دلِ دیوانہ رات سے گُم ہے — کہیں اس کا پتا نہیں ملتا
شیخ کلبے سے اٹھ نکل باہر — گھر میں بیٹھے خدا نہیں ملتا
درد و غم کو بھی ہے نصیبہ شرط — یہ بھی قسمت سوا نہیں ملتا
اک نے پوچھا یہ "مصحفی سے بھلا — ق — کیوں تو اے بے وفا نہیں ملتا؟"

ہنس کہ بولا کہ "او میاں اس سے
کیا کروں دل مرا نہیں ملتا"

۳۲

یوں تو دنیا میں کیا نہیں ملتا — پر دلِ با صفا نہیں ملتا

کشتۂ خنجرِ تغافل کو — حشر تک خوں بہا نہیں ملتا
بت پرستی سے باز آ، اے دل — بت کے پوجے خدا نہیں ملتا
دیکھے بت خانے سیکڑوں، کوئی — بتِ کافر ادا نہیں ملتا
جان میری مجھے غنیمت جان — عاشقِ باوفا نہیں ملتا
جب زمیں پر قدم رکھے ہے وہ شوخ — خاک میں دل مرا نہیں ملتا
میں جو اس سے کہا تو مجھ سے میاں — ق — عید کے دن بھی کیا نہیں ملتا؟
ہو کے رو کھا وہ یوں لگا کہنے — "کیا کرے گا بے جا نہیں ملتا"

بن نمک چھڑکے زخم سینہ کے
مصحفی کچھ مزا نہیں ملتا

۳۳

جامے کے بند جب وہ گلشن میں وا کرے گا — گل چاک چاک اپنی جیب و قبا کرے گا
تو آ کے پاس میرے اے شوخ! کیا کرے گا — سچ ہے کہ غیر ہی سے مہر و وفا کرے گا
اے باغباں خوشی سے رہنے دے مرغِ دل کو — یہ بھی چمن میں گاہے نالہ کیا کرے گا
خورشید رو ہمارا جس سے ملے گا ہر صبح — دانستہ وہ نمازیں اپنی قضا کرے گا
دیکھے ہے کیا، ہمیں بھی دے ڈال ایک بوسہ — حق، اے سخی خدا کے، تیرا بھلا کرے گا
غم خواریاں تمھاری یارو یہ سب مسلّم — ہونا وہی ہے لیکن جو کچھ خدا کرے گا

رو مصحفی کو بھی دے اے دلبرِ نمازی
ہے شخص مستحق وہ تجھ کو دعا کرے گا

۳۴

اس کو منظور یاں نہ آنا تھا — تپ کا آنا بھی اک بہانا تھا
چشمِ بیمارِ یار سن تو بھلا — کیا مجھی کو یہ دکھ دکھانا تھا

یادِ ایّامِ بے قراریِ دل — وہ بھی یارب عجب زمانا تھا
اب کہاں ہم، کدھر وہ کنجِ قفس؛ — کوئی دن واں بھی آب ودانا تھا
ایسے بھولے قفس میں سیرِ چمن — کہ گویا یاں ہی آشیانا تھا
دلِ صد چاک پر نہ کر تہمت — رات زلفوں میں تیری شانا تھا
مفت میں اس کی گالیاں کھائیں
مصحفی تجھ کو غم ہی کھانا تھا

۳۵

ان آنکھوں سے آب کچھ نہ نکلا — غیر از خوناب کچھ نہ نکلا
بوسے کا کیا سوال، لیکن — اُس مُنہ سے جواب کچھ نہ نکلا
ہوئی آنکھ سے آنکھ دید وادید — پر دل کا حجاب کچھ نہ نکلا
جز تیری ہوا کے اپنے سر میں — مانندِ حباب کچھ نہ نکلا
کرتا تھا بہت سا مجھ پہ دعویٰ — پر وقتِ حساب کچھ نہ نکلا
سینے میں جو دل کی کی تفحّص — جز دودِ کباب کچھ نہ نکلا
ہم سمجھتے تھے جس کو مصحفی یار
وہ خانہ خراب کچھ نہ نکلا

۳۶

کشورِ دل کو خدا جانے یہ کس نے لوٹا؛ — اس میں جو گھر نظر آتا ہے سو لوٹا پھوٹا
اُس گرفتار کے صدقے میں کہ اُڑ کر وہیں — پھر گیا دام کی جانب جو قفس سے چھوٹا
دیدنی ہیں یہ غرضِ صانعِ قدرت کے رنگ — کیا ہی موقعے پہ لگایا ہے ہر اک گل بوٹا
چرخ پر دیکھ کے نالے کو مرے کہتی ہے خلق — بان چھوٹا ہے کہیں یا کہ ہے تارا ٹوٹا
مصحفی مر ہی گیا میں تو ادا دیکھ اُس کی — جب ہتھیلی سے کل اس شوخ نے ماتھا کوٹا

۳۷

مجھے کر قتل ناحق دل ربا کے ہاتھ کیا آیا
گیا میں جان سے اُس بے وفا کے ہاتھ کیا آیا

ہمارے قتل کو وہ پنجہ خود دستِ حنائی تھا
یہیں خوں میں ملا رنگِ حنا کے ہاتھ کیا آیا

کیا میرے تئیں برباد اس نے کوہ و صحرا میں
اُڑا کر خاک کو میری صبا کے ہاتھ کیا آیا

خدا جانے ہے اے یارو ہم اپنے درد سے خوش تھے
ہمارے درد کو کھو کر دوا کے ہاتھ کیا آیا

دُعا ہر چند کی اے مصحفی ہم نے و لے آخر
تہی دستی سوا دستِ دُعا کے ہاتھ کیا آیا

۳۸

جس طرح ہاتھ سے اُس بت کے مرا دل ٹوٹا
یوں کسی سنگ پہ زنہار نہ شیشہ پھوٹا

دلِ آوارہ سے رہتی ہے سدا اس میں بہار
ہے ہمارے چمنِ دل کا یہی گل بوٹا

ہاے یہ زلف ہے یا دامِ بلا ہے یا رب
جو پھنسا اس میں سو زنہار نہ جیتا چھوٹا

ترکِ چشم اس بتِ کافر کی عجب رہزن ہے
سیکڑوں کے تئیں اک آن میں جس نے لوٹا

مصحفی جس نے مرا حالِ دلِ زار سُنا
رو دیا، نالہ کیا، سنگ سے سینہ کوٹا

۳۹

نقاب افگندہ از رخ جس طرف شب کو وہ جا نکلا
سرِ رہ ہو گیا روشن، زمیں پر چاند سا نکلا

شکارِ دل کو ناحق ذبح کر کے ہاتھ سے کھویا
بھلا اس ناتواں میں کہہ تو اے صیاد کیا نکلا

ہوئی اک عمر مجھ کو اس سے کرتے نامہ پردازی
عبارت کا مری لیکن نہ اب تک مدعا نکلا

جو شیخ شہر آیا ہم سے اوباشوں کی مجلس میں
اگر دھولیں نہیں تو گالیاں دو چار کھا نکلا

دلِ گم گشتہ کی کل ہم نے اپنے فال دیکھی تھی
کریں اب کس پہ تہمت؟ نام اس میں آپ کا نکلا

میں ہوں اپنی شناسائی کا دیوانہ، کہ مدت سے
سمجھتا تھا جسے بیگانہ سو وہ آشنا نکلا

نہ جانے مصحفیؔ کو کیا کہا، اے بدزباں تو نے؟
کہ تیری بزم سے شب سخت وہ ہو کر خفا نکلا

۴۰

شرمندہ نہ تھا، نالۂ شب گیر اثر کا
طالع نے کیا ہے اسے نخچیر اثر کا

جاتی ہے فلک پر جو مری آہ مسلسل
در جا کے ہلاتی ہے یہ زنجیر اثر کا

اِک ٹیڑھ سی ہے نالے میں مرے خونِ جگر کی
کچھ رنگ تو رکھتی ہے یہ شمشیر اثر کا

مٹ بھیڑ ہو رستے میں مرے پیکِ دعا سے
مُنہ پھیر دے ادھر کو جو تاثیر اثر کا

نالہ مرا کرتا ہے تو تسخیر اثر کو
پر آپ ہی ہو جاے ہے تسخیر اثر کا

شب مرغِ سحر خواں کی جو آواز سنی میں
سنتے ہی لگا دل میں مرے تیر اثر کا

نالہ ترے بیمار کا جاوے گا فلک تک
مت اُس کو دکھاوے گی جو تقدیر اثر کا

اے مصحفیؔ کرتا تھا رقم جب یہ غزل میں
جنبش میں قلم تھا، دمِ تحریر اثر کا

۴۱

تم بانکپن یہ اپنا دکھاتے ہو ہم کو کیا
قبضے پہ ہاتھ رکھ کے ڈراتے ہو ہم کو کیا

آنکھیں تمھاری جھپکیں ہیں ادھر کو بیشتر
تم اِن اشارتوں سے بلاتے ہو ہم کو کیا

آویں ہماری گور میں گر منکر و نکیر
اتنا کہیں "ابھی سے اُٹھاتے ہو ہم کو کیا"

لا کر کبھی دیا ہے کوئی پھول پھل ہمیں؟
تم سیرِ گلستاں کو جو جاتے ہو ہم کو کیا

کہتے ہو "ایک آدھ کی ہے میرے ہاتھوں موت"
ہم بھی سمجھتے ہیں، یہ سُناتے ہو ہم کو کیا

ہم سے تو اب تلک وہی شرم و حجاب ہے
گر ہر کسی کے سامنے آتے ہو ہم کو کیا

کہتے ہو روز ہم سے یہی "کل کو آئیو"
کیا خو نکالی ہے یہ ستاتے ہو ہم کو کیا

دینا ہے کوئی بوسہ تو دے ڈالیے میاں!
کیوں پانو توڑتے ہو پھراتے ہو ہم کو کیا

لے لے کے نام اُس کی جفاؤں کا مصحفی
ہم آپ جل رہے ہیں جلاتے ہو ہم کو کیا

۴۲

یہ چاک گریباں تو داماں سے گزرا — میں شوریدہ، ایسے گریباں سے گزرا
اگر دردِ دل میں یہ لذّت ہے، یارو! — تو میں ان طبیبوں کے درماں سے گزرا
کسی اپنے دشمن پہ ہرگز نہ گزرے — جو مجھ پر جُدائیِ یاراں سے گزرا
وہیں جی اُٹھے وے جو مردے پڑے تھے — تماشا کناں، جب وہ زنداں سے گزرا
نہ دشتِ محبت کو سرسبز دیکھا — کئی بار خضر اِس بیاباں سے گزرا
لگا تیر ایسا مرے دل میں اُس کا — کہ دل تا بہ سوفار پیکاں سے گزرا
ہوئے فرش، گل اُس کے ہر ہر قدم پر — جو دامن کشاں، وہ گلستاں سے گزرا
یہ شکوہ رہا مجھ کو تجھ سے تو، قاصد! — نہ ہو کر کبھی کوے جاناں سے گزرا
میں اک نالہ ایسا کیا کل چمن میں — کہ شعلہ سا برگِ درختاں سے گزرا
صد احسنت اس کشتۂ بے اجل پر — جو الفت میں تیری دل و جاں سے گزرا

ہوئی مصحفی پر عجب رقّت اُس دم
وہ مسکیں جو گورِ غریباں سے گزرا

۴۳

احوال پریشاں ہے گلستاں میں صبا کا — کیوں ہاتھ گیا گل کے گریباں میں صبا کا
یارو! یہ جو آتی ہے ہوا پانی سے لگ کر — مشتاق ہے دل موسمِ باراں میں صبا کا
ہم تک کبھی وہ لاتی ہے کوئی برگِ گل افسوس! — روزن سے گزارا نہیں زنداں میں صبا کا
ایسا نہ ہو شانے سے کہیں ہووے لڑائی — الجھا ہے دل اُس زلفِ پریشاں میں صبا کا
شاید کہ مرا غنچۂ دل آ کے کھلا دے — میں چشم براہ ہوں شبِ ہجراں میں صبا کا

اُس طفل کو لکھ بھیجتے ہم بھی کوئی پرزہ — ہوتا جو گزر اُس کے دبستاں میں صبا کا

اے مصحفیؔ جب خاک مری اُس نے اڑا دی
کیا کام ہے پھر کوچۂ جاناں میں صبا کا

۴۴

زلفوں سے اس کی میں نے جس دن کہ ہاتھ دھویا — ابرِ سیاہ آکر تربت پہ میری رویا
اُس کے مزار پر تو آنا روا ہے اک شب — حسرت کو اپنے دل کی جو ساتھ لے کے سویا
شوخی تو دیکھ اس کی، کل چٹکی لیتے لیتے — چٹکی کے ساتھ دل میں ناخن مرے گڑویا
تا بات کھل نہ جاوے، لوگوں کے ڈر کے مارے — جو خط لکھا سو میں نے پانی ہی میں ڈبویا
تیرے شہیدوں کے ہم از بس مزاج داں تھے — تربت پہ ہم نے ان کی یک لخت لالہ بویا
جن گلیوں میں ملک کا ہوتا نہیں گزارا — اُن گلیوں میں پھریں ہیں ہم چشمکوں کے جویا!

اے مصحفیؔ میں بیٹھا اب کیوں نہ خاک چھانوں
دل سا عقیق میں نے اُس کی گلی میں کھویا

۴۵

اے عشق! تو کامِ دلِ ناکام نہ دینا — اس دل کے تئیں ایک دم آرام نہ دینا
کام اُس کا ہے عاشق کے تئیں کام نہ دینا — تڑپانا جدائی میں اور آرام نہ دینا
اس چپ کا میں دلوانہ ہوں کیا قہر ہے اے وائے! — اس لطف پہ میرے تئیں دشنام نہ دینا
ملزم تری باتوں سے ہیں آپ ہی ہونا — اور تجھ کو کسی بات میں الزام نہ دینا
شیوہ ہے یہی اس کا کہ خورشید کے مانند — رُو صبح جو دنیا تو ہیں شام نہ دینا
ٹک کنجِ قفس میں بھی سکوں کیجیو، بلبل! — جی اپنا تڑپ کر کے تہِ دام نہ دینا
جانے کا جو دل قصد کرے اس کی گلی میں — فرصت اسے اے گردشِ ایّام! نہ دینا
کچھ یہ بھی عداوت ہے کہ جب ہو مری نوبت — ساقی سے یہ کہتے ہو "اسے جام نہ دینا"

قاصد! یہ غضب ہے کہ جب اس کو میں پہنچا — سب اپنی ہی کہنی، مرا پیغام نہ دینا

اے مصحفی یار آوے تو تو رو یا ہی کیجو
بہتے ہوئے آنسو کو کہیں تھام نہ دینا

۴۶

کل ہمیں اُس کی طرف کو شوق رہبر ہو گیا — دیکھنا اس کا جو مشکل تھا میسّر ہو گیا

یا کوئی بالوں کی بُو سے اس کی واقف ہی نہ تھا — یا کھُلی جب زلف تو عالم معطّر ہو گیا

خط منڈاتے سے ترے چہرے کا نکلا اور ہی رنگ — واں بھی بہتر تھا پر اب بہتر سے بہتر ہو گیا

لکھ کے نامہ، نامہ بر کو جب لگے ہم ڈھونڈنے — رنگ چہرے کا ہمارے خود کبوتر ہو گیا

قطرۂ خوں بھی نہ اپنا حلق میں اپنے گیا — ہم رہے لب تشنہ اور سیراب خنجر ہو گیا

عارضِ افروختہ کی اس کے لالی کیا کہوں؟ — جس پہ ہر قطرہ عرق کا جیسے اخگر ہو گیا

کم ہے کچھ کندن سے کیا چہرے کا اس کے رنگِ زرد
عشق کر کے مصحفی تو کیمیا گر ہو گیا

۴۷

جانشیں رخ پر ترے خطِ معنبر ہو گیا — اس برس کچھ جلد روز اور شب برابر ہو گیا

اس قدر ہم سے خلش کی اس کی مژگاں نے کہ ہائے — ہر سرِ مُو تن پہ اپنا نوکِ نشتر ہو گیا

رشتۂ شیرازۂ اجزائے دل تھی اس کی زلف — وہ جو واں بکھری تو یاں یہ دل بھی ابتر ہو گیا

اشک کا قطرہ مری آنکھوں کی سرخی کے سبب — تھا اگر الماس تو یاقوتِ احمر ہو گیا

تھا اگر روزِ قیامت تو بھی ہم شاداں رہے — وہ جو اک دن، اُس سے ملنے کا مقرر ہو گیا

گر ہوس کی مے کی میں نے اشکِ خونی سے مرے — آستیں کا حلقہ میری، خوں کا ساغر ہو گیا

مصحفی کیونکر چھپے اب اُس میں سوزِ داغِ دل
چھن کے ان پلکوں سے سینہ جیسے مجمر ہو گیا

۴۸

جب اس گلِ نازک کا دیدار نظر آیا
آنکھوں میں مری ہر گل جوں خار نظر آیا

یوسف کی خریداری آسان نہ تھی، از بس
جب مصر میں پہنچے تب بازار نظر آیا

مے ٹپکی ہی پڑتی ہے آنکھوں سے تری، کافر!
تو آج بہت ہم کو سرشار نظر آیا

اس مست شلائیں نے جب بھر کے نظر دیکھا
مجلس میں نہ پھر کوئی ہشیار نظر آیا

جھوٹے نہیں سچے ہو اُس کوچے میں ہاں، یارو!
مجھ کو بھی چھلاوا سا اک بار نظر آیا

آنکھوں سے ہوے جا کر ہم حلقہ بگوش اس کے
جب زلف کے حلقوں سے رخسار نظر آیا

یکبار وہ تجھ پر ہی خنجر کو چلا بیٹھا
اے دل تجھے اب اس کا کچھ پیار نظر آیا!

یارو کہیں ایسی بھی دیکھی ہے صفائے شست؟
جو تیر لگا! دل کے سو پار نظر آیا

کیا وصل میں پوچھے ہے رونے کا مرے باعث؟
دن مجھ کو جدائی کا اے یار، نظر آیا

جب رخنۂ دل سے میں سینے کی طرف جھانکا
داغوں سے مجھے سینہ گلزار نظر آیا

اے مصحفی آنکھوں کا کس کی ہے نظر کردہ؟
تو اب کے بہت مجھ کو بیمار نظر آیا

۴۹

کنجِ قفس میں جو کوئی مر گیا
ظلم بیارانِ دگر کر گیا

بھیجنے سے خط کے کچھ آیا نہ ہاتھ
ہاتھ سے برباد کبوتر گیا

قصہ کہوں کیا دلِ بیمار کا؟
عشق کی تپ تھی، نہ بچا مر گیا

فتنے کا بھی پڑ نہ سکا واں تو پانو
وہ بھی تیرے کوچے سے بچ کر گیا

اس نے نہ پوچھا مجھے "تو کون ہے؟"
جس کی اداؤں پہ میں مر مر گیا

نالہ مرے دل سے جو نکلا سحر
وہ بھی تو افلاک پہ مضطر گیا

رو کبھی سناتے ہو مجھے واہ وا!
آپ کی باتوں سے میں کیا ڈر گیا

چلتی تھی تلوار درِ عشق پر
پانو کے رکھتے ہی وہاں سر گیا

ساقی نے شیشے سے جو الٹی شراب — دیکھتے ہی جام کے، دل بھر گیا

مصحفی کو دیکھتے تھے ہم بھی رات
جب وہ تیری بزم میں چھپ کر گیا

۵۰

موسمِ گل کوچ مگر کر گیا — رنگِ بہاراں جو سفر کر گیا
سن کے مجھے کشتہ وہ آیا نہ پاس — دور سے اک آ کے نظر کر گیا
پیٹوں ہوں سر اپنا کہ مجھ کو وہ شوخ — جاتے ہوئے کیوں نہ خبر کر گیا
تعزیہ داروں کی یہ مجلس ہے یاں — جو کوئی آیا مژہ تر کر گیا
ماجرا لیلیٰ کا سنا ہووے گا — عشق بلا ہے جب اثر کر گیا
خون میں لوٹوں ہوں کہ مجھ کو وہ شوخ — قتل بہ اندازِ دگر کر گیا
روزِ طرب، گاہ وہ لایا بہ شام — گاہ شبِ غم کو سحر کر گیا

شمع صفت مصحفی اس بزم میں
جوں بنی و دل عمر بسر کر گیا

۵۱

عشق مجھے اہلِ بصر کر گیا — اشک کے قطرے کو گہر کر گیا
رہ گئے ہم سوتے ہی افسوس ہے — قافلۂ صبح سفر کر گیا
لاشوں کے ستھراؤ وہاں پڑ گئے — اک نظر آئے وہ جیدھر کر گیا
آ گیا میں سامنے اس کے تو وہ — دیکھ مجھے نیچی نظر کر گیا
کیونکہ نکالوں ترے پیکان کو؟ — اب تو مرے دل میں وہ گھر کر گیا
آ کے مری خاک پہ کل گرد باد — دیر تلک خاک بہ سر کر گیا
دل نہ لگا اس کا کہیں ایک بار — جو ترے کوچے سے گزر کر گیا

یہ شبِ ہجراں ہے، اُسے آفریں — جو کوئی اس شب کو سحر کر گیا

یار میرے سر سے نہ گزرا تو کیا — یار کا خنجر تو گزر کر گیا

صورِ اسرافیل ہے نالہ مرا — گور کے سوتوں کو خبر کر گیا

پیار تو آیا تھا میرے دل میں رات — پر میں تری وضع سے ڈر کر گیا

لشکرِ خطے کے جو آیا وہ شوخ — کشورِ دل زیر و زبر کر گیا

چشم نے دکھلائی صفا شست کی — تیرِ نگہ اپنا ہنر کر گیا

ہے وہ جہنم دلِ سوزاں مرا — جس سے جہنّم بھی حذر کر گیا

خنجرِ مژگاں پہ گرا ٹوٹ کر — دل بھی میرا زور جگر کر گیا

دیکھیے اب زیست میری کیونکہ ہو — زہرِ جُدائی تو اثر کر گیا

رونے پہ آیا جو میں کل مصحفیؔ
سیکڑوں رومال کو تر کر گیا

۵۲

دن رات نپٹ غم سے ترے نالہ کناں تھا — سچ کہہ تو مری جان کے دشمن! تو کہاں تھا؟

سوجھا نہ ہمیں خاک بھی کچھ بے بصری سے — یاں ورنہ ہر اک ذرّے میں خورشید عیاں تھا

اس چال سے گزرا کہ کیا کتنوں کو پامال — معشوق نہ تھا، یہ تو کوئی آفتِ جاں تھا

جن روزوں کہ کھینچے تھا وہ بے تیر کبادہ — میرا دلِ خوں گشتہ تبھی اس کا نشاں تھا

معذور مجھے رکھیو تم اے قافلہ باشاں! — مانندِ جرس، دل مرا لبریزِ فغاں تھا

ایسا ہی گیا جلد کہ پھر منہ نہ دکھایا — وہ سروِ رواں اپنی مگر عمرِ رواں تھا

میں جامِ بلوریں میں شراب اس کو پلائی — پیمانۂ گل جس کی نزاکت پہ گراں تھا

جی دینے میں صرفہ نہ کیا ہم نے کسی سے — ہر چند کہ اس بات میں اپنا ہی زیاں تھا

ہم سے خبرِ مصحفیؔ خستہ نہ پوچھو
تم آپ ہی سوچو نہ، میاں دل میں کہاں تھا؟

۵۳

غیر ہی کو نت فلک نے اس کا ہم پہلو کیا
دوش کوکب میرے اس نے تکیۂ بازو کیا

جب مصوّر نے لکھا گردہ تری تصویر کا
لالہ و گل کر کے حل، صرف اس میں رنگ و بو کیا

اب خیال اس کا نہیں چت سے اترتا ایکدم
رفتہ رفتہ اس نے بھی دل پر مرے قابو کیا

گوہرِ غلطاں کی خوبی خاک میں مل جائے گی
گر رواں ہم نے بھی پلکوں پر کوئی آنسو کیا

دل سے جو موج اٹھی میرے اس کو ناز عشق نے
چین پیشانی بنایا یا خمِ ابرو کیا

حلقۂ در سے رہیں آنکھیں لگی دو دو پہر
ہم نے جب اس کو تصوّر حلقۂ گیسو کیا

اس چمن سے ہم نہیں شرمندہ اک گل کے نسیم
گو کہ اوروں نے دماغِ آرزو خوشبو کیا

چین سا جاتا رہا ہے دل سے میں حیران ہوں
اس نے کل آنکھیں لڑائیں مجھ سے یا جادو کیا

موڑ دیں صف کی صفیں اک آن میں اے مصحفی
اُس صفِ مژگاں نے اپنا جس طرف کو رُو کیا

۵۴

جس کے نہ لگا زخم تری کج نظری کا
کیا ہووے الم اُس کو خراشِ جگری کا

یہ کس کی ہے رفتار؟ کہ صفحے پہ زمیں کے
ہر نقشِ قدم خاکا ہے تصویرِ پری کا

کل قافلۂ نکہتِ گل ہوگا روانہ
مت چھوڑیو تو ساتھ نسیمِ سحری کا

کہتے ہیں جسے اہلِ جہاں شورِ قیامت
سو پیش قدم ہے وہ تری جلوہ گری کا

ہے جی میں کہ یک چند خبر اپنی نہ لیجے
کہتے ہیں کہ عالم ہے عجب بے خبری کا

ازبس کہ عزیزوں نے مجھے دل سے بھلایا
خط مجھ کو نہ آیا کسی یارِ سفری کا

پامال ہوا جائے ہے خورشیدِ درخشاں
ہے کفش پہ ازبس کہ تری، کام زری کا

نت فرش زری بچھتے تھے دروازوں پہ جن کے
سو اُن کو فلک نے کیا محتاج دری کا

اے مصحفی میں خط تو لکھوں لیک وہاں تک
ہر مرغ کو ہے حوصلہ کب نامہ بری کا

۵۵

پونچھ کر آنکھوں کا کاجل یوں نہ بالوں سے لگا
اِس سیاہی کو صنم ٹک اپنے گالوں سے لگا

آ گہی کب تھی مجھے اس کی کمر ہے جیسے مُو
ہاتھ یہ مضموں مرے نازک خیالوں سے لگا

رشک ہے جو اس کی سرخی پر لبِ سوفار کو
کس کا لوہو ہے ترے تیروں کے بھالوں سے لگا

شعلۂ جوّالہ ہو جیسے بنہٹی پر کہیں
آہ کا شعلہ پھرے ہے میرے نالوں سے لگا

اس قدر بھی راحت و آرام کا دشمن نہ ہو
مصحفیؔ مت دل کو اِن ترکیب والوں سے لگا

۵۶

کب میں نے کہا تو مجھے دیدار دکھا جا؟
ٹک آکے پسِ پردہ ہی آواز سنا جا

ہے منزلِ مقصود ابھی دور، دوانے!
کیا دیکھے ہے سایے کو مغیلاں کے، چلا جا

مجروحِ تغافل نہ کر، اے شوخ! تو ہم کو
یوں جی میں جو آوے تو کوئی زخم لگا جا

کیا وضع ہے تیری کہ میں جب آؤں ہوں تجھ پاس
منہ سے ترے سنتا ہوں یہی بات کہ "جا جا"

کر اپنے تئیں گم تو ذرا دشتِ جنوں میں
شاید کہ کوئی آکے تجھے راہ بتا جا

ناصح سے یہ کہہ دو کہ گریبان کو میرے
پھر فصلِ بہار آئی ہے ٹک آکے سِلا جا

اے مصحفیؔ! گردن کشی اس شوخ سے مت کر
جب کھینچے وہ تلوار، تو گردن کو جھکا جا

۵۷

کوئی ہمیشہ گرفتارِ غم نہیں ہوتا
ستم تو ہووے، ولے یہ ستم نہیں ہوتا

کریں ہیں عشق تو سب لیک نارسیدہ بکام
مری طرح سے کوئی متّہم نہیں ہوتا

ہمارے قتل کو کھینچے ہے جب وہ تیغِ دو دم
غرض کہ ہم میں تو اُس وقت دم نہیں ہوتا

ہے رُت بہار کی اور باغباں کی مہلت سے
گلاب باغ میں اب تک قلم نہیں ہوتا

حرم تلک جو پہنچتے بھی ہیں بصد محنت
تو ہائے ہم سے طوافِ حرم نہیں ہوتا

مرے مزار پہ دامن کشاں کب آوے ہے یار
کہ میرے سینے سے شعلہ علم نہیں ہوتا

عدم وجود کی لازم ہے پر جو سچ پوچھو
وجودِ عاشقِ صادق عدم نہیں ہوتا

قدم دھرے ہے تو کب راہ میں کہ تیرا قد
قدم قدم پہ، مری جان! خم نہیں ہوتا

طبیب نسخے بدلتے ہیں سیکڑوں لیکن
ہنوز دردِ دلِ خستہ کم نہیں ہوتا

ہمارے قتل کی تدبیر میں رقیب اس سے
وہ شب ہے کونسی جو ہم قسم نہیں ہوتا

خدا کے واسطے اے مصحفی تو کچھ لکھ دے
کہ میرے ہاتھ سے نامہ رقم نہیں ہوتا

۵۸

نظر آتا ہے یہ لونڈا، مجھے ہرجائی سا
دیکھ اسے ہر کوئی ہو جائے ہے سودائی سا

کمیِ آب یہاں تک ہے جگر میں کہ اب اشک
نوکِ مژگاں سے گرے ہے تو کبھو رائی سا

دل جدھر جائے ہے میرا تری صورت کا خیال
ساتھ پھرتا ہے لگا اُس کے تقاضائی سا

پھر کبھی اے تیغ چمک جا کبھی بجلی سی، کہ ہے
وا ہر اک زخم مرا چشمِ تماشائی سا

مصحفی سے تو میں واقف نہیں، پر کوئی شخص
صبح کا در پہ کھڑا ہے ترے مجرائی سا

۵۹

جن روزوں کہ رنگ آنکھوں کا اپنی جگری تھا
ہر لختِ جگر روکشِ گل برگ طری تھا

یوں جاتے ہوئے کر گیا پامال جو مجھ کو
ہاں تھا تو وہ لڑکا ہی پہ تصویر پری تھا

میں کر کے چلا بانہیں اور اس شوخ نے وہیں
پوچھا جو کسی نے تو کہا "رہ گزری تھا"

گل رشک سے جلتے تھے پڑے عود کے مانند
جن روزوں کہ جامہ ترے بر میں اگری تھا

وہ چھوڑ گیا مجھ کو پسِ قافلہ تنہا
جس ساتھ مجھے داعیۂ ہم سفری تھا

شب جس سے رہا دل میں مرے داغِ افسوس — وہ صبح تلک مستِ مے بے خبری تھا

پایا نہ تجھے مصحفیؔ، میں صبح کے ہوتے

اے سوختہ جاں کیا تو چراغِ سحری تھا

۶۰

جدھر دیکھو اُدھر چرچا ہے ان ہنگامہ سازوں کا — چلے فتنے کی یاں کیا، دور ہے دامن درازوں کا

قدیمی ناز بردار آپ کو اب کب خوش آتے ہیں؟ — پسند آتا ہے صاحب تم کو ملنا نو نیازوں کا

وہ کب محوِ تماشائے مرقع ہووے اے مانی! — نظر میں جس کی نقشا کھُب گیا جادو طرازوں کا

رواں ہوں اشک جب پلکوں پہ میری، تب ذرا دیکھے — نہ دیکھا ہو تماشا گر کسی نے شیشہ بازوں کا

وہ اوگھٹ راہ ہے اے مصحفیؔ دشتِ محبت کی

کہ سم لیتا ہے مرکب جس زمیں پر یکّہ تازوں کا

۶۱

آگے مرے کسی نے ترا نام، اگر لیا — اتنا میں مارے رشک کے تڑپا کہ جی دیا

پیارے! یہ رنگِ پاں ہے لبِ لعل پر ترے — یا تو نے ذبح کر کے کسی کا لہو پیا؟

اس پیرہن سے مجھ کو تو آتی ہے بوئے اشک — اے گل بتا تو کس نے ترا پیرہن سیا؟

تو بھی کبھی عیادتِ بیمارِ عشق کر — کہتے ہیں تیرے واسطے مر مر کے وہ جیا

اے مصحفیؔ تو جائے گا کیا اُس کے روبرو؟

تو نے تو اُس کے کوچے میں آتے ہی غش کیا

۶۲

ہائے کیا کیجیے اس جامۂ عریانی کا — شوق دل ہی میں رہا چاک گریبانی کا

چاہ سے آج زلیخا کو یہ مژدہ پہنچے — یعنی اب دلو مکاں ہے مہ کنعانی کا

شانہ زلفوں میں جو ہر دم تو کیا کرتا ہے — یہی باعث ہے مرے دل کی پریشانی کا
بارہا اشک کا دریا مرے سر سے گزرا — لیک ہرگز نہ مٹا خط مری پیشانی کا
کج کلاہی نہ گئی تا سرِ مژگاں اُس کی — اشک ہے یا ہے یہ لڑکا کسی درّانی کا
ذبح کر رہتا ہے اک آدھ کو ہر صبح مدام — کس قدر شوق ہے اُس بت کو بھی قربانی کا
کر سکے کیا کوئی اب جمع میاں مجھ کو کہ میں — ہوں پریشاں تری زلفوں کی پریشانی کا
اشک نے مجھ کو ڈبویا، اسے تب چین آیا — تھا یہ اک عمر سے خواہاں مری ویرانی کا
ہم اسیروں کو قفس تنگ تراز بیضہ ملا — شوق جی ہی میں رہا بال و پر افشانی کا

چمنِ ہند میں بلبل ہیں ہزاروں لیکن
مصحفیؔ شور ہے اب تیری غزل خوانی کا

۶۳

زیادہ قصد نہ کر عاشق آزمائی کا — کیا ہے کس نے بھلا امتحاں خدائی کا؟
یہ کیا ادا ہے کہ ہر دم کمر سے بندھتا ہے — کبھو دوپٹے کا پٹکا، کبھی دولائی کا؟
خدا کے واسطے اب مُنہ پہ چھوڑ دے برقع — کہ بیش ازیں نہیں مقدور پارسائی کا
غرض کہ خوبرو سب بیوفا ہی گزرے ہیں — میں تذکرہ کروں کس کس کی بے وفائی کا
بہت رکھا مجھے زنداں میں عشق نے لیکن — علاج ہو نہ سکا اس سرِ ہوائی کا
رکھے ہے حکمِ خزف گوہر اس زمانے میں — زبس کہ گرم ہے بازار ناروائی کا
مرے مزار پہ رکھ دیجیو گلِ منہدی — کہ میں شہید ہوں اُس پنجۂ حنائی کا
رہے ہے گل خس و خارِ چمن سے چیں بہ جبیں — دماغ ہے اُسے ازبسکہ میرزائی کا
ہزار حیف کہ یہ وہ زمانہ آیا ہے! — کہ آشنا کو نہیں پاس آشنائی کا

کسی سے مصحفیؔ رکھتا نہیں میں دل میں غبار
کہ مثلِ آئنہ عالم ہے یاں صفائی کا

۶۴

چھپایا تم نے منہ ایسا کہ بس جی ہی جلا ڈالا
تغافل نے تمھارے خاک میں ہم کو ملا ڈالا

کہے تو کھیل لڑکوں کا ہے یہ یعنی مصوّر نے
جو نقش اس صفحۂ ہستی پہ کھینچا سو مٹا ڈالا

حجابِ عشق ہے ملنے سے مانع ورنہ عاشق کو
رہی پھر شرم کس کی؟ دل سے جب خطرہ اٹھا ڈالا

نہ اُٹھا حشر کو بھی اُس کی تیغِ ناز کا مارا
کیا خوں اُس نے اک عالم کا اور وہیں چھپا ڈالا

مرض تھا مصحفی کو صعب تر یہ خوب وہ سمجھا
کہ جوں توں آپ کو اس نے ترے کوچے میں لا ڈالا

۶۵

قاصد جب اُس کے پاس مرا نامہ لے گیا
پوشیدہ کر کے سب سے وہ علّامہ لے گیا

پایا نہ اس چمن سے کسی نے لباسِ عیش
جو گل گیا سو خوں میں ڈوبا جامہ لے گیا

مطرب پسر کی دست درازی کو عشق ہے
باتوں میں شیخِ شہر کا عمّامہ لے گیا

جو نالہ میرے دل سے اٹھا شور کر کے رات
وہ چرخ پر ہی حشر کا ہنگامہ لے گیا

ہر چند مصحفی میں جواہر رقم نہیں
پر موتیوں کی آب مِرا خامہ لے گیا

۶۶

جوں سایہ اُس کے پیچھے میں برسوں لگا پھرا
لیکن نہ اُس کا رُخ کبھی سوئے قفا پھرا

رویا چمن میں رات میں اتنا کہ جوں حباب
پانی میں آشیانۂ بلبل بہا پھرا

گردوں تمام جیسے کہ غربال ہو گیا
جب سے رخ اُس کی پلکوں کا سوئے ہوا پھرا

زور آوری نہ کر کہ جو آیا غرور میں
مارا زمیں پہ اس کو فلک نے پھرا پھرا

مجنوں کو عشقِ لیلیٰ نے آرام کب دیا
اک عمر کوہ و دشت میں روتا ہوا پھرا

مشتِ غبار اپنا تری جستجو کے بیچ
آوارہ ہو کے ہمرہِ بادِ صبا پھرا

میں جس کی راہِ شوق میں پامال ہو گیا وہ بھول کر بھی خاک پہ میری نہ آ پھرا
مارا گیا گلی میں تری مصحفیؔ، دریغ
اُس کشتنی کے سر سے نہ حکمِ قضا پھرا

۶۷

تو جس شب کہ جا غیر کے پاس سویا میں تکیے سے تیرے گلے لگ کے رویا
کروں کیسے شکوہ کہ دریائے خوں میں مجھے دیدۂ تر نے میرے ڈبویا
اُٹھا کونسی صبح رنجور و خستہ کہ میں آنسوؤں سے مُنہ اپنا نہ دھویا
نہ ہر اک کو پیارے دکھا وضع اپنی کہ اس وضع کا ایک عالم ہے جویا
ترے ہاتھ دیکھے حنا سے بھی سادے دل اپنے کو میں ہاتھ سے مفت کھویا
نہ سبزہ ہوا واں سے زنہار پیدا میں جس خاک میں اشک کا دانہ بویا
گیا مصحفیؔ تیرا شورِ فصاحت
فلک تک، تو ظالم فغانی ہے گویا

۶۸

مرا دل گیا جب سے زلفوں میں کھویا میں کیا، ایک عالم ہے اس دل کا جویا
مجھے خوابِ آرام اُس رات آئے کہ خنجر ترا میرے پہلو میں سویا
تجھے جب کہ ہم زانوئے غیر دیکھا سر اپنا میں زانو پہ رکھ خوب رویا
نہ ہرگز ہوا سبز حرماں کے مارے میں اس مزرعِ دل میں جو تخم بویا
کہیں مصحفیؔ گریہ موقوف کر اب
کہ اس گریے نے ایک عالم ڈبویا

(۶۹)

مُنہ دیکھ کے یار آرسی کا دشمن تو ہوا ہمارے جی کا

مشاطہ! سمجھ کے شانہ کیجو اُس زلف کا ہو نہ بال بیکا
سمجھے نہ وہ مومن اور نہ کافر دل چاہیے اُس کو، ہو کسی کا
جی سے نہیں بھولتا ہے اب تک کہنا ترا ہنس کے وہ "اجی" کا
تھا آئنہ ہاتھ میں کہ ناگہ ق مغرور ہو اپنی نیکوی کا
شب ماہ کو دیکھ کر یہ بولا "ہے اس کا بھی کتنا حسن پھیکا!"

ظاہر میں ہے گو درست احوال
سی پارہ ہے دل تو مصحفیؔ کا

۷۰

زلفوں کی درہمی نے برہم جہان مارا پلکوں کی کاوشوں نے سینوں کو چھان مارا
ہرگز وہ دست و بازو ہلتے کبھی نہ دیکھے جو تیر اُس نے مارا سو بے کمان مارا
سچّا تو ہو گیا میں ٹک بارے عاشقوں میں صد شکر مجھ کو تو نے کر امتحان مارا
کوئی کہاں تلک اب ان کی سنے نصیحت بک بک کے دوستوں نے اپنا تو جان مارا
تھی وصل کی شب اور میں بے خود پڑا ہوا تھا ق اتنے میں فوجِ غم نے تھا نا سا آن مارا
جوں مرغِ صبح بولا، صدمہ یہ دل کو پہنچا جیسے کسو نے میری چھاتی پہ بان مارا
تم کو بھی کچھ خبر ہے؟ جب رات ہم نے آ کر سرِ سنگِ آستاں سے، اے میری جان! مارا
جو جامہ زیب گزرا مثلِ صبا اُدھر سے آتش پر اس نے دامن میری ندان مارا
ہر یک نگاہ تو نے تیغ جفا علم کر ق جس دن سے مصحفیؔ کو اے بدگمان مارا!
لاشے پر اس کے ہر دم کہتے ہیں لوگ آ کر
"کیا مفت میں گیا ہے یہ نوجوان مارا!"

۷۱

ذرا ہم سے بھی ملتے جائیے گا کبھو تو اس طرف بھی آئیے گا

ہمارا دل ہے قابو میں تمہارے — بھلا جی کیوں نہ اب ترسائیے گا!
جو ہم رونے پہ آویں گے تو اے ابر! — بجائے آب، خوں برسائیے گا
بہار آئی تو اب کے ناصحوں کو — گریباں پرزے کر دکھلائیے گا
کہا اے مصحفی میں اس سے ایک دن ق — "کہ بوسہ آج تو دلوائیے گا"

جواب اس نے دیا مجھ کو کہ "صاحب
کوئی یہ وقت ہے؟ پھر آئیے گا"

۷۲

یہ قطرہ اشک نے مژگاں سے تار باندھ دیا — کھوٹ میں گہرِ آب دار باندھ دیا
دھوئیں نے آہ کے میری کبھی جو سر کھینچا — زمیں سے تا بہ فلک اک غبار باندھ دیا
نہیں یہ آبلہ کامِ جرس میں آویزاں — کسی نے اپنا دلِ بے قرار باندھ دیا
نکلتے گھر سے کیا خون ایک عالم کا — کمر سے اُس کی یہ کن نے کٹار باندھ دیا
فغاں! کہ مرہم کافور کی جگہ ہم نے — نمک بہ روے دلِ داغدار باندھ دیا
ہر اشک کو مری مژگاں سے یوں علاقہ ہے — کہ جوں ستار کی کھونٹی سے تار باندھ دیا
دَر اس کا مجھ سے چھپا ہی رہا، کبھی تو نے — اٹھا کے پردہ، نہ لے پردہ دار باندھ دیا
ترے تماشے کو خلق اتنی آئی عید کے دن — کہ اک پرا سا سرِ رہ گزار باندھ دیا

فلک کو دیکھ تو اے مصحفی کہ صانع نے
عجب طرح کا یہ نقش و نگار باندھ دیا

۷۳

بس کہ ہر دم چاکِ تازہ میں گریباں میں دیا — مجھ کو سودائی سمجھ، یاروں نے زنداں میں دیا
موسمِ گُل سج ہے، مرجانے کی جا تھی صحنِ باغ — اس لیے بلبل نے اپنا جی گلستاں میں دیا
ایک عالم مجھ کو پیارے از پئے تیغ آیا نظر — سرمہ جس دم تو نے اپنی چشمِ فتّاں میں دیا

کچھ بھی جمعیت ہوئی حاصل نہ ہم کو، ہم نے ہائے! — رایگاں دل خواہشِ زلفِ پریشاں میں دیا
اس کی طاقت تھی نہ ہرگز بن کے شعلے کا حریف — مفت پروانے نے جی اپنا چراغاں میں دیا
جوں سرِ منصور یہ سر خود سزائے دار تھا — ہم نے اپنے سر کو ناحق عشقِ خوباں میں دیا
خاک گلیوں کی رہا، بھر عمر سر پر چھانتا — ہاتھ سے دل جس نے بازی گاہِ طفلاں میں دیا

عشق کی وادی سے کوئی سالم نہ آیا مصحفیؔ
ہم نے سب اسباب اپنا اس بیاباں میں دیا

۷۴

درمیاں میں نقاب کس دن تھا؟ — میرے اس کے حجاب کس دن تھا؟
لطف کرتے تھے مجھ پہ تم ہر دم — جانِ من! یہ عتاب کس دن تھا؟
آہ جاتی تھی سعی سے لب تک — نالہ پا در رکاب کس دن تھا؟
حادثے ہوتے تھے زمانے میں — اس قدر انقلاب کس دن تھا؟
کشورِ بخت تیرہ روزاں میں — جلوہ گر آفتاب کس دن تھا؟
کون رویا ہے، گل کے چہرے پر — اس قدر آب و تاب کس دن تھا؟

مصحفیؔ آج تو قیامت ہے
دل کو یہ اضطراب کس دن تھا؟

۷۵

خط ترا مشکتاب کس دن تھا؟ — ابر میں آفتاب کس دن تھا؟
چاندنی تھی تمام شب گھر میں — ماہ، زیرِ نقاب کس دن تھا؟
رات دن اپنے خوش گزرتے تھے — عشق خانہ خراب کس دن تھا؟
یوں تو تم مجھ سے مُنہ چھپاتے تھے — یہ کشش، یہ حجاب کس دن تھا؟
تو ہی انصاف کر بھلا اے عشق! — ہم پہ اتنا عذاب کس دن تھا؟

اُس کو ہم مستِ حسن پاتے تھے — مستِ جامِ شراب کس دن تھا؟
زلف کی طرح اینٹھتے ہو کیوں؟ — تم میں یہ پیچ و تاب کس دن تھا؟
موجد اس کام کا توٗ ہے، ورنہ — قتلِ عاشق ثواب کس دن تھا؟
جس طرح توٗ نے مُنہ چھپایا، یوں — لبِ بامِ آفتاب کس دن تھا؟

مصحفیؔ تھا تو شیعہ مذہب لیک
نعرہ بوتراب کس دن تھا؟

۷۶

دل چرانا یہ کام ہے تیرا — لے گیا ہے تو نام ہے تیرا
ہے قیامت بپا کہ جلوے میں — قامتِ خوش خرام ہے تیرا
جس نے عالم کیا ہے زیر و زبر — یہ خطِ مشک فام ہے تیرا
دید کرنے کو چاہئیں آنکھیں — ہر طرف جلوہ عام ہے تیرا
کس کا یہ خوں کیے توٗ آتا ہے؟ — دامن افشاں تمام ہے تیرا
ہو نہ ہو توٗ، ہماری مجلس میں — تذکرہ صبح و شام ہے تیرا
تیغِ ابرو ہمیں بھی دے اک زخم — سر پہ عالم کے دام ہے تیرا

توٗ جو کہتا ہے "مصحفیؔ ادھر آ!"
مصحفیؔ کیا غلام ہے تیرا؟

۷۷

میرا زانو دبا کے اُٹھ جانا — صدقے میں، اس ادا سے گر مانا!
اب نہ فرہاد ہے نہ مجنوں ہے — رہ گیا عاشقوں کا افسانا
رات کیا کیا صنم کی سیر ہوئی — نظر آتا تھا ایک بت خانا
نگہِ آشنا نے اس کی کیا — ایک عالم سے مجھ کو بیگانا

قہر ہے اک تو اُن کڑوں کی صدا ‏ تس پہ پھر پالوں کا بھی تھپکانا
میں گیا کل تو اس نے دست بخیر ‏ میری ایک پیش قبض گذرانا

مصحفی ہوں، یہ کام ہے میرا
تیری ایک اک ادا پہ مرجانا

۷۸

ہے لالہ گوں شفق سے دامن جو آسماں کا ‏ سب ماجرا ہے اپنی یہ چشمِ خوں فشاں کا
سرخی میں اس کے رخ کی زردی سی مارتی ہے ‏ اِس سال کچھ سنہرا ہے رنگ گلستاں کا
کہتے ہیں آتشِ گل بھڑکے ہے پھر چمن میں ‏ کیا جانے رنگ کیا ہو بلبل کے آشیاں کا
گہہ دل میں گہہ جگر میں وہ پیرتی رہے ہے ‏ ہے سیرگاہ میرا سینہ، تیری سناں کا
بانگِ رسیدگاں سے گوشِ زمانہ کر ہے ‏ منزل پہ شور دُونا ہوتا ہے کارواں کا
جو تیر پھینکے ہے تو، جاتا ہے دائیں بائیں ‏ رُخ پھر گیا ہے ہم سے ازبس تری کماں کا
اک دار پر چڑھا ہے، اک تیغ تک رہا ہے ‏ ہے گرم اس گلی میں بازار امتحاں کا
صیّاد سے کہو ٹک، ظالم! ذرا خبر لے ‏ احوال اب بتر ہے اِس صید نیم جاں کا
زردی کو میرے رُخ کی جو دیکھے ہے کہے ہے ‏ "دیکھا نہیں ہے ہم نے یہ رنگ زعفراں کا"

پاتا ہوں مصحفیؔ کو میں ان دنوں مشوّش
کیا جانے آ گیا ہے دل کس پہ اُس جواں کا؟

۷۹

عالم ہمیں خوش آیا ازبس کہ اس جہاں کا ‏ آ کر عدم سے بھُولے نقشا بھی ہم تو واں کا
کس کس کے سر پہ دیکھیں آتی ہے اب قیامت ‏ نکلا ہے پانو باہر اس فتنۂ زماں کا
قبضے کی او جھڑیں تو میں کھائیں سیکڑوں پر ‏ دیکھا نہ ہاتھ اُٹھنا اُس نازنیں جواں کا
پردے میں مُنہ چھپانا، چِتون بھی پھر دکھانا ‏ قربان ہوں میں تیرے اس عشوۂ نہاں کا

گر دستِ تیغِ خوباں بے صرفگی پہ آوے
آمادہ ہے یہ سینہ صد زخمِ خوں چکاں کا

کس زندگی کے اوپر فکرِ معاش کیجے
پڑتا نہیں بھروسا اس چشمِ ناتواں کا

چاروں طرف سے آتش دیدے تو مجھ کو اے عشق!
کیا کام ہے جلانا اک مشتِ استخواں کا

البتّہ مصحفیؔ کو ہے ریختے میں دعویٰ
یعنی کہ ہے زباں داں، اردو کی وہ زباں کا

۸۰

مشتاق ہی دل برسوں اُس غنچہ دہن کا تھا
یارو! مرے اور اُس کے کب ربطِ سخن کا تھا

واں بالوں میں وہ مکھڑا جاتا تھا چھپا کم کم
یاں حشر مرے دل پر اک چاند گہن کا تھا

تھی خطِّ شکستہ کی رخسار تیرے تعلیم
ازبس کہ ہجوم اُن پہ زلفوں کی شکن کا تھا

پروانے کی ہمّت کے صدقے میں کہ دی شب وہ
اس بے پر و بالی پر قربان لگن کا تھا

آخر کو ہمیں ظالم پامال کیا تو نے
اندیشہ ہمیں دل میں تیرے ہی چلن کا تھا

میں اس قد و عارض کو کر یاد بہت رویا
مذکور گلستاں میں کچھ سرو و سمن کا تھا

جوں اشکِ سرِ مژگاں ہم پھر نہ نظر آئے
ازبس کہ یہاں وقفہ اک چشم زدن کا تھا

دو پھول کوئی رکھ کر گزرا تھا جو کل یاں سے
تربت پہ مری بلوا مرغانِ چمن کا تھا

جس مرغِ چمن کو میں دیکھا تو چمن میں بھی
حسرت کشِ نظّارہ اس رشکِ چمن کا تھا

شب دیکھ مہِ تاباں، تھا مصحفیؔ تو حیراں
کیا اس میں بھی کچھ نقشا اس سیم بدن کا تھا؟

۸۱

بھٹکا پھرے ہے تیری، دل اک ادا کا مارا
کہہ کس طرف کو جاوے اب یہ خدا کا مارا؟

زلفوں سے اُس کی، اے دل! ہے مجھ کو کیا سروکار
پھرتا ہوں میں تو آپھی اپنی بلا کا مارا

ہم حالِ دل کی اپنے تقریر کر رہے ہیں
وہ بولتا نہیں کچھ ہرگز حیا کا مارا

وہ صیدِ خوں گرفتہ جیتا بچا نہ ہرگز / جو صید گہ میں آیا تیرِ قضا کا مارا
دیکھا جو خوں میں غلطاں مجھ کو تو لوگ بولے / "یہ کشتہ ہے کسی کے رنگِ حنا کا مارا"
پھٹکار سی کسی کی اس دل کو لگ گئی ہے / کیا جانیے یہ پھرے ہے کس کی دعا کا مارا؟

کل مصحفی کو میں نے کوچے میں اس کے دیکھا
ٹکڑے ہوا پڑا تھا تیغِ جفا کا مارا

۸۲

عارض نہ تیری زلفِ پریشان میں دیکھا / یوسف کو زلیخا کے میں زندان میں دیکھا
سر کھینچے تھا شعلہ سا مرے دل سے فلک تک / میں طرفہ تماشا شبِ ہجران میں دیکھا
ہرگز نہ رہا ہاتھ مرا، جامہ دری سے / اک چاک نیا روز گریبان میں دیکھا
میں کوئی پسِ مرگ بھی آسودہ نہ پایا / عالم کے تئیں خوابِ پریشان میں دیکھا
گر تو بھی کرے سیر بیاباں کی تو سمجھے / اک جذبِ عجب میں نے بیابان میں دیکھا
عارض پہ ترے صلِّ علیٰ کیوں کہ نہ کہیے؟ / اس رنگ کا اک گل نہ گلستان میں دیکھا
کاہے کو تعب کھینچے ہے اس دل کی صفا پر؟ / آئینے نے کیا دیدۂ حیران میں دیکھا؟
جس کشتے کا دنیا میں کہیں کھوج نہ پایا / وہ کشتہ ترے چاہِ زنخدان میں دیکھا
باراں کی ہوا، آبِ رواں، لالہ کا کھلنا / یہ رنگ سب اس دیدۂ گریان میں دیکھا
ہو اشک ان آنکھوں سے گرے صبح کے تارے / موتی کے تئیں جب سے ترے کان میں دیکھا
کس رنگ کا تھا کشتہ؟ کہ ایّامِ بہاراں / بلبل کو تڑپتا میں خیابان میں دیکھا

اے مصحفی، افسوس! کہاں تھا تو دوانے؟
کل اس کے تئیں ہم نے عجب آن میں دیکھا!

۸۳

آویزۂ لعل اس کے جو میں کان میں دیکھا / صد لختِ جگر دیدۂ گریان میں دیکھا

اللہ رے ترے حسن کے شعلے کی تجلّی
یہ جلوہ نہ خورشیدِ درخشاں میں دیکھا

پھر جائے دل اس بت سے مرا پڑھتے ہی جس کے
ایسا تو کوئی سورہ نہ قرآں میں دیکھا

چھوٹا نہ تری قید سے جیتا کوئی ظالم!
لاکھوں کو سسکتا ترے زنداں میں دیکھا

مجنوں نے کیا آپ کو گم مارے خوشی کے
جب ناقۂ لیلیٰ کو بیاباں میں دیکھا

مارے گئے راتنے کہ ہوئے لاشوں کے تودے
گھمسان پڑا عشق کے میداں میں دیکھا

دل قطرۂ خوں ہو کے بہا چشم سے میری
جب تکمۂ لعل اس کے گریباں میں دیکھا

جس گل سے کہ دینا میں ترے رنگ کو تشبیہ
ایسا تو کوئی گل نہ گلستاں میں دیکھا

دل لڑکوں کے پتھروں سے جو پاوے تھا ہمیشہ
وہ ذوق ترے تیروں کے پیکاں میں دیکھا

جز سبز خطاں کی نہ نظر، اور کے اوپر
جب سبزے کو میں نے مہِ شعباں میں دیکھا

تجھ سا تو کوئی کج کلہ، اے کافرِ ہندی!
شیراز میں دیکھا نہ صفاہاں میں دیکھا

اے مصحفیؔ کہتا تھا میں تو اس سے نہ لگ چل
دل لے ہی گیا تیرا نہ اک آن میں دیکھا!

۸۴

آتا ہے یاد مجھ کو خونخوار کا لپٹنا
اور اس گلے سے اس کی تلوار کا لپٹنا

تم نازنیں جواں ہو، مت چھیڑو دل جلوں کو
بگڑے تو پھر ستم ہے دو چار کا لپٹنا

رکھتا ہے میرے دل کو نت پیچ و تاب ہی میں
زنّار سی کمر سے، زنّار کا لپٹنا

اس سادگی کے اوپر، اک قہر ہے بلا ہے
برقع میں اس پری کے رخسار کا لپٹنا

مشاطہ! دیدنی ہے، موئے کمر سے جا کر
اس زلفِ عنبریں کے ہر تار کا لپٹنا

مانندِ زلفِ خوباں ازبس دراز ہے وہ
مشکل ہے عاشقوں کے طومار کا لپٹنا

لپٹے تو ہے تو مجھ سے، اے زلف! لیک اک دن
جی لے رہا ہے تیرا، یہ پیار کا لپٹنا

زلفِ سیہ سے اس کی تو پُر حذر ہی رہیو
اے مصحفیؔ! بلا ہے اس مار کا لپٹنا

۸۵

ہجومِ گریہ، زبس رات چشمِ تر میں رہا
سحر کے ہوتے نہ اک قطرہ خوں جگر میں رہا

کبھی جو یار نے دزدیدہ مجھ کو دیکھا، تو میں
امیدوارِ نظارۂ دگر میں رہا

دل و جگر ترے پیکانِ تیر کا گھر تھا
کبھو وہ دل میں رہا اور کبھو جگر میں رہا

خلش گئی نہ پس از مرگ بھی الم کی ترے
موے بھی ہم تو وہی نیشتر جگر میں رہا

نہ دیکھا اُس نے کبھی مجھ کو آنکھ اُٹھا اور میں
تمام عمر تمنائے یک نظر میں رہا

قلم سے کھینچ کے، مانی! تجھے دکھا دیں گے
کسی کے حُسن کا نقشا اگر نظر میں رہا

زبس کہ نالے کو شب، اضطراب تھا تجھ بن
تمام رات دعائے اثر اثر میں رہا

اِدھر سے میری نظر سیر ہی رہی کرتی
اُدھر سے گرچہ ترا ہاتھ چاکِ در میں رہا

رہے گا تا بہ کمر خوں تری گلی میں میاں
اسی ادا سے جو خنجر تری کمر میں رہا

گرا جو شمع پہ پروانہ جل کے، یوں بولا
"اُڑوں میں کاہے سے کیا خاک بال و پر میں رہا

تم اُٹھ گئے جو میاں، مصحفی کی بالیں سے
تمام رات پڑا ماتم اُس کے گھر میں رہا

۸۶

وہ حُسن جاتا رہا اُس کا، وہ گلو نہ رہا
وہ رنگ و بو نہ رہا اور وہ رو و مو نہ رہا

بہت کہا میں کہ اس شب تو رہ تو میرے پاس
مرے کہے کو نہ سمجھا، وہ تند خو نہ رہا

پھر آفتاب بھلا روبرو ہو کس مُنہ سے؟
کہ آفتاب کا حسن اُس کے روبرو نہ رہا

دماغ نے ہمیں سیرِ چمن کی رخصت دی
گلوں کے چہرے پہ دفعتہً رنگ و بو نہ رہا

دیا فشار مرے دل کو عشق نے یاں تک
کہ اس میں خون تو کیا، رنگِ آرزو نہ رہا

نہ روئے خوب پہ بھول اس قدر کہ دنیا میں
کوئی ہمیشہ، مری جان! خوب رو نہ رہا

مری اور اس کی یہ صحبت رہی، کہ جب آیا
کبھو رہا وہ مرے پاس اور کبھو نہ رہا

وہ زخم کونسا آیا مرے، کہ رات اور دن
میانِ کشمکشِ مرہم و رفو نہ رہا

میں مصحفی تجھے پاس اُس کے چھوڑ آیا تھا
کچھ اُس نے تجھ کو کہا کیا؟ میاں! جو تو نہ رہا

۸۷

وہ عشق و ولولہ و شور رہا ہے وہ، نہ رہا — ہوئے ضعیف اِدھر ہم، اُدھر وہ تو نہ رہا
ہزار بار ہوا آئنہ مقابلِ یار — پہ تا بدیر کبھی اُس کے روبرو نہ رہا
گیا جو باغ میں تو سیر گل کو، دیکھ تجھے — چمن میں گل نہ رہا، گل میں رنگ و بو نہ رہا
ہزار جاں سے ہوا بس کہ یہ گریباں چاک — کہ جیبِ گل کی طرح قابلِ رفو نہ رہا
میں بس کہ گریے سے کی مشقِ آبپاشی کی — کہ لوحِ دل پہ کوئی حرفِ آرزو نہ رہا
میں تیرے روئے مخطّط پہ سخت حیراں ہوں — خط آئے پر کوئی اتنا تو خوبرو نہ رہا

بہارِ عمر میں اے مصحفی تو پی لے شراب
کہ کو کنار کے کاندھے پہ نت سبو نہ رہا

۸۸

ہو کیوں نہ تشنۂ خوں وہ ہم سے بیکسوں کا — ہے تیغ کا سا جوہر سبزہ تری مسوں کا
ناخن بہ دل زن از بس تھیں انگلیاں صنم کی — سینے پہ میرے نقشا ہے اب تلک دسوں کا
زلفوں نے اس کی ہم کو زنجیر کر رکھا ہے — بس کیا چلے ہے ان سے ہم جیسے بے بسوں کا
ہے تختہ بند انساں ہیکل میں استخواں کی — کم از رسن نہیں کچھ یہ جال سا، نسوں کا

جیتا تری گلی میں پہنچا نہ مصحفی ہائے
آخر ہوا وہ طعمہ صحرا میں کرگسوں کا

۸۹

دیدۂ بے دید، دشمن ہو گیا — مجھ کو اک نظارہ رہزن ہو گیا

ہم جہاں روئے ذرا خوں، بیٹھ کر
اس زمیں کا تختہ گلشن ہو گیا

صبح ہوتے جب دیا منہ اس نے کھول
مطلعِ خورشید روشن ہو گیا

بس وہ دوزخ ہوں کہ آتش پر مری
آب بھی چھڑکا تو روغن ہو گیا

کس کی مژگاں شب خدنگ انداز تھیں؟
سینۂ افلاک روزن ہو گیا

وسعتِ دستِ جنوں کے ہاتھ سے
اب گریباں جیسے دامن ہو گیا

مصحفیؔ پھر جان کا کیا ہے دریغ!
جب فدائے دوست تن من ہو گیا

۹۰

دوست تھا اپنا، سو دشمن ہو گیا
راہبر قسمت سے رہزن ہو گیا

سنگِ دل تیرے کی سختی سے، میاں!
اب تو دل اپنا بھی آہن ہو گیا

شمع پردے میں جلی تو کیا ہوا؟
ہم پہ سب احوال روشن ہو گیا

پردۂ دل میرا چھلنی کی طرح
چھن کے ان پلکوں سے روزن ہو گیا

آتے آتے ٹک مرے لب پر دریغ
نالۂ شادی بھی شیون ہو گیا

جب دیا چاکِ گریباں اُس نے کھول
دامنِ نظارہ گلشن ہو گیا

مصحفیؔ تھا تو تو دریا نوش، واہ
اک ہی پیالے میں اٹیرن ہو گیا

۹۱

میاں تم ہم سے نت کرتے ہو رم کیا؟
تمھیں ایسے برے لگتے ہیں ہم کیا؟

ستم کرتے رہے تم، اور ہم نے
نہ جانا یہ کہ ہوتا ہے ستم کیا!

قدِ نازک نہال اس شاخِ گل کا
ہوا سے دیکھیو کھاتا ہے خم کیا!

رگِ گل کر دیا موئے کمر کو
کرے کام اس سے نازک مو قلم کیا!

تری آنکھوں کی کیفیت کے آگے مری آنکھوں میں ٹھیرے جام جم کیا؟
صمد سے پھر گئیں زاہد کی آنکھیں نظر آیا کوئی کافر صنم کیا؟
بہت دم باز میں دیکھے ہیں ایسے مجھے باتوں میں تم دیتے ہو دم کیا!
قسم کھاتے ہو میرے سر کی جھوٹی میاں جاؤ بھی جھوٹوں کی قسم کیا!
نہیں آتے جواب پلکوں پہ آنسو جگر سب ہو گیا، اے چشمِ نم! کیا؟
نہیں آتا سرِ تیر اب جو کوئی سبھی مارے گئے صیدِ حرم کیا؟
جو قہ ہیں مصحفی شاعر ہیں وے لوگ
ہماری شاعری کیا اور ہم کیا!

۹۲

ترچھے قدم کے پڑتے کل جوں قد اس کا لچکا پہنچا تلے زمیں کے مُردوں کے دل کو دھچکا
کہیے جو جھوٹ تو ہم ہوتے ہیں کہہ کے رسوا سچ کہیے تو زمانہ، یارو! نہیں ہے سچ کا
اب دیکھو تو قلعی سی اُن کی اُدھڑ گئی ہے تھا جن عمارتوں پر دلی کی کام گچ کا
گھوڑے کی ٹاپ اُس کے جس دم لگی زمیں پر زیرِ زمیں کلیجا کانپا زمیں کا دھچکا
تا زیست مصحفی کے چھوڑی نہ دل کی جانب
دیوانہ ہوں میں یارو زلفوں کی اس کی پیچ کا

۹۳

خط گرد ہے چہرے کے ترے نادِ علی سا مُنہ لال ہے پانوں سے ترا گل کی کلی سا
اللہ رے تری شان کہ با ایں ہمہ شوکت پیدا نہ کیا پھر ید قدرت نے علی سا
ہونا بہت آسان ہے شیطان سے مشہور پر ہو تو ہے اوّل کوئی دنیا میں ولی سا
گر مصحفی دل بیچے تو مت چھوڑیو اُس کو
مجھ کو نظر آتا ہے یہ مصحف بغلی سا

۹۴

برہم زنِ تقریر نہیں پیر و جواں کا — جوں غنچہ میں عقدہ ہوں پر اپنی ہی زباں کا

مت بھول بہارِ رخِ گل، رنگ پر اتنا — یاں رنگ کی گردش ہی میں موسم ہے خزاں کا

پیدا ہے کہ حلقوم پہ ہم تشنہ لبوں کے — ہے حکم تری تیغ کے تئیں آبِ رواں کا

بے نام و نشاں ہو گئے جو بندہ و لیکن — پایا نہ عدم میں بھی نشاں اس کے دہاں کا

ازبس کہ تعب کھینچے ہے اب دل کو ہمارے — نے آہ کی طاقت ہے، نہ زہرہ ہے فغاں کا

سو بتکدے اور دَیر ہوے خاک برابر — پر دل سے ہمارے نہ مٹا نقش بتاں کا

پیراہنِ شبنم سے بدن کو ترے، اے گل! — گر دیکھیے تو رابطہ ہے ماہ و کتاں کا

تعریف بیاں کرتے ہو تم، حُسن کی اپنے — واللہ کہ کشتہ ہوں میں اس حسنِ بیاں کا

جوں ریگِ رواں رہتے ہیں دن رات سفر میں — کیا جانیے ہے اپنے تئیں قصد کہاں کا

رسوائیِ عشق اپنی بہت دور گئی ہے — اندیشہ ہمیں کچھ نہیں اب سُود و زیاں کا

کیا جانیے ہے منتظر آنے کی وہ کس کے؟ — نرگس میں ہے نقشا مری چشمِ نگراں کا

یہ خون میں کس کشتے کے سر ڈوب ہوئی ہے؟ — کیا رنگ چمکتا ہے تری نوکِ سناں کا

اے مصحفی، جاتے ہیں تہی، دیکھیے کیا ہو
کچھ کام ہوا ہم سے نہ یاں کا نہ وہاں کا

۹۵

جب کوہ و بیاباں میں جا ہم نے قدم مارا — فرہاد نہ کچھ بولا، مجنوں نے نہ دم مارا

تنہا نہ دل اپنا ہی میں زیر و زبر دیکھا — اُس جنبشِ مژگاں نے عالم کو بہم مارا

باتوں پہ کوئی اُس کی بھولے سو وہ دانا ہو — کتنوں کو یونہیں اس نے کھا جھوٹی قسم مارا

وہ توجہ پہ کُشتی گیر اُترا جو نہیں میداں میں — تیّاری کو دیکھ اس کی رستم نے نہ دم مارا

اُن کو جو زمیں پر تھے محسودِ زمانے کے — آخر کو فلک تو نے کر جور و ستم مارا

تھا صید فگن میرا، ازبس کہ ستم پیشہ — کعبے گیا تو واں بھی سو صیدِ حرم مارا

میں تیرے تغافل کا کشتہ ہوں، کہ عاشق کو — معشوق کی آنکھوں نے اِس لطف سے کم مارا

اے مصحفی جو میرے اشعار بیاضی تھے
میں صاد کیا ان پر اور سب کو قلم مارا

۹۶

دشنام سو سنیں لبِ خوباں سے، کیا کیا؟ — گر ہم ذلیل ہو گئے طفلاں سے، کیا کیا؟
لشکر کشی پر اپنی تو منعم نہ بھولیو — اک مور نے سنا، کہ سلیماں سے کیا کیا؟
دیر و حرم تک آ تو، کہ معلوم ہو تجھے — الفت نے تیری گبر و مسلماں سے کیا کیا
جو ہاتھ اُس کے گوشۂ داماں سے دور تھا — اُس ہاتھ نے ہمارے گریباں سے، کیا کیا؟
یہ خوں سنجافِ سرخ سے کچھ کم نہ تھا میاں! — کیوں دھویا میرے خون کو داماں سے، کیا کیا؟
جو قیدی اس کی تیغ سے محروم ہی رہے — اُن قیدیوں نے چھوٹ کے زنداں سے کیا کیا؟
گا ہے سلام تو مرا کہہ دے تھا یار سے — افسوس کیوں بگاڑی میں درباں سے کیا کیا!

اے مصحفی نہ کڑھ کہ جگر میرا چھن گیا
ہم نے کسی کے ناوکِ مژگاں سے کیا کیا

۹۷

گر اور بھی مری تربت پہ یار ٹھہرے گا — تو زیرِ خاک نہ یہ بے قرار ٹھہرے گا
نہ بولو کوئی مرے جھگڑے میں میں سمجھ لوں گا — مرے اور اس کے جو دار و مدار ٹھہرے گا
اگر یہ ہے ترے دامن کی حشر و نشر میاں — زمیں پہ خاک ہمارا غبار ٹھہرے گا!
چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ، نسیم! — کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا
یہی ہے دل کا دھڑکنا مرے اگر تہِ خاک — تو کیا مزار پہ سنگِ مزار ٹھہرے گا!
نگاہِ لطف سے تیرے ہیں توقع ہے — کبھی تو وعدۂ بوس و کنار ٹھہرے گا
تمھارے ناوکِ مژگاں کے سامنے خوباں! — کہاں تلک یہ دلِ داغدار ٹھہرے گا؟

یہی ہے لوٹ تو شانے کے ہاتھ سے پیارے
نہ ایک بھی تری زلفوں کا تار ٹھہرے گا
تمھارے وعدوں پہ ہم کو تو اب نہیں ٹھہراؤ
مگر نیا کوئی امیدوار ٹھہرے گا
جو سیر کرنی ہے کر لے کہ جب خزاں آئی
نہ گل رہے گا چمن میں، نہ خار ٹھہرے گا
خدنگ خوردہ دل آگے سے اس کے جاتا ہے
خبر نہیں کہ کہاں یہ شکار ٹھہرے گا
شتاب آ، یہ ٹھہرا رکھیں گے ہم اس کو
جو جاں لبوں پہ شبِ انتظار ٹھہرے گا
اسے نہ دفن کرو، سمجھو تو کوئی، یارو!
زمیں میں مصحفیِ بے قرار ٹھہرے گا؟

۹۸

جو رنگ بدلے ٹک اس چرخِ آبنوسی کا
یہ رنگ کیوں ہو مرے اشکِ سندروسی کا
رچے ہی رہتے ہیں مہندی سے دست و پا شب و روز
زبس کہ اس کے تئیں شوق ہے عروسی کا
ملاحت ایک تو ترے حُسن کی قیامت ہے
کرے ہے تس پہ ستم رنگ شالِ طوسی کا
میں وہ نہیں ہوں کہ سر بر ہو مجھ سے خصمِ رکیک
کہ خامہ ہاتھ میں میرے عصا ہے موسی کا
نہ پہنچے مصحفی ہم اس کے در تلک گاہے
نت اشتیاق رہا آستانہ بوسی کا

۹۹

نہیں زلفوں کی ترے بے سر و پائی کا گلا
ہے ہمیں اپنے نصیبوں کی رسائی کا گلا
اُس سے، جس کے تئیں مانندِ حنا مل ڈالا
نہ سنا ہم نے ترے دستِ حنائی کا گلا
دُور کھینچے ہے زبس اپنے تئیں مجھ سے وہ شوخ
وصل میں بھی مجھے رہتا ہے جدائی کا گلا
دشتِ پر خارِ محبت سے اگر ہووے گزار
مردِ عاشق کو نہیں برہنہ پائی کا گلا
مصحفی کیا ہوئے ہو جان کے اپنی دشمن
کرتے پھرتے ہو جو تم ساری خدائی کا گلا

۱۰۰

کتنوں کو تو نے شوخ کماں کش الٹ دیا
جس وقت اپنے تیروں کا ترکش الٹ دیا

خورشید ہو گیا خجل، اپنے عذار سے
پردہ جو تو نے، اے بتِ مہ وش! الٹ دیا

وا قسمتا! کہ سر پہ مرے آفتاب نے
ہوتے ہی صبح طشتِ پر آتش الٹ دیا

حسرت یہ ہے کہ ضد سے مری، کل زمین پر
ساقی نے شیشۂ مئے بیغش الٹ دیا

اے مصحفی تو کیوں کہ بچے اس نگاہ سے
جس نے کہ رستموں کو بہ ابرش الٹ دیا

۱۰۱

فسانہ اک طرف شب ہائے ہجراں کی درازی کا
قیامت ماجرا نالوں کی ہے ہنگامہ سازی کا

نہ مہر و لطف، نے گاہے نگہ اور نے کبھی ملنا
بیاں کیا کیجیے اللہ تیری بے نیازی کا!

وہ روزِ عید جب چھب کو بنا مسجد میں آتا ہے
ڈھلا جاتا ہے اس کی ہی طرف دل ہر نمازی کا

بھری مجلس میں روتی شمع کیوں، میری طرح اس کو
جو ہوتا حوصلہ بے طاقتی اور جانگدازی کا

نہ پہنچاوے خدا نگیں دلوں تک شیشۂ دل کو
کہ چرچا سخت ہے عالم میں اب بے امتیازی کا

زبس ہر لحظہ اشکِ تازہ آ، مژگاں پہ ناچے ہے
مری آنکھوں میں عالم جلوہ گر ہے شیشہ بازی کا

نہ چھوڑ اے مصحفی تو آستانِ حضرتِ دل کو
سب اس سرکار سے پاتے ہیں خلعت سرفرازی کا

۱۰۲

ٹک دیکھتا تو جا، ترا بسمل کدھر چلا
کر ذبح اس کو ہائے تو قاتل کدھر چلا؟

شرطِ وفا یہی تھی بھلا کوئے یار میں!
تنہا تو مجھ کو چھوڑ کے اے دل کدھر چلا؟

مانندِ گرد باد ہے کچھ رو بہ آسماں
آوارگانِ شوق کا محمل کدھر چلا؟

آنکھوں سے بحرِ اشک کو ہونے دے موج زن
ہم تجھ سے تب کہیں گے کہ ساحل کدھر چلا؟

دل تک پہنچ کے تو نے کیا سوئے کعبہ رُخ
اے مصحفی! تو چھوڑ کے منزل کدھر چلا؟

۱۰۳

کس سے سیکھا ہے میاں تم نے مٹک کر چلنا؟ — آتشِ خفتہ پہ دامن کو جھٹک کر چلنا؟
شاخِ گل صدقے ہے اس تیرے قدِ نازک کے — اُس نے پایا ہے کہاں ایسا لچک کر چلنا!
اس کی رفتار کے بل سمجھے کوئی کیا طاقت؟ — برق بھی سیکھ گئی جس سے چمک کر چلنا
فتنۂ تازہ زمانے میں ہوا ہے پیدا — اس کے آگے سے تو، اے فتنہ! دبک کر چلنا

مصحفی چاہے ہے گر حسنِ تجلّی دیکھے
اک ذرا اس کی گلی سے تو ٹھٹک کر چلنا

۱۰۴

کس رات میں اس فکر سے تا صبح نہ جاگا؟ — کب شوخ تصوّر ترا آگے سے نہ بھاگا؟
کیا ڈھونڈے ہے اسبابِ رفو زخم جگر کا؟ — یاں سوزنِ عیسیٰ کو میسّر نہیں تاگا
رکھ آیا ہے اک ناند کا جیسے کہ کنارا — تم دیکھیو زاہد کی ذرا پگڑی کا آگا
کس شب میں نہ کی فکرِ خوش اندازِ سخن میں؟ — کس روز نشانے پہ مرا تیر نہ لاگا؟
گر تارِ محبت نہ دوتا ہو کے بٹا جائے — ہے بیمِ گسستن اُسے، کچّا ہے وہ دھاگا

گہ فارسی کہتا ہوں گہے مصحفی ہندی
یعنی کہ مری طبع کا گھوڑا ہے دوباگا

۱۰۵

کل دیکھ کے مجھ کو جو سرِ رہ سے وہ بھاگا — میں کوچہ بدل دوڑ کے اس کا لیا آگا
خوابیدہ رہا خون مرا کوے بتاں میں — سو فتنے اٹھے خاک سے پر ایک نہ جاگا

کچھ ٹوٹے پھٹے سینے کو ساتھ اپنے سفر میں — کیا وہ بھی مسافر جو نہ رکھّے سوئی دھاگا

اک طرفہ بلا تھی شبِ ہجراں کی سیاہی — جو دیوِ سپید اُس کے تئیں دیکھ کے بھاگا

کل مصحفی نے دیکھا جو وہ جوہری بچّہ
رکھ ہاتھ میں فیروزۂ دل بیچنے لاگا

۱۰۶

آ کے جب پاس مرے وہ گلِ تر بیٹھ گیا — جوش کھا کھا کے مرا خونِ جگر بیٹھ گیا

تھا کھڑا بام پہ شب، مجھ کو جو دیکھا اس نے — مُنہ چھپا، شرم سے وہ رشکِ قمر بیٹھ گیا

اے مصوّر! تجھے ہم لکھ کے دکھا دیویں گے — اپنے دل میں بھی کوئی نقش اگر بیٹھ گیا

اشک آ پہنچے بہت جلد، بڑی خیر ہوئی — شعلہ اُٹھّا ہی تھا اس سینے سے، پر بیٹھ گیا

بزم میں اُس کی جو شب شمع کو روتے دیکھا — میں بھی اک کونے میں لے دیدۂ تر بیٹھ گیا

شام اس قاتلِ خونخوار نے جوں جھاڑا ہاتھ — رکھ کے خورشید مُنہ اپنے پہ سپر بیٹھ گیا

مصحفی جائے تھا گھر اپنے ولیکن ناگاہ — ق — تیرِ مژگاں جو ترا اس کے دو سر بیٹھ گیا

اک قدم چل نہ سکا کوچے سے تیرے وہ غریب
دونوں ہاتھوں سے پکڑ اپنی کمر بیٹھ گیا

۱۰۷

ناتوانی نے کیا اب تو ہمیں بے دست و پا — دست و پا ماریں نتھے ہم بھی جب تلک تھے دست و پا

جب سے آئے ہیں نظر یار وہیں وے دست و پا — ہم در و دیوار سے ماریں ہیں دے دے دست و پا

تیرا اسلوبِ بدن یوں دیکھ کر کہتی ہے خلق — 'دیکھیو پائے ہیں اس نے کیا ہی اچھے دست و پا'

گر نہ تھا جو رنگ میں تیغِ جفائے چرخ کا — کاٹ کر ٹکڑے کیے کیوں اس نے میرے دست و پا

حیف ہے تم کو نہیں اپنے تنِ زیبا کی قدر — لوگ پردے میں چھپا رکھتے ہیں ایسے دست و پا

رات سے اے مصحفی کچھ خون ہی روتا ہے تو
سچ تو کہہ کس کے حنائی تو نے دیکھے دست و پا؟

۱۰۸

پس گئے اہلِ زمیں یوں آسماں کے زیرِ پا
مورچے آجاویں جوں پیلِ دماں کے زیرِ پا

چونک اُٹھا میں سادہ اُس کو جان کر پائے نگار
آ گیا تھا سر مرا شب، پاسباں کے زیرِ پا

دیکھیے اک دم میں یہ سر جاوے یا سالم رہے
اب تو ہم بیٹھے ہیں تیغِ امتحاں کے زیرِ پا

شاخِ گل کا جھکنا ہم تجھ کو دکھا دیں گے نسیم!
آ گیا دامن گر اُس سروِ رواں کے زیرِ پا

کیجیو تربت، مری دیرِ مغاں کی راہ میں
شاید آجائے کسی مستِ جہاں کے زیرِ پا

ہر قدم پر فرش ہوتی آتی ہے دامن کی طرح
زلف بھی اس کیفیِ دامن کشاں کے زیرِ پا

کیا مزہ ہو میں پڑا روتا ہوں اور آنکھیں مری
وقتِ شب آجاویں اُس آرامِ جاں کے زیرِ پا

دیکھ کر رنگِ کفک کو اس کے یوں کہتی ہے خلق
'خوں کسی کا آ گیا ہے اس جواں کے زیرِ پا'

لذتِ محمل کشی میں کچھ نہ سوجھا اس کو ہائے
گرچہ تھا صحرا ہی نشتر سارباں کے زیرِ پا

کیا درازی زلف کی کہیے کہ ہنگامِ خرام
سانپ سی آجائے ہے اس مومیاں کے زیرِ پا

سرگزشت اپنی کہوں کیا ہائے اس گلشن کے بیچ!
سبزۂ بیگانہ ہوں میں رہرواں کے زیرِ پا

اب لگا کانٹوں پہ چلنے مصحفی، ہے کل کی بات
آبلہ پھوٹے نہ تھا اس ناتواں کے زیرِ پا

۱۰۹

روکے ان آنکھوں نے دریا کر دیا
ابر کو پانی سے پتلا کر دیا

حسن ہے اک فتنہ گر اُس نے وہیں
جس کو چاہا اُس کو رسوا کر دیا

تم نے کچھ ساقی کی کل دیکھی ادا؟
مجھ کو ساغرے کا چھلکا کر دیا

بیٹھے بیٹھے پھر گئیں آنکھیں مری
مجھ کو ان آنکھوں نے یہ کیا کر دیا

اس نے جب مجھ پر چلائی تیغ ہائے
کیوں میں اپنا ہاتھ اونچا کر دیا

مصحفی کے دیکھیو چہرے کا رنگ
عشق نے کیا اس کا نقشا کر دیا!

۱۱۰

اُس نے جب بندِ قبا وا کر دیا — خلق کو محوِ تماشا کر دیا

تجھ سے شکوہ ہے مجھے، اے چشمِ تر! — تو نے رازِ عشق افشا کر دیا

جنبشِ پا نے تری اے سروِ ناز! — ایک عالم جا سے بیجا کر دیا

حشر کے دن اک بڑا ہنگامہ تھا — آتے ہی کچھ اُس نے پرچا کر دیا

دی پلا ساقی نے مجھ کو صاف و درد — اک ذرا ساغر نہ ٹھہرا کر دیا

بیکسی برسے ہے میری خاک پر — مرگ نے عالم سے تنہا کر دیا

مصحفی رنگِ کفک نے یار کے
اک جہاں میں فتنہ برپا کر دیا

۱۱۱

جب عارضِ گل رنگ سے خط اُس نے نکالا — بلبل نے کہا سلمہ اللہ تعالا

ناداں ہے جو اب دل کو کوئی تجھ سے لگاوے — زلفوں کو دکھا تو نے کسے مار نہ ڈالا ؟

کیا عاشق و معشوق میں ہوتی ہے لڑائی — واں خنجرِ مژگاں ہے تو یاں آہ کا بھالا

ردِ بات کا ہرگز نہیں اس بزم میں مجھ کو — جوں آئنہ اک میں بھی ہوں منہ دیکھنے والا

ہووے نہ کبھی غسلِ شہیدانِ محبت — جب تک کہ نہ اس کوئیں بہے خون کا نالا

کرنے کو ترے حسن سے گلشن میں گدائی — ہر پھول لیے ہاتھ میں نکلے ہے پیالا

تدبیر تو سو کرتے ہیں ہم لیک کسی طرح — ہوتا نہیں اس دردِ محبت کا امالا

ہر حرف میں ہو جس کے کجی، راست تو یہ ہے — مانند نگیں ایسے کا مُنہ کیجیے کالا

بیتاب ہی رہتا ہوں سدا، جوں دُرِ غلطاں — دیکھا ہے میں جس دن سے ترے کان کا بالا

جو میری طرح سیر کرے سو وہی جانے — اس باغ میں اب سوجھے ہے مضمون نرالا

ہر غنچہ ہے دل بستگیِ طبع کا مکتوب — ہر گل ہے پریشانیِ خاطر کا رسالہ

اُس چشم کی گردش تو مجھے لے ہی گئی تھی — پر مصحفی میں اپنے تئیں زور سنبھالا

ہر اشک ہے مری چشمِ پُر آب میں دریا
بوقتِ گریہ ہے یاں کس حساب میں دریا

صدف کی طرح لگے رہنے اب وے پانی میں
جن آنکھوں نے کہ نہ دیکھا تھا خواب میں دریا

گیا ہے شورِ مرے بحرِ اشک کا داں تک
تبھی تو ہے شب و روز اضطراب میں دریا

ظہورِ حق سے نصیب اپنے جز طپش نہ ہوا
رکھے ہے موج کو نت پیچ و تاب میں دریا

کرے عطش پہ مری گر نگاہ، ساقیِ بزم
بجائے مے بھرے ظرفِ شراب میں دریا

نقاب رخ سے جو کھولے تو خلق جاوے ڈوب
رکھا ہے باندھ کے اُس نے نقاب میں دریا

حباب و موج کا کیا حادثہ بیاں کیجے؟
کہ آگیا ہے عجب انقلاب میں دریا

ڈرا کرو مرے طوفانِ اشک سے، یارو!
نعوذ باللہ گر آوے عتاب میں دریا

نظر بہ اصل جو کیجے تو موج ہے نہ حباب
چھپا ہے کسوتِ موج و حباب میں دریا

زمانہ جذبِ رطوبت نہ کر گیا ایسے
کہ جلوہ گر ہو لباسِ شراب میں دریا

اک اشک پر نہ تصرّف رہا ان آنکھوں کا
چلے تھا جن کی ہمیشہ رکاب میں دریا

تو جا کے بحر پہ اے مصحفیؔ نہ رویا کر
کہ تیرے رونے سے ہے اک عذاب میں دریا

۱۱۳

گزر ہو کیونکہ وہاں صبح و شام عاشق کا
ہے مدّعی وہ محلّہ تمام عاشق کا

کچھ آج ہی نہیں عاشق کُشی ہوئی ایجاد
زمانہ تشنۂ خوں ہے مدام عاشق کا

جدا نہیں کسی حالت میں عشق سے عاشق
کہ ساتھ عشق کے ہے التزام عاشق کا

نہ روزِ بد سے گلہ کیجیے کہ دنیا میں
ہمیشہ کوے بلا ہے مقام عاشق کا

کریں ہیں آن کے نت اُس کو نیک و بد مجرا
نہیں قبول سو کیا، اک سلام عاشق کا

صبا نے بھی نہ کہا اُس سے ڈر کے مارے کچھ
گیا بباد ہی آخر پیام عاشق کا

ستم گری کا جنھیں مصحفیؔ سلیقہ ہے
وہ اک نگاہ میں کرتے ہیں کام عاشق کا

۱۱۴

کبھی تو ہنس کے لیا کر تو نام عاشق کا
زباں ہلائے سے نکلے ہے کام عاشق کا

بجز آہ و نالہ نہیں یاد، آہ کچھ دل کو
یہی وظیفہ ہے اب صبح و شام عاشق کا

غرور و ناز ترا جس جگہ کہ ساقی ہو
سفالِ سگ سے بھی بدتر ہے جام عاشق کا

جب اُس نے مکھڑے سے اپنے اٹھا دیا پردہ
رہا کہاں ہے بھلا ننگ و نام عاشق کا

صبا جو اُس کی گلی کی طرف تو جا نکلے
تو ایک ایک سے کہیو سلام عاشق کا

سمجھ کے زلف کو ٹک اپنی کیجیو شانہ
کہ بال بال میں یاں، ہے مقام عاشق کا

ہمیشہ چال پر اپنی پڑے ہے اس کی نگاہ
رقیب ہے وہ بتِ خوش خرام عاشق کا

خدا ہی جانے یہ آئینہ کس کا حیراں ہے!
کہ اس سے نکلے ہے نقشا تمام عاشق کا

تری خرام، تری چال اور تری رفتار
مَلے ہے تلووں تلے دل مُدام عاشق کا

ہمیشہ مصحفی اس کا ہی ذکر کرتا ہے
ہے اب تلک وہی سودائے خام عاشق کا

۱۱۵

تیرے ہاتھوں سے میاں دل مرا بن کر ٹوٹا
حیف صد حیف کہ یہ شیشہ مکرّر ٹوٹا

حال کیا پوچھتے ہو ہم سے تباہی زدوں کا
کشتی طوفانی ہوئی بہ گئی لنگر ٹوٹا

کھل پڑا نامہ مرا اس کے پروں سے یارب
یا ہوا بیچ کوئی بالِ کبوتر ٹوٹا

حیف صد حیف کہ اک پیاسے نے لب تر نہ کیے
بیچ مجلس کے، کشاکش ہی میں ساغر ٹوٹا

جس طرح آہِ شرربار مری گزرے ہے
اس طرح تو کبھی تارا نہ فلک پر ٹوٹا

وہ جو خود بینی کا ساغر تھا مرے ہاتھوں میں
کیا کہوں میں، کہ بڑے زور سے کافر ٹوٹا

آسماں دیتا رہا مجھ کو ہی ہر روز شکست
نہ سنا میں نے کہ دشمن کا مرے سر ٹوٹا

وہی مجروح تو سمجھے گا الم کو میرے
مصحفی زخم میں جس کے دمِ خنجر ٹوٹا

۱۱۶

آج کیا جانے مری کون نظر سے گزرا
ناوکِ آہ جو یکبار جگر سے گزرا

پیچ و تابِ کمر و زلف سے گھبرا کے وہ شوخ
اب یہ کہتا ہے میں اس زلف و کمر سے گزرا

شمع اس چہرۂ پرنور سے کیا رو کش ہو
رتبۂ حسن میں جو شمس و قمر سے گزرا

سینہ سوراخ تو ہے لیک یہ معلوم نہیں
آہ سینے سے، کہ یہ تیر سپر سے گزرا

مند گئیں آنکھیں مری راہ ہی تکتے تکتے
لیک کافر نہ کبھو ہو کے ادھر سے گزرا

ہم تو دیوانے ہیں اُس شخص کے جس نے شبِ ہجر
سر رکھا خشت پہ اور بالشِ سر سے گزرا

ہم بھی اے ابرِ بہاری تجھے دکھلا دیں گے
گر کوئی لختِ جگر دیدۂ تر سے گزرا

مصحفیؔ شمع کی مانند میں اس بزم میں رات
یاں تلک رویا کہ دریا مرے سر سے گزرا

۱۱۷

اس راہ سے جو ہو کر کل تو ذرا نہ گزرا
کیا کیا ہمارے جی میں، اے بے وفا! نہ گزرا

کشتوں کے تیرے جس جا کچھ استخواں پڑے تھے
اُڑتا ہُوا ہوا میں واں سے ہُما نہ گزرا

شب کونسی وہ میں نے باتوں میں سب نہ کاٹی؟
دن کون سا وہ مجھ پر بے ہوہا نہ گزرا

قاصد کا منہ تو دیکھو رکھے وہاں قدم کو
جس کی گلی میں اب تک پائے صبا نہ گزرا

اے مصحفیؔ وہ شب تو تنہا ملا تھا تجھ سے
کم بخت تو ہی چوکا جو جی چلا نہ گزرا

۱۱۸

کیا دخل ہے جا کر ہیں اُس کو میں بھٹکنا
رونا ہی راتوں کو وہی سر کو پٹکنا

تم جتنا چھڑاؤ میں نہ چھوڑوں گا، مری جاں!
ہاتھوں سے مرے فائدہ دامن کو جھٹکنا؟

اے برقِ جہاں سوز! ٹک اک دم تو لیا کر
یہ کس نے سکھایا ہے تجھے اتنا مٹکنا؟

ہیں ایک تو آفت ترے رخسارِ دلآویز
پھر تس پہ قیامت ہے یہ زلفوں کا لٹکنا

جب دیکھوں ہوں گلبن کو تو آتا ہے مجھے یاد
ہر شاخِ دلآویز سے بلبل کا لٹکنا

وقتیکہ پتا یار کا ملتا نہیں، اے دل!
پھر فائدہ کیا رکھتا ہے گلیوں میں بھٹکنا؟

اے مصحفیؔ! اکر شکر کہ تو جی سے بچا ہے
دیوانے کہیں ایسی جگہ پھر نہ اٹکنا

۱۱۹

کی آہ ہم نے لیکن اس نے اِدھر نہ دیکھا
اس آہ میں تو ہم نے کچھ بھی اثر نہ دیکھا

کیا کیا بہاریں آئیں! کیا کیا درخت پھولے!
نخلِ دعا کو لیکن میں بارور نہ دیکھا

ہرگز ہوا نہ یارو! وہ شوخ یار اپنا
زیں بیش ورنہ ہم نے کیا کیا کہ کر نہ دیکھا

رہتے ہیں کیا بھلا واں آفت زدے ہی سارے؟
اُس کوچے میں کسی کا آباد گھر نہ دیکھا

پہنچا گلی تک اُس کی جب تک تو تھا نظر میں
آگے قدم کے رکھتے پھر نامہ بر نہ دیکھا

دو دو پہر تک اُس کے آگے کھڑا رہا میں
پر اس نے ضد کے مارے بھر کر نظر نہ دیکھا

کیا فائدہ رکھے ہے؟ بس اب زیادہ مت رو
رونا ترا کسی نے، اے چشمِ تر! نہ دیکھا

کل یار کی گلی میں ڈھونڈا جو مصحفیؔ کو
اک لاش تو پڑی تھی پر اُس کا سر نہ دیکھا

۱۲۰

اب اوروں سے کی گرم صحبت بھلا
بھلا بے وفا، بے مروّت بھلا!

کبھی یار بھی ہم سے، سمجھیں گے خوب
کرو جتنی چاہو عداوت بھلا

جو برداشت تیری جفا کی کرے
کہاں ہم میں وہ تاب و طاقت بھلا

سنا بس کہیں چپ رہو، شیخ جی!
کہو گے سو کیجیے گا حضرت بھلا؟

اب اس زیست سے مر ہی جانا ہے خوب
کوئی کھینچے کب تک اذیت بھلا؟

کہوں میں تو سو بات، پر اب مجھے — کہاں بات کہنے کی فرصت بھلا

ترے غم سے ہے نزع میں مصحفیؔ

ٹک اک دیکھ جا اس کی صورت بھلا!

۱۲۱

دیر تک اپنے شہیدوں پہ نظر کرنا تھا! — سرسری تم کو نہ مقتل سے گزر کرنا تھا

گر لبِ جام کے شایستہ نہ تھا، اے قاتل! — لبِ خنجر تو مرے خون سے تر کرنا تھا

کیوں خبر یار کے آنے کی میں کی یاروں کو — کیا کیا ہائے! کسی کو نہ خبر کرنا تھا

بچ رہا شب مرے قابو سے وہ، میں ہی چوکا — دونوں ہاتھوں کو مجھے طوقِ کمر کرنا تھا

لے گیا دل کو مرے، یار ہنر سے جس وقت — ہائے کچھ مجھ کو بھی اُس وقت ہنر کرنا تھا

جوں صبا ہر طرف آوارہ پڑا پھرتا ہوں — میری قسمت میں مگر خاک بہ سر کرنا تھا

تیغِ قاتل کو میں کیوں ہاتھ پہ روکا؟ افسوس!

مصحفیؔ میرے تئیں سینہ سپر کرنا تھا

۱۲۲

اک برق کا سا جھمکا اُس مہ لقا سے دیکھا — میں کیا کہوں کہ اُس کو کل کس ادا سے دیکھا

کاہے کو اس قدر تھے سفاک ہاتھ سادے، — عالم کا خون ہوتا رنگِ حنا سے دیکھا

یوں تو رہا ہمیشہ وہ میرے روبرو ہی — پر روئے دل نہ ہرگز اس بےوفا سے دیکھا

یا داغ یا کہ مرہم یا سوز یا کہ ماتم — جو کچھ کہ ہم نے دیکھا اُس مہ لقا سے دیکھا

یہ جانتے نہیں ہم، اس میں بدن ہے کیا ہے؟ — شعلہ سا اک جھمکتا زیرِ قبا سے دیکھا

کب ہم سے راستی پر آیا یہ چرخِ کج رو؟ — ہم نے تو نت ستم ہی اس فتنہ زا سے دیکھا

ہم گبرو، ہم مسلماں، ہم جمع، ہم پریشاں — اک سلسلہ بندھا اس زلفِ دوتا سے دیکھا

تاروں کی آنکھیں اس سے کیونکر لڑیں الٰہی! — سوئے فلک نہ ہرگز جس نے حیا سے دیکھا

اے مصحفیؔ ہمیں تو کچھ درد ہی میں ہے چین
یعنی ضرر ہی ہم نے اکثر دوا سے دیکھا

۱۲۳

کل اُس کو باتیں کرتے اک آشنا سے دیکھا — پر وہ بھی دیکھنا تھا ہم نے دغا سے، دیکھا
غرفے سے کل میں اپنی آنکھیں ملا دیاں تھیں — اُس نے بھی کیا کہوں میں کس کس ادا سے دیکھا!
فردوس میں بھی شاید اپنے نصیب ہووے — جو لطف اس چمن کی آب و ہوا سے دیکھا
صحبت رہی یہ اس سے اپنی، کہ مل گئے جب — اس نے جھکا دیں آنکھیں میں نے حیا سے دیکھا
پاکیزگی کا عالم اُس کی میں کیا بتاؤں — کانوں میں اُس کے موتی کل جس صفا سے دیکھا
غیرت سے باغباں کی پتھر پڑیں کہ ہم نے — سو بار گل کو ہنستے بادِ صبا سے دیکھا

اے مصحفیؔ بتوں میں ہوتی ہے یہ کرامت
دل پھر گیا نہ تیرا آخر خدا سے، دیکھا!

۱۲۴

یا تو بے طرح پھر اس شوخ پسر کا نکلا — شام گھر آنے لگا اب وہ سحر کا نکلا
کر گئی سنتے ہی جان اپنی تو دنیا سے سفر — مُنہ سے اس بت کے جو نہیں نام سفر کا نکلا
گرچہ محتاج تو غازے کا نہ تھا، پر جو ملا — اور ہی حسن کچھ اُس رشکِ قمر کا نکلا
خار خار اپنے تئیں عشق کا ہے ویسا ہی — مر گئے تو بھی تو کانٹا نہ جگر کا نکلا
دید بازی سے مری کچھ اسے نقصاں نہ ہوا — دن بدن اور ہی رنگ اُس گلِ تر کا نکلا
نیشکر اُس لبِ شیریں سے ہو کیونکر روکش — جس کے آگے نہ کبھی نرخ شکر کا نکلا
گرچہ بلدار ہی پٹکوں سے رہی نت بندھتی — تو بھی زنہار نہ بل اُس کی کمر کا نکلا
آتشِ غم میں دل و جان و جگر سب ہی جلا — کچھ بھی اسباب غرض ہم سے نہ گھر کا نکلا
لال ڈوروں کو تری آنکھوں کے دکھلا دیں گے — اب کے ناخن میں اگر تار جگر کا نکلا

مصحفی شام گھر آیا تو اچنبھا کیا ہے
اب بھی کیا آ، نہ پھرے آٹھ پہر کا نکلا

۱۲۵

عاشق ہوں مجھ کو ڈر نہیں روزِ وفات کا
اور بیش و کم جو ہے بھی تو ہجران کی رات کا

اللہ رے تیرے سلسلۂ زلف کی کشش
جاتا ہے جی اُدھر ہی کھنچا کائنات کا

بوسہ جو میں نے مانگا تو کہنے لگا کہ 'واہ
جاؤ جی آشنا نہیں میں ایسی بات کا'

یک لختِ دل ہماری بھی جانب سے اے صبا
آخر تو لے چلی ہے تو خط پات پات کا

نامحرموں کے آگے نہ آیا کرو، میاں!
پاجامہ اس پھبن سے پہن محرمات کا

سو رخنے ہو ہے پردۂ ناموسِ مصحفی
جب مجھ کو یاد آئے ہے چاک اس قنات کا

۱۲۶

مجھ کو زلفوں سے تری پیار وہی ہے جو تھا
اب تلک تو یہ گرفتار وہی ہے جو تھا

دن بدن رنگ کو میں اپنے ہی پاتا ہوں تغیر
ورنہ اس کا گلِ رخسار وہی ہے جو تھا

تنگ چشمی سے تری کیونکہ نہ فریاد کروں؟
اب تلک رخنۂ دیوار وہی ہے۔ جو تھا

آج کیا بھول گئے مجھ کو؟ ادھر تو دیکھو!
جان میری، یہ گنہگار وہی ہے جو تھا

اور تو پئیے بھی کچھ کھا کے غذائیں کم و بیش
پر تری چشم کا بیمار وہی ہے۔ جو تھا

ہاں کسی اور کو رُو اس نے دیا ہووے گا
ہم سے تو وعدۂ دیدار وہی ہے جو تھا

اس میں تو کچھ بھی ترے ہجر میں باقی نہ رہا
دیکھ تو تو یہ دلِ زار وہی ہے جو تھا

اب تو کچھ پھیکا سا مجھ کو یہ نظر آتا ہے
مصحفی دیکھ تو تو یار وہی ہے جو تھا؟

١٢٧

صورت کو تیری دیکھ کے مانی رو دیا — یاں تک کہ خوں میں اپنا مرقّع ڈبو دیا
ہرگز رہے نہ ہم تو کسی کام کے دریغ — سب کام سے ہمیں تری الفت نے کھو دیا
کیا دشمنی تھی مجھ سے؟ کہ یوں روزگار نے — میرے ہی نام کو تری خاطر سے دھو دیا
اس اشکِ خوں سے مجھ کو یہی بحث ہے، کہ ہائے! — سلکِ گہر میں لعل کو کیوں پرو دیا؟
اودھر گیا تو غسل کو حمام کی طرف — یاں اشکِ گرم نے مرے دریا سمو دیا
اُگنے کی کچھ خبر نہیں پر دشت دشت میں — میں دانہ ہائے اشک سے اک کھیت بو دیا

گالی تلک بھی اُس سے نہ مُنہ پھیر مصحفی
ہے مفت وہ کریم نے سائل کو جو دیا

١٢٨

معالج ہو سکے اب کیا کوئی غمخوار، رونے کا؟ — کہ ان آنکھوں کو اک مدّت سے ہے آزار، رونے کا
میں آنسو پونچھتا ہوں اس کی مجلس میں بہت اپنے — ولے چھپتا ہے کوئی دیدہ و رخسار، رونے کا؟
نصیحت کام کیا آتی ہے مردم کی؟ خدا حافظ! — مزہ تم کو پڑا اے دیدۂ خونبار، رونے کا
مجھے روتا سنا لیکن نہ اتنا بھی کہا اس نے — کہ ہے یہ شور سا کیسا پسِ دیوار رونے کا؟
خدا جانے! کہ رشتہ بند ہے کس موجِ دریا سے؟ — جو ان آنکھوں میں اب تک بندھ رہا ہے تار رونے کا
سرشک آنکھوں سے ہیں بہتے، پہ تو بھی ان کے ساتھ اے دل! — چلا چاہے تو چل، ہے قافلہ تیار رونے کا

ہنسی آتی ہے تیری بات پر اے مصحفی مجھ کو
نہ کر تو ذکر میرے روبرو ہر بار رونے کا

١٢٩

ازل کے روز سے سررشتہ گم تھا، زار رونے کا — ان آنکھوں ہی نے آخر کو نکالا تار رونے کا
خدا جانے یہ آنسو کیوں بہے جاتے ہیں آنکھوں سے — نہیں معلوم ہوتا کچھ ہمیں اسرار رونے کا

مرے نالے کو سن کر کوئی صاحب دل ہی رووے گا | بنایا سنگدل جس کو، نہیں زنہار رونے کا
میں سو سو بار دن میں، ہم نشیں! کاہے کو پھر روؤں؛ | نکل جاوے بخار اس دل سے گر اک بار رونے کا
بھلا اے دوستاں منہ بند کر وہ کس طرح رووے؟ | طفولیت سے خوگر ہو جو دھاڑھیں مار رونے کا
گہے اشک اور گاہے خونِ دل آنکھوں سے ٹپکے ہے | نہایت گرم ہے کچھ ان دنوں بازار رونے کا

کسی دن مصحفی گزرے ہے جو کچھ تجھ پہ کہہ اُس سے
بھلا کیا فایدہ پیشِ در و دیوار رونے کا؟

۱۳۰

ترے کوُ سے مر کر یہ بے جان نکلا | بھلا تیرے جی کا تو ارمان نکلا
میں اس آن کے کیوں نہ ہو جاؤں صدقے | کہ ٹک یاد کرتے ہی تو آن نکلا
کما چی بجانی گئے بھول مطرب | وہ زاہد پسر جب بھوپی تان نکلا
زمینِ چمن کس کا مدفن ہے یارب | جو گُل چاک کر کے گریبان نکلا
وہ کافر جب آیا تک اک امتحاں پر | نہ مسجد سے کوئی مسلمان نکلا
جسے رات پکڑا تھا عاشق سمجھ کر | بڑی خیر گزری وہ دربان نکلا
غرض صلح کے وقت سینے سے میرے | دلِ خوں چکاں تھا جو پیکان نکلا
یہ مشتِ غبار اپنا آخر کو، ہیہات! | ترے کوُ سے ہو کر پریشان نکلا
میں سمجھا تھا کوئی قطرہ ہووے گا ان میں | جو دیکھا تو آنکھوں سے طوفان نکلا
جہاں شیخ جی روز کرتے تھے سجدہ | وہاں شیخ سدّو کا اک تھان نکلا

ہوئے مصحفی خون کتنوں کے دم میں
وہ جب اپنے گھر سے چبا پان نکلا

۱۳۱

اس دل میں تیرے ملنے کا ارمان رہ گیا | یہ دل تڑپ تڑپ کے مری جان رہ گیا

سمجھے وہ مرغِ خستہ مرے اضطراب کو
سینے میں جس کے ٹوٹ کے پیکان رہ گیا

تھا نزع میں کہ ذبح کیا مجھ کو یار نے
گردن پہ میری اس کا یہ احسان رہ گیا

دیکھا ہزار بار تجھے ہم نے ہر کہیں
اے جانِ من! تو اب تلک انجان رہ گیا،

پھر بھی ہمیشہ اس کو وہی آرزو رہی
پیارے جو ایک شب ترے مہمان رہ گیا

مل قافلے میں صاحبِ حشمت چلے گئے
ہم سا ہوا جو بے سروساماں رہ گیا

آیا جو اس جہاں میں سو برباد ہی گیا
نے جامِ جم نہ تختِ سلیمان رہ گیا

نازاں تھا اپنے حسن و صفائی پہ آئنہ
صورت کو تیری دیکھ کے حیران رہ گیا

آیا بکار بخیۂ زخم، اپنے ہاتھ سے
ثابت جو کوئی تارِ گریبان رہ گیا

دنیا سے ہم چلے گئے ناچار مصحفیؔ
اک یادگار اپنا یہ دیوان رہ گیا

۱۳۲

کل میں جو راہ میں اسے پہچان رہ گیا
کچھ وہ بھی مجھ کو دیکھ کے حیران، رہ گیا

شہرِ عدم کو قافلے لاکھوں گئے، دلے
چل چل کے نت میں بے سروسامانؔ رہ گیا

شوخی تو دیکھ تیر کو سینے سے کھینچ کر
کہتا ہے میرے تیر کا پیکان رہ گیا'

دیکھ اس کی تنگ پوشی کو، خجلت سے باغ میں
ہر ایک غنچہ سر بگریبان رہ گیا

مارے خوشی کے کود پڑا میں تو مصحفیؔ
شب پاس میرے اُس کا جو دوالمیان رہ گیا

۱۳۳

جس کشتے کا زخموں میں ہو چور بدن سارا
خوں میں نہ بھرے کیونکر پھر اس کا کفن سارا؟

یوں اُس کی صفِ مژگاں بھاتے ہی دکھاتی ہیں
چڑھ آیا ہے عاشق پر گویا کہ دکن سارا

زلفِ ہمہ مشک اُس کی خوشبوئی میں کیا کم ہے
جس زلف کے حلقوں میں بستا ہے ختن سارا

گر شمع کے رونے میں ہے ایسی ہی رنگینی
بھر جائے گا لوہو سے تا صبح لگن سارا

اس گل کا پتا واں بھی ہرگز نہ ملا مجھ کو
جوں بادِ صبا ڈھونڈا ہر چند چمن سارا

اے مصحفی! تو واں سے کیوں روٹھ کے اٹھ آیا؟
دیوانے تری خاطر کڑھتا ہے وطن سارا

۱۳۴

آپ بھی دمِ شمشیر ہے یاں ہم پہ دم اپنا
کس واسطے کرتا ہے تو تیغا علم اپنا

درگزرے ہم ان باتوں سے، یہ ہم پہ غضب ہے
پاس اپنے ہی تم رہنے دو لطف و کرم اپنا

چوکیں نہ زباں آوری سے، پیچھے زباں کے
کٹ جاوے اگر سر بھی بہ رنگِ قلم اپنا

شوریدگی ہوتی ہے فزوں جلوے کے مقدار
رخ اب سے دکھایا کرو تم ہم کو کم اپنا

اس شکل سے کعبے کو نہ جا ورنہ مری جاں
سر پیٹ نکل جاویں گے اہلِ حرم اپنا

جو حرف کہ گرتا ہے جواہر کی رقم ہے
ہم نام رکھیں کیوں نہ جواہر رقم اپنا

سر کاٹ کے یوں چاہے کوئی پھینک دے لیکن
اس کوے سے نہیں بڑھنے کا آگے قدم اپنا

جو ہے سو گرفتار ہے یاں تازہ الم میں
لے جاویں سو کس پاس، کہو تم، الم اپنا

نے جینے کی شادی ہے، نہ کچھ مرنے کا غم ہے
عاشق کو برابر ہے وجود و عدم اپنا

اے مصحفی مدّت سے غمِ عشقِ بتاں میں
مشغول ہیں اتنے کہ نہیں ہم کو غم اپنا

۱۳۵

شمع پر پروانہ شب، جس وقت جل کر رہ گیا
دیکھ کر اُس کو میں اپنے ہاتھ مل کر رہ گیا

کیا کہوں برگشتگی اپنے نصیبوں کی میں ہائے
کل کٹارا اس کی کمر سے کچھ اگل کر رہ گیا

آتشِ سوزاں پہ میں نے رکھ دیا تھا دل کو رات
جوں سپند آخر کو وہ کود اور اچھل کر رہ گیا

کھینچ کر تلوار جوں میرے وہ آیا سامنے
میں ستم نادیدہ اس ساعت دہل کر رہ گیا

دورسے بوسے کی خاطر جوں ہی میرے لب ملے، دیکھ کر میری طرف تیوری بدل کر رہ گیا
میں یہ جانا تھا ہے گا موجِ آبِ اشک ہو دل مرے سینے میں ہی، ہے ہے پگھل کر رہ گیا!
کاش میں اس کو نظر آیا نہ ہوتا مصحفیؔ
گھر سے باہر آج وہ کافر نکل کر رہ گیا

۱۳۶

وائے! وہ زخمی کہ سنبھلا اور سنبھل کر رہ گیا مرغِ بسمل کی طرح دو گام چل کر رہ گیا
کل اسے میں لے چلا تھا سیرِ گلشن کی طرف کچھ سمجھ کر ساتھ سے میرے وہ ٹل کر رہ گیا
میں نے چاہا تھا لے آؤں اُس کو ساتھ اپنے، وہ شوخ گھر کے دروازے ہی پر آخر مچل کر رہ گیا
عشق کا شعلہ گیا جو دل کے دامن کو لپٹ محوِ آتش ہو کے وہ ناچار جل کر رہ گیا
جس جگہ ڈوبا تھا کل دریا کے اندر مصحفیؔ
اس جگہ کہتے ہیں پانی سا اچھل کر رہ گیا

۱۳۷

قدم اِس دھج سے کچھ پڑتا ہے اُس غارت گرِ جاں کا کہ دل ہر اک قدم پر لوٹ ہے گبر و مسلماں کا
اس آبِ اشک میں یوں لختِ دل بہتے نظر آئے کہ جیسے وقتِ شب دریا میں عالم ہو چراغاں کا
وہ تیرے آستانے پر قدم اپنا رکھے، ہے ہے! سر اپنا پیٹ لیتا ہوں یہ رتبہ دیکھ درباں کا
اگر اب کے بہار آئی تو ہم ان جامہ زیبوں کو دکھا دیں گے تماشا دھجیاں کر کے گریباں کا
نوائے بلبلانِ قدس کا میں سننے والا ہوں خوش آتا ہے مجھے کب زمزمہ مرغِ گلستاں کا
اگر کچھ زلف کا مذکور اس کے درمیان آیا فسانہ طول کھینچے گا بہت شبہائے ہجراں کا
نہ ہم مرہم سے واقف اور نہ ہم پھاہے کو کچھ سمجھیں ہمارے زخم پر احسان ہے تیرے نمکداں کا
اگر انداز رونے کا یہی ہے، جیسے فوّارہ تو سر کھینچے گا اک دن ماجرا اس چشمِ گریاں کا
مرا دریائے اشک اس زور سے بہتا ہے ان روزوں کہ چلتا ہے جلو میں جس کے اکثر شور طوفاں کا

جو یہ دنبالہ داری ہے تو اک دن سر پہ مردم کے
بلا لاوے گا پیارے سرمہ تیری چشمِ فتّاں کا

کیا زندانیوں کو حکمِ قتل اس واسطے اُس نے
کہ راتوں کو اُسے ناخوش رکھے تھا شورِ زنداں کا

جنھوں کی چشمِ دل روشن ہیں وہ اس کو سمجھتے ہیں
کہ ہر ذرّے میں جلوہ ہے اسی خورشیدِ تاباں کا

جسے منظور ہو اس لب کا بوسہ کیوں ذقن چومے
کنویں پر بھی کہیں جاتا ہے پیاسا آبِ حیواں کا

غزل اک اس زمیں میں اور بھی اے مصحفی کہہ جا
کہ ہے شور آسماں پر تیری طبعِ برق جولاں کا

۱۳۸

خدا جانے یہ دل کشتہ ہے کس اندازِ داماں کا
کہ ہے چاکِ کفن کی شکل چاک اس کے گریباں کا

کوئی یاں مجھ سے پوچھے حضرتِ مجنوں کی تربت کو
کہ میں آوارہ اک مدّت سے زائر ہوں بیاباں کا

شبِ مہتاب میں کیا کیا سمیں ہم کو دکھاتا ہے
بکھرنا چاند سے مکھڑے پہ اُس زلفِ پریشاں کا

کٹاری مار کے میں اپنے مر جاؤں گا، کیا حاصل؟
نہ لینا نام میرے روبرو تم اس کی مژگاں کا

شفق میں جس طرح جھمکیں ستارے، جلوہ دیتا ہے
جو سُرخی میں لبوں کی دیکھیے عکس اس کے دنداں کا

کہے ہے تو جو بھائی عشق! مجھ کو رہ بیاباں میں،
بیاباں میں لگے ہے دل بھلا کس خانہ ویراں کا؟

ہمارے دل پہ یار اب تیر بے پیکاں لگاتا ہے
کہ پر دشوار ہوتا ہے نکلنا دل سے پیکاں کا

بہار آئی، خدا جانے کہ کیا گزری اسیروں پر
نہیں معلوم کچھ اب کے برس احوال زنداں کا

بھلا اے چشمِ گریاں! تجھ سے ہم یہ چشم رکھتے تھے،
ہمارے زخم پر کیوں تو نے مُنہ کھولا نمکداں کا

تبھی ہم تم پہ گل کھائے پھریں تھے، او میاں لڑکے!
سبق تم جن دِنوں مکتب میں پڑھتے تھے گلستاں کا

کیا ہے تیغِ بے جوہر کو جوہر دار قاتل نے
خمِ ابرو پہ یہ عالم نظر آتا ہے افشاں کا

بگولے سے ہماری خاک کے ہوتا ہے یہ روشن
مگر کچھ سر پھرا ہے ان دنوں گردونِ گرداں کا

گلے سے لگ گیا میں دوڑ کر اس سروِ مائل کے
کہ اک انداز تھا اس میں مرے سروِ خراماں کا

تبسّم سا کرے ہے کچھ لبِ زخمِ جگر میرا
مگر پھر آج اُس کا کوئی ڈھیلا ہو گیا ٹانکا

تجھے اے مصحفی کب ہے خبر دردِ محبت کی؟
نہ لے تو میرے آگے نام، اے بے درد! درماں کا

١٣٩

ان آہوں سے حجاب اس آسماں کا اٹھ نہیں سکتا
غضب یہ ہے کہ پردہ درمیاں کا اٹھ نہیں سکتا

ہوا ہوں ناتواں اتنا میں غم میں اس کی ابرو کے
کہ میرے ہاتھ سے قبضہ کماں کا اٹھ نہیں سکتا

ہم اس گلشن سے اک دن آشیاں اپنا اٹھا دیں گے
کہ اب ہم سے دماغ اس باغباں کا اٹھ نہیں سکتا

عجب یہ ہے کہ بعد از مرگ میرے، میرے یاروں سے
جنازہ مجھ سے مشتِ استخواں کا اٹھ نہیں سکتا

وہاں مارے گئے ہیں ہم، کسی کی تیغِ ابرو سے
بروزِ حشر بھی، مارا جہاں کا اٹھ نہیں سکتا

جسے لغزش ہو میخانے کے در پر، پھر وہ کیا سنبھلے
کہ کہتے ہیں گرا اس آستاں کا اٹھ نہیں سکتا

یہ کس کی تیغ سے سیراب ہو کر ایسے سوئے ہیں؟
جو سر بالیں سے ان آسودگاں کا اٹھ نہیں سکتا

نہ باندھ اب آشیاں اپنا تو شاخِ گل پر، اے بلبل!
کہ اس سے بوجھ تیرے آشیاں کا اٹھ نہیں سکتا

حکایت زلف کی تیری، عجب پر پیچ لکھی ہے
کسی سے ایک حرف اس داستاں کا اٹھ نہیں سکتا

غرور اور ناز تم جو کچھ کرو ہم کو قبول، اے جاں!
یہ نکتوڑا تمھارے پاسباں کا اٹھ نہیں سکتا

نہ اسبابِ تعلق سے دل اپنا باندھ، کہتے ہیں
کہ "اٹھتے وقت اسباب اس جہاں کا اٹھ نہیں سکتا"

ہوا ہوں ناتواں اتنا کہ میرا نام اگر لکھیں
تو پھر صفحے سے نام اِس ناتواں کا اٹھ نہیں سکتا

مزاج اپنا زبس نازک بڑا ہے مصحفیؔ ہم سے
غرور اور ناز اُس رعنا جواں کا اٹھ نہیں سکتا

١٤٠

یہ خیال اک دن اسی صورت، فزوں ہو جائے گا
رفتہ رفتہ، مجھ کو سوجھے ہے جنوں ہو جائے گا

اس قدر بھی کوچہ گردی مت کر، اے دل! باز آ
دیکھ، میں کہتا ہوں تو رسوا کہوں ہو جائے گا

خدمتِ پیرِ مغاں سے مُنہ نہ موڑ، اک جام میں
صاف جوں آئینہ بیرون و دروں ہو جائے گا

ان حنائی ہاتھوں کو پردے میں رکھ بہرِ خدا
مفت میں ظالم، کسی کا ورنہ خوں ہو جائے گا

تابشِ خورشید میں تو گھر سے باہر مت نکل
پھول سا رخسارہ تیرا لالہ گوں ہو جائے گا

گرد بادِ آہ آیا گر کبھی چکر کے بیچ
خیمۂ افلاک دیکھو گے نگوں ہو جائے گا

کب یقیں تھا ہم کو لے پیارے کہ ہنگامِ عتاب — لب کا ہلنا بھی ترے، ہم پر فسوں ہو جائے گا

گو کہ اب پاتے نہیں ہم اُس کا کوچہ مصحفی
شوق اگر یہ ہے تو اک دن رہنموں ہو جائے گا

۱۴۱

ساقی شراب لایا، مطرب رباب لایا — مجھ پر تو اک قیامت عہدِ شباب لایا
دل دردِ غم کی اُس کے آخر نہ تاب لایا — یہ ہر گھڑی کا رونا اور اک عذاب لایا
کیا دُور ہے جو پردہ رخ سے ترے اٹھا دے — عرصے میں مہر دمہ کو جو بے نقاب لایا
کہتا نہ تھا میں، اے دل! مت جا تو اُس گلی میں — آخر تو مجھ پر آفت خانہ خراب لایا
میں سر کو اپنے رکھ کر زانو پہ خوب رویا — نامے کا میرے قاصد جس دم جواب لایا
نامے کے میرے پرزے لا ڈالے میرے آگے — نامے کا میرے قاصد اچھا جواب لایا
اے عاشقو! مبارک ہو تم کو عیدِ قرباں — پھر تیغ کو اپنے دے کر وہ آب لایا
دورِ فلک سے ہرگز شاکی نہیں میں اب تک — گردش میں گو کہ مجھ کو جوں آفتاب لایا
آئینہ کیا کہ ہم نے پتھر پہ گر نظر کی — چہرے پر اپنے وہ بھی اک آب و تاب لایا

اے مصحفی تو اب مُنہ کیا دیکھتا ہے، پی بھی
ہو یار آپ ساقی جامِ شراب لایا

۱۴۲

جی رات لبوں پہ آ رہا تھا — مرنے میں ہمارے کیا رہا تھا
بارے ترے عہد میں وہ نکلا — خورشید بہت چھپا رہا تھا
کیا جانے کہ دل کا کیا ہوا حال؟ — کوچے میں ترے وہ جا رہا تھا
تھے جن دنوں ہم کسی کے عاشق — سودا ہمیں سا لہا رہا تھا
کیا وقت تھا وہ بھی جب کہ ہم تم — مے پیتے تھے ابر چھا رہا تھا

واں چغد کا آشیانہ ہے اب — اک عمر جہاں ہما رہا تھا

میں نے شبِ وصل اُسے نہ چھوڑا — ہر چند کہ وہ کھنچا رہا تھا

آنکھوں نے تری بہت چھکایا — اک عمر میں پارسا رہا تھا

میں سینے سے دل نکال ڈالا — یہ مجھ کو بہت ستا رہا تھا

مارا گیا دل گلی میں تیری — اپنا یہی آشنا رہا تھا

میں تاب نہ لا سکا، وہ مجھ سے — آنکھیں تو بہت ملا رہا تھا

شاید کہ شبِ گزشتہ اس کا — ق — معشوق اس سے جدا رہا تھا

میں صبح جو مصحفیؔ کو دیکھا
آنکھوں سے ندی بہا رہا تھا

۱۴۳

آساں نہیں ہے تنہا در اُس کا باز کرنا — لازم ہے پاسباں سے اب ہم کو ساز کرنا

گر ہم مشیر ہوتے اللہ کے تو کہتے — یعنی، وصال کی شب یارب دراز کرنا

اس کا سلام مجھ سے اب کیا ہے، گردشِ رو — طفلی میں میں سکھایا جس کو نماز کرنا

ازبس کہ خونِ دل کا، کھاتا ہے جوش ہر دم — مشکل ہوا ہے ہم کو اخفائے راز کرنا

بایک نیاز اس سے کیونکر کوئی بر آوے — آتا ہو سو طرح سے جس کو کہ ناز کرنا

کرتے ہیں چوٹ آخر یہ آہوانِ بدمست — آنکھوں سے اس کی، اے دل! ٹک احتراز کرنا

اے آہ! اس کے دل میں تاثیر ہو تو جانوں — ہے ورنہ کام کتنا پتھر گداز کرنا

ہووے گی صبحِ روشن اک دم میں وصل کی شب — بندِ قبا کو اپنے، ظالم! نہ باز کرنا

اے مصحفیؔ ہیں دو چیز اب یادگارِ دوراں
اس سے تو ناز کرنا، مجھ سے نیاز کرنا

۱۴۴

یہ چہرۂ بلدار نہ دیکھا تھا سو دیکھا — بانکوں میں طرحدار نہ دیکھا تھا سو دیکھا

دل لے کے مرا کر گیا انکار بدیہی — اس طرح کا عیّار نہ دیکھا تھا سو دیکھا

بن دیکھے ترے، رہنے لگیں خون میں ڈوبی — آنکھوں نے یہ آزار نہ دیکھا تھا سو دیکھا

مت پوچھ حقیقت شبِ ہجراں میں یہ اپنی — جو ہم نے کبھی یار نہ دیکھا تھا سو دیکھا

پامالِ حسد جس نے کیا برگِ گلِ تر — اس رنگ کا رخسار نہ دیکھا تھا سو دیکھا

زخموں سے تری تیغ کے میں، اے مرے قاتل! — ہر عضو کو گلزار نہ دیکھا تھا سو دیکھا

جاوے تو صبا کہیو "جدائی میں تمھاری — مرغانِ گرفتار! نہ دیکھا تھا سو دیکھا"

اک جنبشِ مژگاں میں تری، ہم نے مری جاں! — جو حادثہ زنہار نہ دیکھا تھا سو دیکھا

شب مصحفی مارا گیا جا بزمِ بتاں میں
خوں ریزوں کا دربار نہ دیکھا تھا سو دیکھا

۱۴۵

قاصد کبھی ہمارا دلدار تک نہ پہنچا — اُلٹا ہی نت پھر آیا، خط یار تک نہ پہنچا

ہم اک طرف، کہ ہے ہے! اس نو بہار میں تو — اک پر بھی اپنا اڑ کر گلزار تک نہ پہنچا

تیرِ مژہ سے اس کے دل بندھ کے رہ گیا حیف — ابروے راست خم کی تلوار تک نہ پہنچا

آنکھوں سے اشک ڈھل کر مژگاں تلک تو آیا — مژگاں سے پر ڈھلک کر رخسار تک نہ پہنچا

اس سر میں بھی تو آخر رکھتا تھا شور منصور — حیراں ہوں میں کہ یہ سر، کیوں دار تک نہ پہنچا

لختِ جگر میں اپنے کر جمع، گل بنایا — سو وہ بھی گل، بتاں کی دستار تک نہ پہنچا

طفلِ سرشک میرا یوسف سے کم نہ تھا کچھ — پر حیف مصر کے یہ بازار تک نہ پہنچا

چاہا تھا رات میں نے، گھر اس کے کود جاؤں — یہ دستِ کوتہ اپنا دیوار تک نہ پہنچا

دل مرغِ ناتواں تھا بعد از رہا ہوئے بھی — اُڑ کر درِ قفس سے دیوار تک نہ پہنچا

روزِ اجل بہ سختی، دی جان مصحفی نے
یٰسین خواں کوئی اُس بیمار تک نہ پہنچا

۱۴۶

کریں گے خواب راحت یا بھی جنجال ہووے گا
خدا جانے کہ بعد از مرگ کیا احوال ہووے گا

اگر اس شمع کے شعلے میں یہ کچھ جگمگاہٹ ہے
تو ہر پروانہ اس کا مرغِ زرّیں بال ہووے گا

قدم اس دھج سے مت رکھا کرو وقتِ خرامیدن
اگر تم یوں چلو گے اک جہاں پامال ہووے گا

پس از مردن ہمارا داغِ دل ضایع نہ جاوے گا
کسی لالے کے رخسارے کا یہ بھی خال ہووے گا

ترے ملنے سے پیارے اور بیتابی ہوئی دونی
غلط سمجھے تھے ہم اس دل کو استقلال ہووے گا

میں جس دم دیکھوں ہوں اپنی طرف ہنس کر یہ کہتا ہوں
"کوئی مجھ سا بھی دنیا میں پریشاں حال ہووے گا!"

لگا جوں ہی میرے پہلو پر اک جھنکار سی نکلی
کٹار اُس خونیِ بے رحم کا اک ڈھال ہووے گا

ہماری اشک ریزی کا تماشا دیکھیو اس دم
ہمارے ہاتھ میں جب نامۂ اعمال ہووے گا

غلط ہے مصحفی مجلس میں اس کی شعر پڑھتا تھا
کسی گوشے میں بیٹھا با زبانِ لال ہووے گا

۱۴۷

ہجراں میں بسکہ مجھ پہ عذابِ الیم تھا
ہر شعلہ آہ کا مری ، نارِ جحیم تھا

کرتے تھے گل مزار سے میرے شگفتگی
یعنی کبھی ادھر بھی گزارِ نسیم تھا

میں بیکسی پر اپنی جو روتا تھا روزِ ہجر
ہر قطرہ اشک کا مرے درِّ یتیم تھا

افشائے عشق بعد خدا جانے کیا بنے
جب تک حجاب تھا یہی امید و بیم تھا

کرتا تھا کون شب ترے کوچے میں آہ آہ
شعلہ بلند تا سرِ عرشِ عظیم تھا

کس زلفِ مشکفام کی بو تھی جو باغ میں
ہر ایک غنچہ نافۂ عنبر شمیم تھا

پردوں میں چشم کے تھی مری ہیئتِ فلک
یاں تک کہ تارِ اشک خطِ مستقیم تھا

چلتی تھی تیغ واں سرِ دشمن پہ مصحفی
اور میرا ماوے رشک کے یاں دل دو نیم تھا

۱۴۸

نام مت لے تو گھر کے جانے کا
فائدہ کیا مرے کڑھانے کا؟

رگِ گل سا چبھے ہے جی میں مرے
خارِ بلبل کے آشیانے کا

آئینہ پاس رکھ، جو تیرے تئیں
شوق ہے انکھڑیاں لڑانے کا

جو ملا، اُس نے بے وفائی کی
کچھ بھروسا نہیں زمانے کا

تیرے نازک لبوں سے سیکھا ہے
غنچہ، انداز مسکرانے کا

یار کیسا شتاب جاتا ہے
کشتہ ہوں ان قدم اٹھانے کا

تیغ ابرو کو اُس کی رکھ تو عزیز
مصحفیؔ ہے یہ پھل ٹھکانے کا

۱۴۹

اٹھائے زخم اتنے کس نے، میرا سا جگر کس کا؟
ہوا یوں معرکے میں عشق کے سینہ سپر کس کا؟

اِدھر تو دیکھ! دیکھے ہے ترے مُنہ کو کھڑا عالم
تو مُنہ دیکھے ہے آئینے میں اے رشکِ قمر کس کا؟

صدائے الفراق آوازِ آبِ جو سے آتی ہے
خدا جانے، سحر گلشن سے تھا عزمِ سفر کس کا؟

سر اپنا پیٹتا پھرتا ہوں مدّت سے میں گلیوں میں
کوئی جو مجھ کو کہتا ہو کہ ہے یہ نوحہ گر کس کا؟

کسی کی جب نظر ترچھی پڑے ہے، آہ کرتا ہوں
کھبا ہے دل میں میرے آہ اندازِ نظر کس کا؟

گریبانِ سحر کو چاک دیکھا میں نے، کیا جانے
گریباں کھل گیا تھا نیند سے اٹھتے سحر کس کا؟

خدا کے واسطے کافر کی ٹک رفتار کو دیکھو
قدم پڑتا ہے وقتِ جلوہ اس انداز پر کس کا؟

ہلالِ عید میں اک صورتِ آغوش نکلے ہے
نظر تو کیجیو یارو! یہ ہے طوقِ کمر کس کا

چلا ہے سیکڑوں خط لے کے، ظالم مجھ سے سچ کہیو
بھلا دے گا تو اس کو پہلے خط اے نامہ بر کس کا؟

ہزاروں آرزو کے کشتہ میرے دل میں پنہاں تھیں
خدا جانے یہ خوں تم سے بہا، اے چشمِ تر! کس کا؟

بھلا ہم بھی تو دیکھیں کون وہ دلخواہ ہے تیرا؟
کیا کرتا ہے اے دل! ذکر تو شام و سحر کس کا؟

تمھیں میاں مصحفیؔ کیا ہو گیا ہے بیٹھے راتوں کو
یہ قصّہ تم کہا کرتے ہو اب دو دو پہر کس کا؟

۱۵۰

پاؤں گر رکھ نہیں سکتا ہے تو در پر، اپنا
منہ تو غرفے سے دکھادے کبھو چھپ کر اپنا

جب نہ تب اس سے ہی ہم کرنے لگیں ہیں پنجہ
زور چلتا ہے گریباں ہی پر اکثر اپنا

مفت میں خون مرا ہوگا ترا دامن گیر
پونچھیو گوشۂ دامن سے نہ خنجر اپنا

ہم کو کیا کام ہے عالم کے بد و نیک سے یار!
ہیں تو عالم میں پہ ہے عالمِ دیگر اپنا

سرخیِ رنگِ حنا یہ ہے تو ان ہاتھوں سے
خون ہووے گا کسی روز مقرر اپنا

زیورِ حسن ترا دیکھ کے اے رشکِ بہار!
گل نے برباد دیا سب زر و زیور اپنا

کوئی اس میکدے میں ہم کو نہیں دیتا مے
ہر طرف خالی لیے پھرتے ہیں ساغر اپنا

سانس سینے سے کچھ اوپر کو چڑھی آتی ہے
آن پہنچا ہے مگر وقت برابر اپنا

مصحفی ایک غزل اور بھی لکھ آخر تو
کھولے بیٹھے ہیں سب اس بزم میں دفتر اپنا

۱۵۱

سینہ جلتا ہے تپِ عشق سے اکثر اپنا
ہاتھ رہتا ہے اسی واسطے دل پر اپنا

وہ جو آتے تھے چلے پیچھے، گری ان پر برق
منہ پھرایا جو کل اُس شوخ نے ہنس کر اپنا

جلوہ گر زلفِ سیہ سے نہیں اُس کی در گوش
شبِ تاریک میں چمکے ہے یہ اختر اپنا

خس سمجھ کر بھی کسی نے نہ جلایا اُس کو
اتنے بھی کام نہ آیا تنِ لاغر اپنا

رسم تا نامہ بری کی نہ رہے عالم میں
سب سے پہلے میں کیا ذبح کبوتر اپنا

بت تراشی پہ میں آؤں تو مری صنعت دیکھ
تیشہ رکھ دیوے وہیں ہاتھ سے آزر اپنا

آؤ جی! آرزوے قتل میں ہم مرتے ہیں
کس طرف اٹھ گئے تم نیمچہ لے کر اپنا

مصحفی نقشِ قدم وار، میں جم بیٹھا ہوں
نہیں اٹھنے کا اب اس کوچے سے بستر اپنا

ب

۱۵۲

نوح کا یہ نہیں طوفاں کہ زمیں جاوے ڈوب
میں کروں گریہ تو تا عرش بریں جاوے ڈوب

رنگِ لعلیں کو ترے لب کے جو دیکھے تو وہیں
عرقِ شرم میں خجلت سے نگیں جاوے ڈوب

خونِ عشّاق کے دریا میں تو گھوڑے کو نہ ڈال
پھر غضب ہے جو ترا دامنِ زیں جاوے ڈوب

عین برسات میں قاصد اسے بھیجوں ہوں تو وہ
یہ دعا مانگے ہے رستے میں کہیں جاوے ڈوب

جی میں آتا ہے کہ کر اپنے نوشتے کو یاد
روئیے اتنا کہ سجدے میں جبیں جاوے ڈوب

دیدے تیورا گئے ہیں اور غش آتا ہے چلا
مجھ کو یہ ڈر ہے مرا جی نہ کہیں جاوے ڈوب

اس غضب سے تو مجھے ذبح نہ کرنا کہ میاں!
خوں میں تا قبضہ ترا خنجرِ کیں جاوے ڈوب

تاؤ پر آوے جو وہ حسن تو جل جاوے چگل
لہر پر آوے جو وہ زلف تو چیں جاوے ڈوب

مصحفیؔ چاہِ زنخداں میں گرا ہے تیرے
کھا کے دو غوطے مزہ ہے جو وہیں جاوے ڈوب

۱۵۳

شب کیا میں نے جو اک نالۂ زار آخرِ شب
سوتے سوتے اٹھے ہمسایے پکار آخرِ شب

یار بن سیرِ گلستاں سے میں مجروح آیا
تیر سی دل میں لگی صوتِ ہزار آخرِ شب

وصل کی شب ہے، دلا! اتنی نہ بے ہوشی کر
ورنہ اس مے کا تو کھینچے گا خمار آخرِ شب

کم نصیب ایسے سے کیا وصل کا پوچھو ہو مزہ؟
جس کو مر مر کے ملا بوس و کنار آخرِ شب

ہم نے مضمون ترے دزدِ حنا کا باندھا
لگ گیا ہاتھ ہمارے یہ شکار آخرِ شب

اوّلِ شب سے مجھے نیند نہ آئی، جس دن
اُس نے مجھ سے کیا ملنے کا قرار آخرِ شب

آہ وہ آتشِ سوزاں ہے کہ ہمسایوں کو
شب میں ڈالے ہے نت اس کا شرار آخرِ شب

مل گئے خاک میں ہم صبح کے ہوتے، شبِ وصل — اٹھ چلا جھاڑ کے دامن کو جو یار آخرِ شب

جا لگتے تھے جو نصیب اپنے تو اُس کوچے میں — کبھی یاروں کا بھی ہوتا تھا گزار آخرِ شب

شب ترے کاکلِ مشکیں کی مسیحائی سے — کر گئی زندہ ہمیں بادِ بہار آخرِ شب

وے بھی کیا دن تھے کہ جب آنکھ کھلے تھی اپنی — چمنِ وصل کی لوٹیں تھے بہار آخرِ شب

کانپ اٹھتا ہوں میں جس وقت ترے کوچے میں — نالہ کرتا ہے کوئی زار و نزار آخرِ شب

مصحفی دیکھتے تھے ہم بھی سرِ شعلۂ شمع
جب کیا جی کو پتنگے نے نثار آخرِ شب

۱۵۴

مجھ کو صحبت ہے سرِ زلف سے اب، آخرِ شب — ہے یہی جاگنے کا میرے سبب، آخرِ شب

کھل گئی آنکھ مری سوتے سے جب آخرِ شب — تہِ دنداں نظر آئے مجھے لب، آخرِ شب

اے دل! اب تو کہیں شیون کے تئیں کر موقوف — تعزیہ دار بھی سو رہتے ہیں سب، آخرِ شب

یہ وہی جانے جو اٹھ اٹھ کے کبھی جاگا ہو — لذّت اک وصل میں ہوتی ہے عجب آخرِ شب

اوّلِ شب تو بڑی بھیڑ ہے اُس مجلس میں — ہووے تو ہووے کہیں ملنے کا ڈھب آخرِ شب

جیسے اس نالۂ جاں سوز نے سر کھینچا ہے — آگ اس طرح کہیں بھڑکے ہے کب آخرِ شب

شورِ بلبل سے میں شاکی نہیں اِس گلشن میں — مجھ پہ نالے مرے لائے ہیں غضب آخرِ شب

در و دیوار سے آواز بگیر آتی ہے — یار کے کوچے میں ہم جاتے ہیں جب آخرِ شب

نہ کھلی مصحفی اس کافرِ بیدرد کی آنکھ
میں نے نالے کیے ہر چند کہ، شب آخرِ شب

۱۵۵

پانو اس درجے سے تو رکھو نہ زمیں پر، صاحب — پھسلے کیا پڑتے ہو ہر لحظہ ہمیں پر، صاحب!

ہے غرض غصّے کی صورت بھی تمھارے پیاری — کیا بھلے لگتے ہو اس چینِ جبیں پر، صاحب!

دیکھتے کیا ہو جگر خستگی میری؟ کیجے / اک نظر اپنے بھی لعلِ نمکیں پر، صاحب

گر تمھاری ہے یہی چال، تو تم دیکھو گے / آفت آوے گی کسی خاک نشیں پر، صاحب

کس کا سر کاٹ کے فتراک سے باندھا تھا جو آج / ہے بہار آپ کے اس دامنِ زیں پر صاحب

آؤ، مت دیر کرو، آ رہی ہے اپنی اب / زندگانی، نفسِ بازپسیں پر صاحب

ہم نہ کہتے تھے میاں مصحفیؔ دل اس کو نہ دو!
تم بلا لائے نہ اس جانِ حزیں پر صاحب

۱۵۶

صاد سے چشم، تو ہے زلفِ دوتا دال سے خوب / حق نے یہ چہرہ بنایا ہے خط و خال سے خوب

ابرِ رحمت! میں توقع پہ تری آیا ہوں / دھو سیاہی کو مرے نامۂ اعمال سے خوب

اک ذرا اور ہی اٹکھیلیاں کرتے چلیے / آپ نظروں میں مری لگتے ہیں اس چال سے خوب

کیسری شال کو سر سے نہ جدا کر اپنے / چمپئی حسن ترا لگتا ہے اس شال سے خوب

میں دل آزردہ، یہی جانِ حزیں رکھتا ہوں / دشمن اور دوست ہیں واقف مرے احوال سے خوب

تھی گرفتاریٔ ایام بڑا الجھیڑا / مر کے ہم چھوٹ گئے زیست کے جنجال سے خوب

مصحفیؔ حال پریشاں ہے ترا، وصل نہ چاہ
منہ اُسے اپنا دکھانا نہیں اس حال سے خوب

۱۵۷

یہ خستہ تمام ہو چکا اب / بس اپنا تو کام ہو چکا اب

سب ناظمِ ملک سو رہے ہیں، ہائے! / دنیا کا نظام ہو چکا اب

روٹھا رہا وہ یوں نہیں تو اپنا / اے یار و سلام ہو چکا اب

زلفوں میں پھر اس نے منہ چھپایا / بس وعدۂ شام ہو چکا اب

ہم مل گئے خاک میں ہی، ہم سے / ملنے کا پیام ہو چکا اب

چل سو رہیں ٹک کہ شب ہے آخر　　دورِ مے و جام ہو چکا اب
قاصد! اگر اس گلی میں جاوے　　کہیو کہ غلام ہو چکا اب
سیرِ شبِ ماہ یار تک تھی　　لطفِ لبِ بام ہو چکا اب
دنیا ہے سرائے فانی، اس سے　　چلیے کہ مقام ہو چکا اب

رکھا نہ خاک مصحفیؔ کو
آرام تمام ہو چکا اب

۱۵۸

بال و پر باز کیا چاہیے اب　　یاں سے پرواز کیا چاہیے اب
بس بہت ضبطِ غمِ عشق کیا　　گریہ آغاز کیا چاہیے اب
بات جانے لگی اپنی اُس تک　　فکرِ غمّاز کیا چاہیے اب
فرش پر اُس کے قدم ہے اے دل!　　عرش پر ناز کیا چاہیے اب
سخت مشکل ہے، ترا بھی شکوہ　　بختِ ناساز کیا چاہیے اب
کیا ستم ہے کہ تصوّر کو ترے　　اپنا ہمراز کیا چاہیے اب!

مصحفیؔ دل کوئی لیتا ہی نہیں
خاک انداز کیا چاہیے اب

۱۵۹

لو اب اس دل کو تمھیں آگ لگاؤ، صاحب　　جھوٹی باتوں سے مراجی نہ جلاؤ، صاحب
جلوہ ہر ایک کو اپنا نہ دکھاؤ، صاحب　　کیا غضب کرتے ہو ٹک مُنہ تو چھپاؤ صاحب
کون مشتاق تھا آنے کا تمھارے ایسے　　"جاؤں جاؤں" ہی جو کرتے ہو تو جاؤ صاحب
ہم سے کیا کہتے ہو "بگڑے نہیں کچھ ہم نے ہاتھ　　دل کے تئیں ڈھونڈھ لو سینے میں چھپاؤ صاحب"
یہ کوئی طور ہے مُنہ ڈھانپ چلے جانے کا؟　　کس طرف جاتے ہو؟ ٹک تو اِدھر آؤ صاحب

کل سرِ راہ میں تم غیر سے کیا کہتے تھے؟ تم کو میری ہی قسم ہے، نہ چھپاؤ، صاحب

اور مذکور کو جانے دو، خفا بیٹھے ہیں
مصحفیؔ اب تو کوئی شعر سُناؤ صاحب

۱۶۰

بات میں ہو گئے خفا، صاحب! یہ بھی کوئی بات تھی بھلا، صاحب!

اب جو یوں تم نے مُنہ تھتھایا ہے پھر نہ بولو گے ہم سے کیا صاحب!

صدقے ہیں ہم تمھاری صورت کے زور بیٹھے ہو مُنہ بنا صاحب!

ہیں کھلے گُل کی طرح بندِ قبا کیا تمھیں بھی لگی ہوا صاحب؟

ہم سے ملتے ہی بے وفائی کی یہ ہی ہوتی ہے کیا وفا صاحب؟

دو نہیں کچھ تم نکل ہی بھاگے، ولے میں کوئی تم کو چھوڑتا صاحب؟

بچ گئے رات میرے ہاتھوں سے دو نصیبوں کے تئیں دعا صاحب

پوچھتے کیا ہو مصحفیؔ کا نشاں؟
خاک میں وہ تو مل گیا صاحب



۱۶۱

سج کر کے جو آج آئے ہیں شمشیر و سپر آپ فرمائیے یہ بارے کہ جاتے ہیں کدھر آپ؟

کچھ خانہ خرابی کا نہیں ان کی میں باعث ہیں دشمنِ جاں اپنے تو یہ دیدۂ تر آپ

مانگا جو میں بوسہ تو کہا نند ہو، مجھ کو، "یہ شوخیاں مجھ سے نہ کریں بارِ دگر آپ"

مت جائیو قاصد! تو مری بے خبری پر میں، گُم شدہ دل اپنے کی رکھتا ہوں خبر آپ

اپنی تو نہیں خواہشِ دل گریہ پہ، لیکن کیا کیجے جو آنکھوں سے گریں لختِ جگر آپ؟

چھپ جاتے ہیں پھر وہ نہیں مۂ عید کے مانند آ جاتے ہیں آنکھوں میں کسی کی جو نظر آپ

اے مصحفیؔ اُس کوچے سے جوں چاہیے توں اب
ہے خیر اسی میں کہ کریں عزمِ سفر آپ

ت

۱۶۲

ہو جس جگہ نہ ناوکِ تقدیر کی نشست خاطر نشاں کرے ہے ترے تیر کی نشست
از بس کہ اُس کی بزم میں ہے ازدحامِ خلق میں اک طرف، کہ واں نہیں تدبیر کی نشست
دنیا سے دل نہ باندھ کہ اس بزم گاہ میں گاہے جوان کی ہے، گہے پیر کی نشست
ربطِ گل و بنفشہ سے دیتی ہے مجھ کو یاد عارض پہ اُس کے زلفِ گرہ گیر کی نشست
کیا بیٹھے نقشِ لالہ و گل اُس ورق کے بیچ؟ خاکے پہ جس کے ہو تری تصویر کی نشست
اب حلقہ حلقہ بیٹھتے ہیں واں جنوں زدہ جس در پہ تھی نہ حلقۂ زنجیر کی نشست
کیا مارے دست و پا دہ ستم کشتہ، بعدِ قتل؟ ہر استخواں پہ جس کے ہو شمشیر کی نشست

دنیا سے دوں نہ جائے اقامت ہے مصحفیؔ
ہم اس دری پہ بیٹھے ہیں رہ گیر کی نشست

۱۶۳

ہو جس کے دل میں داغِ غمِ یار کی نشست کیا خوش کرے اُسے گل و گلزار کی نشست
بیٹھے ہے جب کہ خانۂ زیں میں وہ طفلِ شوخ عالم کو ذبح کرتی ہے، خونخوار کی نشست
جیتے تو گوشت پوست مرا اس کا وقف تھا اب ہڈّیوں پہ ٹھہری ہے تلوار کی نشست
بیٹھا ہوں دست بستہ میں یوں اس کے روبرو ہو محکمے میں جیسے گنہگار کی نشست
پھر ہم جو تیری بزم میں آ دیں تو کیا کریں؟ واں تو ہمیشہ رہتی ہے دو چار کی نشست

یہ ظرفِ تنگ اور وہ دریائے بیکراں اس دل میں کیونکہ ہو غمِ بسیار کی نشست؟

کیا بک گیا ہے ہاتھ کسی کے تو مصحفیؔ؟
اب پھر شروع کی ہے جو بازار کی نشست

۱۶۴

دل جانے ہے اس ابروئے خمدار کی نشست کردی ہے پست جن نے کہ تلوار کی نشست
دیکھے سے اُس کے دل تو مرا داغ ہو گیا کیا پوچھتے ہو خالِ رُخِ یار کی نشست
اس تفرقے میں حیف کہ موقوف ہو گئی تھی میرے اُس کے وہ جو کبھی پیار کی نشست
اتنا تو اچپلا ہے کہ مانی نہ لکھ سکا جوں برق اک جگہ تری رفتار کی نشست
جس نے سرِ بریدہ کو کرسی کیا، اُسے کم تختِ سلطنت سے نہیں دار کی نشست
سوزن نہ مارو کوئی کہ ہر زخم پر مرے سوزن زن آپ ہے مری منقار کی نشست
سطحِ زمیں ہے صفحہ صورت گراں، کہ ہے جس پر ہزار بیخود و ہشیار کی نشست
گل چیں! یہ کب روا ہے کہ ایسی بہار میں برخاست ہووے گل کی، رہے خار کی نشست؟
گریے سے میرے موسمِ برسات لگ گیا یارو! عجب نہیں در و دیوار کی نشست
اس صفحے پر برائے خدا دیکھیو ذرا ق تیرے قلم کی اور مرے اشعار کی نشست

دو چار گرچہ بستہ و آوردہ ہیں ولے
نقشِ نگیں ہے مصحفیؔ دو چار کی نشست

۱۶۵

ایسا بھی کوئی گرے ہے خللِ ملکِ دیں میں بت! ہرگز میں اُس کی شکل کا دیکھا نہ چیں میں بت
مذہب میں میرے شیخ کے اتنا ہی فرق ہے میں ہاتھ میں رکھوں ہوں تو وہ آستیں میں بت
دیں ہو گیا بکفر بدل یاں تلک، کہ خلق رکھے ہے جائے قبلہ نما اب نگیں میں بت
سجدہ کرے خدا کو تو کیجو سمجھ کے شیخ اب بھی گڑے ہوئے ہیں ہزاروں زمیں میں بت

جاؤں طواف کرنے کو کیوں کر میں مصحفیؔ
کعبے کے طاق میں ہے مرے نے نگیں ہیں بت

۱۶۶

رہا یہ دل تو بیمارِ محبت — گیا اس سے نہ آزارِ محبت
ہیں عاشق اور بھی لیکن نہ ہوگا — کوئی مجھ سا گنہگارِ محبت
نہ دیکھا جس نے روئے دانہ و دام — سو میں ہوں وہ گرفتارِ محبت
ہمارے نالۂ آتش فشاں نے — کیا پھر گرم بازارِ محبت
نظر کرتے ہی اُس کا فرمژہ پر — چبھا دل میں مرے خارِ محبت
اُسے کیا دوش، رسوا ہو گیا ہوں — میں آپھی کر کے اظہارِ محبت
بچشمِ کم نہ دیکھو مصحفیؔ کو
ہے دولت خواہِ سرکارِ محبت

۱۶۷

جگر میں کھٹکے ہے خارِ محبت — خلش کرتا ہے آزارِ محبت
نگاہوں سے نگاہیں جب ملیں ہیں — بٹا جاتا ہے تب تارِ محبت
مرا دل دامِ زلفِ عنبریں سے — نہ چھوٹا، تھا گرفتارِ محبت
محبت میں موئے ہم تو بھی ہم سے — رہا پوشیدہ اسرارِ محبت
زیانِ جاں وہاں اوّل قدم ہے — نہ پوچھو سودِ بازارِ محبت
اسے کیا کام ہے دیر و حرم سے — جو کافر ہو پرستارِ محبت
نپٹ احوال بد ہے مصحفیؔ کا
بچے گا کیا یہ بیمارِ محبت

۱۶۸

برا ہوتا ہے اظہارِ محبّت | نہ کیجے گا ہے اقرارِ محبت
وہ مجرم ہوں کہ یاروں نے رکھا ہے | لقب میرا زیاں کارِ محبت
بس اب اقرار کے ثمرے کو دیکھا | میں اور من بعد انکارِ محبت
نہ آیا شام بھی گھر پھر کے اپنے | تماشائیِ بازارِ محبت
میں ہر دم خوں میں تڑپوں ہوں کہ مجھ کو | یہی ہے سیرِ گلزارِ محبّت
بہت اے مصحفیؔ آنکھوں نے کھایا ق | فریبِ حسنِ تکرارِ محبّت

خدا کے واسطے تو چھوڑ اب تو
یہ استبداد و اصرارِ محبّت

۱۶۹

نہ کر تو مجھ سے انکارِ محبّت | کوئی چھپتا ہے آزارِ محبّت
مرے چہرے کا رنگِ زعفرانی | کرے ہے آپ اظہارِ محبت
بایں نازک تنی، اے وامصیبت! | ہوا تو نازبردارِ محبّت
صراحی سی تری گردن ہوئی، ہائے! | اسیرِ تارِ زنّارِ محبّت
بھلا میری طرح صد شکر، اے شوخ! | ہوا تو بھی گرفتارِ محبّت؟
کسی کے نشترِ مژگاں سے بارے | چُبھا دل میں مرے خارِ محبّت
تری آنکھوں سے، لب سے، رنگِ رُخ سے | ق عیاں ہیں سارے آثارِ محبّت
ستم یہ ہے کہ تو بھی میرے آگے | نہیں کرتا تو اقرارِ محبّت

نہ کر یہ بات پنہاں مصحفیؔ سے
کہ جانے ہے وہ تیمارِ محبّت

۱۷۰

اُس کے ابرو سے کچھ آئی نہ تھی دوچار کی موت | کتنے اس شبہ میں مارے گئے تلوار کی موت

روبرو میرے کوئی بات بھی اُس سے نہ کرو
ہائے! اس بات میں ہے میرے دلِ زار کی موت

مارے بے طاقتیوں کے یہ موا جاتا ہے
کاش آجاوے شتابی ترے بیمار کی موت

آب و دانے کا گلہ تجھ سے نہیں اے صیاد!
ہے مگر قیدِ قفس مرغِ گرفتار کی موت

عشق کا جس کو مرض ہو وہ یہی کہتا ہے
نہ ہو دشمن کی بھی قسمت میں اس آزار کی موت

مصحفیؔ، مل کے بہم جاتے ہیں اس کوچے میں
جب کبھی آتی ہے اس شہر میں دو چار کی موت

۱۷۱

جب سے کافر نے سُنی ہے کسی بدذات کی بات
تب سے کرتا ہی نہیں لطف و عنایات کی بات

جنبشِ چشم سے اس کی کوئی واقف نہ ہوا
کون بیمار کے سمجھے ہے اشارات کی بات

اک ہمیں ہیں کہ نہیں آتے زباں پر اُس کی
درمیاں رہتی ہے یوں سب سے ملاقات کی بات

دن کو اب شیخیاں کرنے لگے میرے آگے
چلو جاؤ بھی، میاں! بھول گئے رات کی بات

مصحفیؔ شوق ہوا ہے سببِ طولِ کلام
ورنہ کیا، ہے سخنِ عشق تو اک بات کی بات

۱۷۲

زبس کہ گریہ سے فرصت ہمیں نہیں دن رات
رہے ہے دیدۂ گریاں پہ آستیں دن رات

ہزار حیف! بہ ایں چہرۂ شگفتہ چو گل
خراب و خوار پھرے تجھ سا نازنیں دن رات!

نہ ہووے کیوں کہ مجھے دردِ سر کہ کافر کی
لپی ہی رہتی ہے صندل سے کچھ جبیں دن رات

زمیں کا پیٹ نہیں اب تلک بھرا، تب تو
چلا ہی جاوے ہے عالم تہِ زمیں دن رات

درازیِ شبِ ہجراں سے ظلم ہے مجھ پر
خدا کرے کہ برابر بھی ہو کہیں دن رات

کبھو جو پھر گیا پلکوں کا اس کی مُنہ ادھر
مرے جگر کے اوپر برچھیاں چلیں دن رات

شکستِ زلفِ بتاں ہو اگر ذرا بھی درست
دلِ شکستہ مرا کیوں رہے حزیں دن رات؟

سیاہ بختی پر اُس کی نہ جائیو ہرگز — کہ زیرِ مُہر ہے عاشق کے جوں نگیں دن رات

خوشی کا نام نہ دیکھا کہیں زمانے میں
جیے تو ہم، پہ رہے مصحفیؔ غمیں دن رات

۱۷۳

ہم کو گر رکھّا زمیں میں دیدۂ گریاں سمیت — روزِ محشر خاک سے اُٹھّیں گے ہم طوفاں سمیت

ہائے رے وہ شرمگینی اور محرّف دیکھنا! — دل میں پھرتی ہیں وہ نظریں سایۂ مژگاں سمیت

وہ جو تھے پلکوں پہ میری چند قطرے اشک کے — جھڑ پڑے دامن میں آخر حسرت و حرماں سمیت

اُن ستم کشتوں میں ہوں تیرے، کہ میری خاک سے — تیر بھی نکلیں ہیں گر، اے شوخ! تو پیکاں سمیت

حشر کے فریادیوں پر عرصہ ہو جاوے گا تنگ — ہم بھی آ نکلے اگر واں اس دلِ نالاں سمیت

جس نے دیکھا ہو ترا چاکِ قبا، اے سروِ ناز! — کیوں نہ وہ پھاڑے گریباں مثلِ گُل داماں سمیت

عالمِ زیرِ زمیں بھی حسن سے خالی نہیں — خاک سے گُل تب تو نکلے ہے لبِ خنداں سمیت

اس ادا سے کل وہ آیا باغ میں دامن کشاں — ہو گئے گُل فرش سارے سنبل و ریحاں سمیت

مصحفیؔ گر یہ غزل میں لکھ کے بھیجوں لکھنؤ
میرؔ رخصتِ تازہ گوئی نہ کرے دیواں سمیت

۱۷۴

اشک سے میرے بچے ہمسایہ کیونکر گھر سمیت؟ — بہ گئی ہیں کشتیاں اس بحر میں لنگر سمیت

چشمِ زخم آنکھیں لڑانے سے اُسے پہنچے مگر — رہنے ہیں جو رخنۂ دیوار بند اب در سمیت

مت کلہ داری پہ نازاں ہو کہ اک گردش کے بیچ — مل گئے ہیں خاک میں یاں کتنے سر افسر سمیت

کس کے کانوں کی صفا کا شور دریا میں گیا؟ — جو پڑا بیتاب پھرتا ہے صدف گوہر سمیت

یا تو لکھتے ہی نہ تھے یا آئے جب لکھنے اوپر — صفحے کے صفحے سیہ ہم کر گئے مسطر سمیت

ایسے قاتل پر کوئی اثباتِ خوں کیونکر کرے؟ — خاک میں جس نے سلائے سیکڑوں خنجر سمیت

بے طرح سے آ پھنسے ہیں چنگلِ صیّاد میں
دیکھیے چھوٹیں گے کیونکر یاں سے بال و پر سمیت

کس کی مژگاں کا میں کشتہ ہوں؟ کہ ہنگامِ بہار
سبزہ میری خاک سے اُگتا ہے پر نشتر سمیت

عشق کی رہ وہ بری رہ ہے کہ جس میں مصحفی
صاحبِ طبل و علم حیران ہیں لشکر سمیت

۱۷۵

بس کہ گرمِ گریہ تھا دل رات چشمِ تر سمیت
لختِ دل دامن میں گرتے تھے مرے اخگر سمیت

تو سہی ناصح کہ میں اپنے گریباں کے تئیں
دھجیاں کر کے اُڑاؤں دامنِ محشر سمیت

کس کے تئیں مارے ہوئے آتا ہے؟ ظالم! سچ تو کہہ
بھر رہا ہے ہاتھ تیرا خون میں خنجر سمیت

اس ہوا میں کر رہے ہیں ہم ترا ہی انتظار
آ کہیں جلدی سے، ساقی! شیشہ و ساغر سمیت

میں ہی جانوں ہوں کہ جیسی بے کسی سے شمع پر
جل کے خاکستر ہوا پروانہ بال و پر سمیت

جب سے دیکھا ہے ترا رُخ، اے عرق آلودہ، جاں!
آسماں پھرتا ہے تیرے گرد نت اختر سمیت

مصحفی چرخِ مقرنس ہے وہ فانوسِ خیال
جس میں شاہانِ جہاں گردش میں ہیں لشکر سمیت

۱۷۶

کچھ مجھ سے ان دنوں نہیں اُس کی نظر درست
پہنچی ہے میرے عشق کی اُس کو خبر درست

صیّاد سے کہو پر و پیکاں کو آب دے
اب ہم نے پھر کیے ہیں ذرا بال و پر درست

نت پرزے پرزے کر کے اڑاتا رہا وہ شوخ
لایا نہ واں سے ایک بھی خط نامہ بر درست

روتا ہوں جب میں یاد کر اُس رشکِ بدر کو
ہر اشک سے بنے ہے زمیں پر قمر درست

دو کہے جو کوئی ہم کو تو کیوں مانیں ہم برا
اس عہد میں خراب ہیں اہلِ ہنر درست

میرے دلِ شکستہ کو کہتی ہے دیکھ خلق
کیا زور آئنہ ہے یہ ہو وے اگر درست

کٹ کٹ کے اب تو سینے سے نکلے ہے مصحفی
وے دن گئے کہ تھا کبھی اپنا جگر درست

۱۷۷

سو دل سے تیرے تیر کا گزرا ہے سر درست — پیکاں نے تیرے کس کا رکھا ہے جگر درست؟

واحسرتا! کہ قافلہ یاروں کا لد چلا — اور ہم سے ہو سکا بھی نہ سازِ سفر درست

ہوتی نہیں درست شکن اُس کی زلف کی — کرتا رہے ہے گرچہ وہ شام و سحر درست

ہے ہے! کہ آشیاں پہ مرے برق ہی گری — جب فصلِ گل میں مَیں نے کیے بال و پر درست

مرغانِ میوہ خوار سے فریاد ہے کہ ہائے! — اس نخل سے گرا نہ کبھی اک ثمر درست

جب نیمچے کو اُس نے میاں سے علم کیا — خورشید کی رہی نہ فلک پر سپر درست

میرا دلِ شکستہ وہ شیشہ ہے مصحفی
جس شیشے کو کرے نہ کوئی شیشہ گر درست

۱۷۸

اوریاں پیر و جواں جتنے ہیں، ہیں پیر پرست — میں وہ کافر ہوں جسے کہتے ہیں تصویر پرست

سجدہ کرتا ہوں میں محراب سمجھ کر اس کو — عشق نے تیرے کیا ہے مجھے شمشیر پرست

در و دیوار کی صورت کا تماشائی ہوں — میں ترے کوچے میں جوں مردمِ تعمیر پرست

عکسِ خوباں سے ہوا آبِ رواں بتخانہ — جس کی ہر موج ہے اک ہندوئے تصویر پرست

زلفِ مشکیں کے ترے گرد ہے یوں اک عالم — خانۂ کعبہ میں جوں خلق ہو زنجیر پرست

مصحفی کیوں نہ تکے روئے نکویاں کی طرف؟
چشمِ صیّاد سدا رہتی ہے نخچیر پرست

۱۷۹

گرچہ جوں آئینہ اوّل تھا یہ دل حیرت پرست — دیکھ اس کی شکل آخر ہو گیا صورت پرست

سرو پر قمری ہے عاشق، اور گل پر عندلیب — ہے ہر اک مرغِ چمن اس باغ میں الفت پرست

جان دینے سے نہیں اس کے تئیں ہرگز دریغ — عشق بازی میں یہ دل ہے زور ہی ہمّت پرست

نت جن آنکھوں میں رہے تھا تیری صورت کا خیال　　اب وہ آنکھیں صورتِ آئینہ ہیں حیرت پرست

مصحفی میخانۂ گلشن میں ہنگامِ بہار
ایک ہی پیالے پہ ہے گل کی طرح عشرت پرست

۱۸۰

جب سے جدا ہوا ہے تو، اے مایۂ حیات!　　آہ و فغاں میں گزرے ہے مجھ کو تمام رات

عاشق تمام عمر ہے قیدِ فرنگ میں　　ممکن نہیں کہ ہووے غمِ عشق سے نجات

آپس میں دوستوں کا نہ ہو جاوے خوں سپید　　ہووے ذرا بھی رنگِ محبّت کو گر ثبات

زلفوں نے تیری پھینکی ہے خورشید پر کمند　　رخ نے ترے کیا ہے مہِ چاردہ کو مات

اللہ رے کافری ترے طرزِ خرام کی!　　نقشِ قدم سے کر دیا کعبے کو سومنات

دریا تمام لہروں سے آغوش ہے ہنوز　　دیکھی تھی ایک دن کہیں اس سیم تن کی گات

اس سے زیادہ اور ہوں کیا خوار شیخ جی؟　　کعبے گئے تو واں بھی کسی نے نہ پوچھی بات

زخم اپنے دیکھ دیکھ نہ رُو اتنا مصحفی
کیا ڈر ہے؟ بچ رہے گا، اگر ہے تری حیات

۱۸۱

مرے خوں کا پیاسا وہ قاتل رہا نت　　گلے اُس کے تیغا حمائل رہا نت

نہ تنہا میں عاشق ہوں خوش قد پہ تیرے　　دلِ سرو مائل بھی مائل رہا نت

جگر کو مرے تم سراہو، عزیزو!　　کہ مژگاں کے اُس کی مقابل رہا نت

زبس کشتے پر کشتے تڑپا کیے واں　　گلی میں تری رقصِ بسمل رہا نت

کبھی میں نے بے پردہ اس کو نہ دیکھا　　مرے اس کے اک پردہ حائل رہا نت

نہ سویا کوئی میرے عہدِ جنوں میں　　کہ راتوں کو شورِ سلاسل رہا نت

نہ دی بھیک تو نے کبھی مصحفی کو
ترے در پہ پیارے، وہ سائل رہا نت

۱۸۲

بدنام کیا میں نے عبث نامِ محبت | مجھ سے نہ ہوا کچھ بھی سرانجامِ محبت

یہ میکدہ وہ ہے، کہ نہ پھر ہوش میں آیا | اس میکدے سے جس نے پیا جامِ محبت

میں سیکڑوں خط اُس کو لکھے اُس نے نہ بھیجا | قاصد کی زبانی کبھی پیغامِ محبت

اے عشق! اب اس دل کو ذرا چین دے ظالم | اِس دل نے اٹھائے بہت الزامِ محبت

اُس طائرِ وحشی کے نہ درپے ہو تو، صیاد! | جو چھوڑ کر آیا قفس و دامِ محبت

میں آپ کو بدنام کیا میوہ خوروں میں | اس باغ میں چن چن ثمرِ خامِ محبت

کیا سحر ہے آنکھوں میں تری جس نے، مری جاں! | کر رکھا ہے عالم کے تئیں رامِ محبت

کیا صوم و صلوٰۃ اُس سے ہو، جو شخص ہُوا ہو | مصروف بہ دینداریِ احکامِ محبت

مارا گیا شب مصحفی اس بت کی گلی میں
سچ ہے کہ برا ہوتا ہے ابرامِ محبت

۱۸۳

جس میں ہم دیکھیں تھے ہر آن، خدا کی قدرت | سو وہ دل یوں ہوا حیران، خدا کی قدرت!

پیرہن لوٹے مزے تیری ہم آغوشی کے | ہم کریں چاک گریبان، خدا کی قدرت!

جن سے ہم رکھتے تھے سو چشم، وہ کل دیکھ ہمیں | ہو گئے جان کے انجان، خدا کی قدرت!

جب میں روتا ہوں تو دامن میں مرے گرتے ہیں | جائے اشک آنکھوں سے پیکان، خدا کی قدرت!

گو نہ مشاطہ بناوے خط و خال اس رخ کا | کام میں اپنے ہے بر آن، خدا کی قدرت

چشمِ بینندہ کہاں ہے جو تماشا دیکھے | ہے الی الان کما کان، خدا کی قدرت

ابھی چاہے تو اک ادنیٰ کے تئیں کر دیوے | مالکِ ملکِ سلیمان، خدا کی قدرت

دل کو لیجا کے مرے ہر گھڑی دکھلاتی ہے | اُس کی ہر زلفِ پریشان، خدا کی قدرت

پیکرِ نور فرشتوں کو ملے، اور ہووے | خاک سے خلقتِ انسان، خدا کی قدرت

مصحفی سا بشر، اے شوخ! ترے کوچے میں
یوں پھرے خوار و پریشان، خدا کی قدرت!

۱۸۴

عاشق وہی کہ جس کے آنسو بہا کریں نت
رومال اشکِ خوں میں ڈوبے رہا کریں نت

مجلس تلک رسائی اُس کی نہیں وگرنہ
ہم ساری رات بیٹھے قصّے کہا کریں نت

اک ملنے والے ہم تھے سو ہو چکے ہیں، صاحب!
اب آپ جس سے چاہیں اُس سے ملا کریں نت

مکتب نشین لڑکے کتنے غضب ہیں، ہے ہے!
کس نے کہا انھوں سے مشقِ جفا کریں نت

خورشید و مہ نے نقشا دیکھا نہیں وگرنہ
دن رات جستجو میں تیری پھرا کریں نت

جس خاک سے تو گزرے آبِ حیات کی طرح
تا روزِ حشر مردے واں سے اٹھا کریں نت

ث

۱۸۵

نہیں آیا ہمارے پاس اب تک یار، کیا باعث؟
گیا کیوں بھول، کر کے ملنے کا اقرار کیا باعث؟

ٹھہرتا ہی نہیں سینے میں دل زنہار، کیا باعث؟
چوئے ہی پڑتے ہیں کچھ دیدۂ خونبار کیا باعث؟

دُکھا کرتا ہے دل سینے میں میرے، روز و شب، یارو!
نہیں معلوم ہوتا اس کا کچھ اسرار، کیا باعث؟

نکل بھی جا کہیں اے دل! شتابی ساتھ آنسو کے
مرے سینے میں تو کیوں کھینچے ہے آزار، کیا باعث؟

کبھو آنکھوں میں سرمہ اور کبھی ابرو پہ وسمہ ہے
سجی جاتی ہے واں ہر دم نئی تلوار، کیا باعث!

جو کوئی شیخ صنعا کی طرح عاشق ہو ترسا کا
نہ پوچھو اس سے باندھی تو نے کیوں زنار، کیا باعث؟

خموشی خوب ہے ایسی جگہ، اے مصحفیؔ! چپ رہ
کسو سے دردِ دل کا کیجیے اظہار کیا باعث؟

۱۸۶

عنقا ملا ہے کس کو دلا؟ جستجو عبث
پھرتا ہے ڈھونڈتا تو اُسے کو بہ کو، عبث

اس چرخِ خود مراد سے، اُس کے وصال کی
خواہش عبث، امید عبث، آرزو عبث

عادی بہ آہ و نالہ ہوں میں، آہ کیا کروں؟
نت مانے ہے برا وہ بتِ تند خو، عبث

اے دل! اگر اُس کے سامنے جاوے تو میں بدوں
کرتا ہے شیخیاں تو مرے روبرو عبث

ہرگز نہیں یہ دوختنی مثلِ جیبِ گل
کرتے ہو چاکِ سینہ کو میرے رفو عبث

اے فصلِ نو بہار پےِ انبساطِ طبع
کرتی ہے مجھ پہ عرضِ گل و لالہ تو عبث

اپنی تو چشم میں چمنِ روزگار کا
لطفِ بہار ہیچ ہے اور رنگ و بو عبث

پیدا کر اوّل عشق جو چاہے ہے وصلِ دوست
اے شیخ! اور نہ ہے یہ نماز و وضو عبث

اے مصحفیؔ وہ جا ہے تو جانے بھی دے اُسے
اپنی طرف سے اتنا لگا جا ہے تو عبث

ج

۱۸۷

پڑتی ہی نہیں اس دلِ بیتاب کو کل آج
آرام و سکوں میں نظر آتا ہے خلل آج

پھر صبح کو ہم اور وہی سیرِ خرابات
اس لغزشِ مستی سے جو جاتے ہیں سنبھل آج

مدّت سے تو ہم تھا ہیں اس کے دہن کا
جنبش میں ٹک اُس لب کی یہ عقدہ ہو احل آج

کی شانہ صفت کس نے میاں دست درازی؟
کھاتی ہے تری زلف تو کچھ زور ہی بل آج

ہمراہ مجھے دیکھ کے کہتا ہے یہ قاتل
"جاتا نہیں، شاید تری آئی ہے اجل آج!"

ہے تا سرِ دیوارِ چمن جوشِ بہاراں
گلگشتِ گلستاں کو جو چلنا ہے تو چل آج

شاید کہ صبا آئی ہے اس گل کی گلی سے
جوں لالہ شگفتہ ہے مرے دل کا کنول آج

تھا ان کے بھی اوپر کبھی تصویر کا عالم
ویراں نظر آتے ہیں جو یہ قصر و محل آج

ہے نعش پہ کشتے کی ترے زور تماشا
اے آفتِ جاں! تو بھی ذرا گھر سے نکل آج

کیوں چپ ہو میاں مصحفیؔ؟ فرماؤ تو صاحب
پڑھتے نہیں ہو تم جو کوئی شعر و غزل آج

۱۸۸

قاتل! مرے یاروں کو نہ خط سادہ لکھا بھیج — بھیجے ہے تو کاغذ کو ٹک اک لہو سے رنگا بھیج

یا اپنے شتاب آنے کا خط مجھ کو لکھا بھیج — یا مجھ کو ہی خط بھیج کے پاس اپنے بلا بھیج

ڈرتا نہیں ہوں میں بھی اب، اے عشق! بلا سے — جس طرح کی چاہے تو مرے سر پہ بلا بھیج

وا شد نہیں ہوتی ہے مرے غنچۂ دل کو — اُس کوئے سے الٰہی تو کہیں بادِ صبا بھیج

اسبابِ غم و غصّہ فلک ہم پہ بہت ہے — جو چاہیے تیرے تئیں تو یاں سے منگا بھیج

قسمت ہی سے یہ زخم کہیں ہاتھ لگے ہے — اے کشتہ! تو قاتل کے تئیں اپنی دعا بھیج

جب میں نے کہا "دیتا ہوں دل، آن کے لے جا" — بولا کہ "جو دیتا ہے تو گھر بیٹھے دلا بھیج"

دے ڈالیں ہم اس دل کو ابھی نیم نگہ پر — بیتا کوئی اس دل کا اگر دیوے خدا بھیج

اے مصحفی گل بھیجیں ہیں غیر اس کو تو بھیجیں
تو لختِ جگر کا اُسے گلدستہ بنا بھیج

۱۸۹

بڑھ گئی بیماریِ دل، کیجے یارب کیا علاج؟ — اب تو مرنا ہی پڑا اس غم سے ہم کو لاعلاج

تو نے، اے جرّاح! کیوں مرہم لگایا؟ کیسا کیا؟ — سودۂ الماس اس زخمِ کہن کا تھا علاج

اٹھ سرِ بالیں سے میرے، جا بھی گھر کو، اے طبیب! — اب دمِ آخر ہے، یاں کیسی دوا؟ کیسا علاج؟

صعب تھا از بس مرض میرے دلِ بیمار کا — چپ رہا میں نے مسیحا سے اگر پوچھا علاج

جان بیکل ہے جدی، اور دل جدا کرتا ہے درد
کیجیے اے مصحفی افسوس کس کس کا علاج؟

۱۹۰

رکھتا ہوں ایک میں تو ترے غم کی احتیاج — کافر ہو جس کو ہو دلِ خرّم کی احتیاج

کھائے ہزار زخم تری تیغ کے، ولے — عیسیٰ سے ہم نے رکھّی نہ مرہم کی احتیاج

اتنا ہوں غم رسیدہ کہ تیرے فراق میں
ہرگز رہی نہیں مجھے ماتم کی احتیاج

رہنا ہے روز و شب انھیں ہر ماہ تعزیہ
کب اہلِ درد کو ہے محرّم کی احتیاج؟

پڑھنا تھا جو کہ ہم کو سو تحصیل کر چکے
مسلم کی اب ہوس، نہ مسلّم کی احتیاج

عشاق اک نگہ سے تری قتل ہو گئے
اب تجھ کو کیا ہے تیغِ تبردم کی احتیاج

ہے ظلم، اُس پہ خنجرِ کم دم لگائیے
جس صید کو ہے تیغِ تبردم کی احتیاج

اُٹھ جائے مصحفیؔ سو کہاں یاں سے، یا علی!
اس در سے رفع ہوتی ہے عالم کی احتیاج

۱۹۱

رؤم دیتا ہے اس کے رخ کو باج
شام سے زلف نے لیا ہے خراج

ایک نالے پہ ہے معاش اپنی
ہم غریبوں کی ہے یہی معراج

سلطنت اور ہی معنے رکھتی ہے
یوں تو سر پر خروس کے بھی ہے تاج

عاشقی کیوں نہ مبتذل ہووے
کارِ پروانہ جب کرے درّاج

تابِ موے کمر بھی اُس کو نہیں
بسکہ نازک بڑا ہے اس کا مزاج

ہے دوا اُس مریض کی تجھ پاس
جس کا عیسیٰ بھی کر سکے نہ علاج

مصحفیؔ فارسی کو طاق پہ رکھ
اب ہے اشعارِ ہندوی کا رواج

چ

۱۹۲

تجھ سے میں یہ نہیں کہتا کہ تو تلوار نہ کھینچ
اپنے دامن کو مرے ہاتھ سے اے یار! نہ کھینچ

رہ لگا آئنہ خانے میں تو اے آئینے
میرے اور یار کے بیچ آن کے دیوار نہ کھینچ

نہ بٹھا حلقۂ ماتم میں گرفتاروں کو
نیلگوں خط تو بگردِ گلِ رخسار نہ کھینچ

لٹ پٹی چال تو چل شوق سے، اے مستِ شراب!
لیک دامن تو زمیں پر گہہِ رفتار نہ کھینچ

شوق ہوتا ہے فزوں مجھ کو ہم آغوشی کا
یوں تو خمیازہ مرے سامنے ہر بار نہ کھینچ

اے نسیمِ سحری! رہنے دے زنداں میں مجھے
دامنِ شوق مرا جانبِ گلزار نہ کھینچ

تیر کو کھینچ، میں مانع نہیں، پر تیر کے ساتھ
دل تو سینے سے مرے، اے بتِ خونخوار نہ کھینچ

مصحفی جانے بھی دے اس بتِ ہرجائی کو
اس قدر اُس کے تجسّس میں تو آزار نہ کھینچ

۱۹۳

یوں ہے عارض کی جھلک زلفِ پریشاں کے بیچ
شمع روشن ہو کہیں جیسے شبستان کے بیچ

چمکے پھرتے تو ہو بازار میں مانندِ نگیں
دیکھیو حرف نہ آجائے کہیں شان کے بیچ

دلِ سی پارہ میں یوں عشق کے داغوں کی ہے شان
پرِ طاؤس ہوں جیسے کسی قرآن کے بیچ

ہے مگر رطب مزاجی سے خطر ریزش کا
شیشۂ مے نے جو رکھی ہے روئی کان کے بیچ

شورِ مرزائی کا بیجا نہیں اپنی کہ یہاں
جائے گل لختِ جگر رہتے ہیں گلدان کے بیچ

مصحفی یہ تو تلاشی تھی، اب اپنے ڈھب کی
اک غزل اور لکھا چاہیے دیوان کے بیچ

۱۹۴

کب کا اک عمر سے جھگڑا تھا دل و جان کے بیچ
کام دونوں کا کیا یار نے اک آن کے بیچ

جب کہ چہرے سے اٹھاتا ہے تو اے شوخ نقاب
برق پڑتی ہے ہمارے سر و سامان کے بیچ

شب کہیں گوشۂ ابرو کو ترے دیکھا تھا
سرمۂ عید کا اب تک ہے گریبان کے بیچ

خواب سے چونکے تو یاں ہم کو سفر پیش آیا
آنکھ کھلتے ہی پڑی بانگِ جرس کان کے بیچ

ہم سیہ بخت نہ کیوں خاک میں لوٹیں کہ وہاں
ربط اک تازہ ہوا ہے مسّی و پان کے بیچ

میں وہ بلبل ہوں کہ منقار سے اپنی جس نے
رخنے کر ڈالے ہیں دیوارِ گلستان کے بیچ

مجھ پہ گلگشتِ گلستاں کی نہ تہمت کیجو
مصحفی، لختِ جگر ہیں مرے دامان کے بیچ

۱۹۵

اک دن جو لے گئی مجھے وحشت چمن کے بیچ
چھپتا پھرا میں سایۂ سرو و سمن کے بیچ

کیا چہچہے تھے کرتے ہم اپنے چمن کے بیچ
ہوگا وہ دن جو پہنچیں گے پھر بھی وطن کے بیچ

اب جس سے چاہے اس سے میاں انکھڑیاں لڑا
یاں کام ہو چکا مژہ برہم زدن کے بیچ

تن تو کہاں ہے؟ شعلۂ فانوس کی طرح
اک آگ سی بھری ہے مرے پیرہن کے بیچ

اگلی پڑے ہے جیسے کہ شمشیرِ خوش غلاف
اب یہ زباں ٹھہرتی نہیں ہے دہن کے بیچ

وہ آپ سا بتا دے ہے، وہ آپ سا، تجھے
جھگڑا اپڑا ہے رنگ کا گل اور سمن کے بیچ

رسمِ دیارِ عشق کا کشتہ ہوں میں، کہ واں
جیتے کو گاڑ دیتے ہیں رکھ کر کفن کے بیچ

غافل تو آنکھ کھول کے سیرِ جہاں تو کر
جلوہ کیا ہے یار نے کس کس برن کے بیچ

مارے حیا کے ہم سے وہ کل بولتا نہ تھا
ہم چھیڑ چھاڑ کر اُسے لائے سخن کے بیچ

پروانہ ہو کے زخمی بہ تیغِ زبانِ شمع
ایسا گرا کہ جان ہی دی شب لگن کے بیچ

میں شمعِ بزمِ دہر ہوں، ان روز دل مصحفی
میرا ہی ذکرِ گرم ہے ہر انجمن کے بیچ

۱۹۶

دھجیاں پانو سے باندھیں ہم نے اس منزل کے بیچ
یہ خبر پہنچے اسے جو جا دے ہے محمل کے بیچ

میں وہ بسمل ہوں کسی کی تیغِ تیزِ شرم کا
قطرۂ خوں بھی نہیں کہنے کو جس بسمل کے بیچ

اس نگر کے رہنے والے کیا سبھی ہیں بے نوا
خاک بھی یاں تو نہ دیکھی کاسۂ سائل کے بیچ

رشک ہے اس مرغِ بسمل پر مجھے جو بعدِ ذبح
آپ کو پنہاں کرے ہے دامنِ قاتل کے بیچ

حق کے کہتے دار پر کیوں کھینچتے منصور کو
کچھ ممیّز فرق اگر کرتے حق و باطل کے بیچ

کیا خدائی ہے کہ اب در تک نہیں ہے اس کے بار
جس سے ہم زانو بہ زانو بیٹھیں تھے محفل کے بیچ

اُس سے ہم اک بات بھی کہنے نہ پائے مصحفیؔ
مرتے مرتے رہ گئی دل کی ہمارے، دل کے بیچ

ح

۱۹۷

دیکھ اس رشکِ پری کے باغ میں آنے کی طرح
گل گریباں پھاڑتے ہیں اپنے دیوانے کی طرح

تار رونے کا بندھا جب سے، مرا ہر ایک اشک
رشتہ دار آپس میں ہے تسبیح کے دانے کی طرح

گر چھوا ہو میں نے اس کی زلف کو تو ہم نشیں!
ہاتھ ساعد سے جدا ہو دے مرا شانے کی طرح

میں بھی ہوں اُس شعلۂ سرکش کا عاشق، آسماں
رات دن پھرتا ہے جس کے گرد پروانے کی طرح

تیشۂ فرہاد میرے ہاتھ آیا چاہیے
کس قدر دشوار ہے سر سے گزر جانے کی طرح؟

مُنہ چھپاتے ہو جو ہر دم مصحفیؔ کو دیکھ کر
کس سے سیکھی ہے میاں! یہ تم نے شرمانے کی طرح؟

۱۹۸

سحر ہے، رُخ پر ترے زلفوں کے بل کھانے کی طرح
سیکھے کوئی تجھ سے، پیارے! دل کے لے جانے کی طرح

اس میں گو جل جاویں یا مر جاویں ہونا ہو سو ہو
چومنا مُنہ شعلہ رُو کا ہم کو پروانے کی طرح

پان کھانے پر کرو ہو اس کے یارو! کیا نگاہ
اک ذرا دیکھو مرے بھی خونِ دل کھانے کی طرح

سن کے میرا ماتمی قصّہ لگا رونے وہ رات
مرثیے سے بسکہ مانا تھی اس افسانے کی طرح

گاہ حصّے میں مرے گا ہے بکامِ دیگرے
ساری اس کی چشم میں نکلے ہے پیمانے کی طرح

جب مرا دل، دام میں زلفوں کے اُس کی پھنس گیا
اور کچھ آئی نظر تب خویش و بیگانے کی طرح

یار کے وقتِ تماشا، قابلِ تصویر ہے — مثلِ آئینہ مرے حیران رہ جانے کی طرح
گہہ شگافِ در سے، گہہ روزن سے کرتا ہے نگاہ — یاد ہیں کتنی ہی اس کو آنکھیں پھڑکانے کی طرح
شیخ جی! تم بھی عجب خر ہو، بھلا سمجھو تو بات — دانۂ انگور کھاتا ہے کوئی دانے کی طرح

پھر گئیں کیا جانے کیوں ہم سے وہ زلفیں مصحفی
ہم تو رکھتے تھے دل ان کا ہاتھ میں شانے کی طرح

۱۹۹

شہر آتا ہے نظر پُر گرد، ویرانے کی طرح — رہ گئی یاں کونسی، اب جی کے بہلانے کی طرح
تھی بلا گرداں شمع روے گل شب تا سحر — آخر آخر جی دیا بلبل نے، پروانے کی طرح
کیا سمجھ کر ہم نے یارب سالہا سجدہ کیا — جس جگہ کعبے کی صورت تھی نہ بتخانے کی طرح
کل جو رستے میں وہ ناگہ مل گیا، تھی دیدنی — میرے رہ جانے کی وضع اور اُس کے رک جانے کی طرح

رنگ گل کرتا ہے آخر یاد اگر ہوتی تمھیں
خاک اور خوں میں کسی بسمل کے تڑپانے کی طرح

۲۰۰

شاخِ گل گو کہ لچکتی ہے قدِ یار کی طرح — پر کہاں اس میں بہار اُس گلِ رخسار کی طرح
کس کے مقتولوں کا یارب یہ چمن مشہد ہے — نظر آتے ہیں جو گل سینۂ افگار کی طرح
دیکھیے اب کے تپِ عشق سے کیوں کر بچیے — بے طرح سی نظر آتی ہے اس آزار کی طرح
کیا چرایا تھا ترا اس نے؟ قفا پر، پیارے! — ہاتھ کیوں باندھے ہیں کاکل کے گنہگار کی طرح؟
غیر سے شب اُسے خلوت رہی، اور ہم تا صبح — رہے حیران کھڑے صورتِ دیوار کی طرح
تھا گھمنڈ ابرِ بہاری کو بہت رونے کا — پر نہ رو پایا وہ مرے دیدۂ خونبار کی طرح
ہو چکا کب کا گریباں تو، مگر ہیں باقی — تار دو چار گلے میں مرے زنّار کی طرح
دام میں زلف کے، کیا پوچھو ہو نقشا دل کا — کیا کہیں دیکھی نہیں مرغِ گرفتار کی طرح؟

ہیں طرحدار تو دنیا میں بہت پر واللہ
مصحفیؔ آفتِ جاں ہے مرے خونخوار کی طرح

خ

۲۰۱

کہتا ہے کون ہاتھ ہیں اس کے حنا سے سرخ
میں دیکھتا ہوں ان کو تو ہیں ابتدا سے سرخ

آتے ہی کچھ خزاں کے عجب زرد ہو چلے
چہرے گلوں کے، ہو کے چمن کی ہوا سے سرخ

دریائے خونِ خلق میں پیرا ہے نیرا رخش
پا نو اُس کے سینے تک نہیں رنگِ حنا سے سرخ

ہم مارے انفعال کے کل آب ہو گئے
دیکھا جو رنگ چہرے کا اُس کے حیا سے سرخ

اے بت ہزار شکر، کہ ہم اپنے خون میں
چاہیں تھے دست و تیغ کو تیرے، خدا سے سرخ

دل جی اٹھے ہے جنبشِ دامن میں یار کی
جیسے دہک کے ہو کبھی اخگر ہوا سے سرخ

یہ بھی عجب مزہ ہے کہ تڑپوں ہیں خون میں
دشمن کا مُنہ نہ ہو تری تیغِ جفا سے سرخ

خوں ریزیوں سے ہاتھ اٹھا اب تو، اے فلک!
صحرا کے صحرا ہیں تری تیغِ جفا سے سرخ

کشتہ ہوں میں حنائی سر انگشت کا تری
فندق کہاں ہے غنچے کی ایسی ادا سے سرخ

یہ کیا بلا ہے دیدۂ خوں بار میں مرے؟
جو ہو گیا ہے رنگِ فلک اس گھٹا سے سرخ

گریے کا رنگ اپنے تو معلوم ہو ہمیں
دو چار قطرے اشک کے ٹپکیں بلا سے سرخ

رہتی ہے خونِ دل پہ معاش اپنی، مصحفیؔ
ہے رنگِ چہرہ اپنا تو اس کیمیا سے سرخ

۲۰۲

لگائے ہاتھ کوئی اس بدن کو کیا گستاخ
نہ جس بدن کو لگی ہو کبھی ہوا گستاخ

میں چھیڑتا ہوں جو اُس کو، کہے ہے کٹ کے رقیب
"قدیم سے ہے تمھارا یہ آشنا گستاخ"

یہ برگِ گل نہیں، ہیں بلبلوں کے لختِ جگر — قدم نہ رکھیو خیاباں میں، اے صبا! گستاخ
میں دیکھتا ہوں جو شانے کو اس کی زلفوں میں — کہوں ہوں یوں ہی کبھی میرا ہاتھ تھا گستاخ
کبھی لپٹتی ہے، گاہ اس کے بوسے لیتی ہے — ہے تیرے رخ سے تری زلف بھی بلا گستاخ
میں رکھ دیا جو سر اپنا شب اُس کے زانو پر — کہا یہ ہنس کے "تو اب اتنا ہو گیا گستاخ!"
مجھے یہ ڈر ہے کہ صحبت بگڑ نہ جائے کہیں — ہوئی ہے اُس کفِ نازک سے پھر حنا گستاخ
سنا ہے مصحفی میں جب سے شعر عرفی کا — ہمیشہ ہاتھ گریباں سے ہے مرا گستاخ

"بسا عتے کہ کشائی قبا بیاد آور
کہ می کشاد کسے بندِ ایں قبا گستاخ"

۲۰۳

مہندی سے دستِ یار، سپید و سیاہ و سرخ — ہیں برگِ لالہ وار، سپید و سیاہ و سرخ
کیا رنگ تھا یہ تجھ سے کہ آنسو گریں تھے رات؟ — اے چشمِ اشکبار! سپید و سیاہ و سرخ
اُس چشمِ پُرخمار کے صدقے کہ اک جگہ — دیکھی نہ تھی بہار، سپید و سیاہ و سرخ
نکلی جو تیغِ قہر تری، آہوے حرم — لاکھوں ہوئے شکار، سپید و سیاہ و سرخ
یہ صدمے گزرے دل پہ، کہ ہو ہو گیا مرا — چہرہ ہزار بار، سپید و سیاہ و سرخ
اب تو وہی غنی ہے زمانے میں جس کے پاس — پل ہوویں بے شمار سپید و سیاہ و سرخ
دیکھا نہ تیرے رنگ کا ایک اس چمن کے بیچ — یوں پھول ہیں ہزار سپید و سیاہ و سرخ

اے مصحفی زمانہ وہ مارِ سہ رنگ ہے
ہیں جس کے نت نگار سپید و سیاہ و سرخ

۲۰۴

آتے ہی جب مچائی ہے اس نے چمن میں چخ — دیکھ اس کو ہو گیا ہے گُلِ تر کا رنگ فخ
جب تک کہ آنسوؤں کا ہمارے ہے افشرہ — ان منعموں کے ہم نہیں محتاجِ آبِ یخ

نازک کمر کو اس کی رگِ گل تو کیا کہوں — شرمندہ ہو ہے جس کی نزاکت کو دیکھ نخ
کرتا ہوں جب بیاں میں کبھی اس کی زلف کا — شانہ ہر ایک بات میں گاوے ہے نخ کی شخ

مردودِ آسمان و زمیں ہے وہ مصحفی
لاشے کو جس کے بو نہ کریں مور اور ملخ

د

۲۰۵

تھی آب، دم اُس کے میں میاں بس کہ بلا سرد — بسمل ترا لگتے ہی تو خنجر کے ہوا سرد
گرمی سے تپِ عشق کی آ جی پہ بنی ہے — الفت سے بتاں کی کہے اب دل کو خدا سرد
اس دستِ نگاریں سے ہوا سوزِ دل افزوں — مشہور غلط یہ ہے کہ ہوتی ہے حنا سرد
ہم جس سے ملے جا کے خنک ہی اسے پایا — ہے آج کل از بس کہ زمانے کی ہوا سرد

اے مصحفی کیا کہیے دلِ گرم کی تیرے
اتنا تو مری جان! یہ زنہار نہ تھا سرد

۲۰۶

ہر چند رہی نت ترے کوچے کی ہوا سرد — تو بھی ترے ملنے سے دل اپنا نہ ہوا سرد
دل جلتا ہے، "لاؤ وہی کھا جاؤں" بلا سے — کافور کو کہتے ہیں کہ ہوتا ہے بلا سرد
میں آنکھوں میں لا کر وہیں کل پی گیا آنسو — ہر چند کہ اتنا بھی تو یہ آب نہ تھا سرد
دیکھا ہے مگر صبح دم اس گل کو چمن میں — جو آج نپٹ بھرتی ہے دم بادِ صبا سرد
گرمی پہ نہ آیا دلِ افسردہ ہمارا — ہر گز نہ کرے بندے کو اتنا بھی خدا سرد
ہر چند کہ فردوس میں سب کچھ ہے ولیکن — دیواروں کے یہ سایے کہاں اور یہ ہوا سرد
کیوں تپ میں مجھے خونِ جگر غم نے پلایا — تپ والوں کو دنیا میں تو دیتے ہیں دوا سرد

ہاتھوں نے ترے اُس کو ذرا گرم کیا ہے ۔۔۔ تھی ورنہ مری جانِ طبیعت میں خنا سرد

اے مصحفیؔ تھا ہم کو بڑا تیرا بھروسا
اک زخم کے لگتے ہی میاں تو تو ہوا سرد

۲۰۷

غیر سے آشنائیاں تا چند؟ ۔۔۔ دیکھیں یہ بیوفائیاں تا چند؟
نالہ پُر بے اثر ہے ہم بیمار ۔۔۔ آہ! تیری رسائیاں تا چند؟
ہنس کے بولو کبھی تو ہم سے، میاں! ۔۔۔ جھڑکیاں اور رکھائیاں تا چند؟
میرے اور اس کے دیکھیں، رہتی ہیں ۔۔۔ درمیاں میں جدائیاں تا چند؟
میری طاقت پہ کر نگاہ، اے دوست! ۔۔۔ نت کی زور آزمائیاں تا چند؟

بھوں چڑھاؤ نہ مصحفیؔ پہ میاں
اس سے یہ کج ادائیاں تا چند؟

۲۰۸

دانتوں کے روبرو ہوئی سلکِ گہر سپید ۔۔۔ آگے لبوں کے جن کے نہ ہووے شکر سپید
کاغذ سمجھ کے اُس پہ بھی ہم کچھ کریں رقم ۔۔۔ ہوں مرغِ نامہ بر کے اگر بال و پر سپید
کرتا ہے ماہ مثلِ کتاں چاک پیرہن ۔۔۔ جب بر میں کپڑے پہنے ہے وہ سیم بر سپید
اے شامِ ہجر! اب تو کہیں رُو سیاہ کر ۔۔۔ بس روتے روتے ہو تو گئیں چشمِ تر سپید
بے رنگ ہو گئے ہیں، کچھ اس کا عجب نہیں ۔۔۔ لالہ ہماری خاک سے پیدا ہو گر سپید
اوّل سیاہ روئی کا کر شیخ کچھ علاج ۔۔۔ صابن سے دھو دھو داڑھی کو اتنا نہ کر سپید
رو کش جو ہووے صبح بنا گوشِ یار سے ۔۔۔ ہے برگِ نسترن! تو کہاں اس قدر سپید؟
چہرے پہ ایک کے تو نہ پایا وفا کا رنگ ۔۔۔ اہلِ جہاں کا خون ہوا سر بسر سپید
ہو کر سپید پوش تو، آ پشتِ بام پر ۔۔۔ ہے چاندنی سے دیکھ تو کیا بحر و بر سپید

سنتا ہے مصحفی تو نہ کھو ان کو رائیگاں
تیرا ہر اشکِ لال ہے اے بے خبر سپید

۲۰۹

اے دل سپیدی آئی، ہوئے موے سر سپید
رو رو کے اب تو نامۂ اعمال کر سپید

خوں خشک ہو گیا مرا یاں تک کہ وقتِ فصد
نکلا رگِ جگر سے مری نیشتر سپید

یعقوب یوں کہے ہے کہ یوسف سے یہ کہو
وہیں اے پسر ترے لیے چشمِ پدر سپید

گویا کہ قطرہ خون نہیں اس میں دیکھیو
چہرہ مریض کا ہے ترے کس قدر سپید!

تجھ بن یہ رنگ ہے، مری چشمِ پُر آب کا
ہووے کسی کا جیسے سپیدی سے گھر سپید

از بس سیاہی اس کی نہ اس سے جدا ہوئی
دیکھا نہ میں کبھی رخِ داغِ جگر سپید

اے اشکِ سرخ! کھینچیو ٹک اور بھی مدد
تھوڑا سا رہ گیا ہے یہ تارِ نظر سپید

ہم رفتہ رفتہ غم میں ترے پیر ہو گئے
اہلِ سفر کو جیسے کہ کر دے سفر سپید

تعریف کیا کروں ترے دانتوں کی آب کی
اس آب و تاب پر نہیں آبِ گہر سپید

ہو جاویں کل کو لال تو اس کی خبر نہیں
اب تک تو میرے اشک ہیں جیسے گہر سپید

اے مصحفی فراق میں مت ڈھونڈ روشنی
دیکھی ہے کس نے وصل کی شب کی سحر سپید؟

۲۱۰

نہ تو مے لعلِ یار کے مانند
نہ گل اس کے عذار کے مانند

گرچہ گل ہے ہزار کے مانند
پر کہاں گل عذار کے مانند

ہے خوش آیند یار کا آنا
موسمِ نو بہار کے مانند

خوں میں تڑپا ہے کو نسا بسمل
اس دلِ بے قرار کے مانند

پھر گئیں ہم سے یار کی آنکھیں
گردشِ روزگار کے مانند

جگرِ لالہ داغ ہے ، میرے — جگرِ داغدار کے مانند

رختِ ہستی پہ خوش نہ ہو، کہ یہ ہے — جامۂ مستعار کے مانند

کوئی ناخن لگا جگر پہ مرے — تو وہ بولے گا تار کے مانند

مل کے دشمن مرے چڑھ آئے ہیں — مجھ پہ سارے گہار کے مانند

میری آنکھوں میں سرو، اُس قدبن — نظر آتے ہیں دار کے مانند

گرچہ ہے زلف لامِ نستعلیق — خط ہے خطِ غبار کے مانند

نہیں عاشق کے حق میں لذّتِ وصل — لذّتِ انتظار کے مانند

دیکھ اُس گل کو جب میں کرتا ہوں — ق — گریہ ابرِ بہار کے مانند

اشک آنکھوں سے میری گرتے ہیں — دانہ ہائے انار کے مانند

مصحفیؔ خاکِ راہ کس کا تھا؟

اڑ گیا جو غبار کے مانند

۲۱۱

زلف ہے گرچہ مار کے مانند — رخ ہے نقش و نگار کے مانند

یاالٰہی دعا میں کس کی ہے؟ — ہاتھ میرا چنار کے مانند

اس میں کشتی نہ لا کہ ہیں یہ سرشک — قلزمِ بے کنار کے مانند

دلق آتش پہ رکھ کہ ہو جاوے — حُلّۂ زر نگار کے مانند

نہیں تیغِ ولایتی کا خم — خمِ ابروے یار کے مانند

آخرِ عیشِ لذّتِ دُنیا — ہے نشے کے اُتار کے مانند

وہ ہے عاشق جو رکھ دے سر تہِ تیغ — عاشقِ سر گزار کے مانند

چھیڑ لو مت کہ یہ دلِ صد چاک — کِھل رہا ہے انار کے مانند

دل سلگتا ہے کیا مگر میرا — ق — اندک اندک شرار کے مانند

جو دھواں سا جگر سے اٹھتا ہے — ناتواں ہے غبار کے مانند

نوک سبزے کی اس چمن کے، مرے
دل میں چبھتی ہے خار کے مانند

تربتِ مصحفی کو دیکھا کل
ڈھیر تھا اک مزار کے مانند

۲۱۲

کیے جس ڈھب سے اس نے چاکِ در بند
وہ کرتا کاش! یہ چاکِ جگر بند

بتاں! کاوش سے پلکوں کی تمھارے
ہے یاں رگ رگ میں میری نیشتر بند

زبس خونِ غلیظ آنکھوں سے آیا
ہوئیں آخر بہم مژگانِ تر بند

ہم اور دل یوں گرفتارِ بلا ہیں
بہم دو مرغ کے ہوں جیسے پر بند

غرور اُس کو لفافے پر نہ لایا
لکھا بھی خط تو کر بھیجا کمر بند

کئی دن سے پھر اب کچھ ہو گئی ہے
رہِ آمد شدِ پیغامبر بند

بصد خوبی دہانِ تنگ اُس کا
رہا پیوستہ جوں درجِ گہر بند

تری بالیں پہ بیٹھا ہے مسیحا
ابھی اے مصحفی آنکھیں نہ کر بند

۲۱۳

کیا عالم کے مُنہ پر جس نے در بند
فراغت سے وہ بیٹھا چشم کر بند

گئے وے دن کہ اشک آتے تھے، اب تو
گرے ہے کٹ کٹ آنکھوں سے جگر بند

نہیں ہوتا جو دل تو چٹکیوں میں
مَلا کرتا ہے وہ دو دو پہر بند

بہار آئی خبر لے ان کی صیّاد
قفس میں تھے ہمارے مشتِ پر بند

اجابت تک دعا کس رہ سے جاوے
درِ افلاک ہیں شام و سحر بند

کہیں کل چاکِ در سے جھانکتا تھا
رہی تا دیر واں میری نظر بند

مجھے اے مصحفی لکھنے ہیں اشعار ق
ذرا اُس تاؤ کے توڑے کے کر بند

ولیکن قطع میں چھوٹے نہ ہوویں
برابر ہاتھ کے ہو راست ہر بند

۲۱۴

بہت کیں ہم نے اپنی چشمِ تر بند ‏ ‏ ہوا لیکن نہ خونابِ جگر بند
مرے سینے میں دل بے تابیوں سے ‏ ‏ پھڑکتا ہے پڑا جوں مرغِ پر بند
کیا جب ٹکڑے ٹکڑے اُس نے ہم کو ‏ ‏ پڑا تڑپا کیا لوہو میں ہر بند
کمر باندھے ہے میرے خوں پہ ہر دم ‏ ‏ وہ کافر کر کے زلفوں کو کمر بند
کیا کیوں پرزے پرزے اس نے قاصد! ‏ ‏ مرے نامے کا تو تھا مختصر بند
چلی ہے شب جہاں اس زلف کی یاد ‏ ‏ سحر واں رہ گئے ہیں گھر کے گھر بند
مری آنکھوں سے باہر کیونکہ جاوے ‏ ‏ کہ طفلِ اشک ہے میرا نظر بند
دمِ شمشیرِ تیغِ ناز اُس کا ‏ ‏ ہوا ہے دل پہ میرے آن کر بند

دریغ اے مصحفیؔ ہم نے شبِ وصل
نہ کی راہِ شبخونِ سحر بند

۲۱۵

پھڑک کر کیا کرے وہ مرغِ پر بند ‏ ‏ قفس کا جس کے نت رہتا ہو در بند
ہے گل دامِ نگاہِ عشق بازاں ‏ ‏ یہ بلبل چشم کا تیرا کمر بند
مری آنکھوں میں یوں پھرتا ہے وہ شوخ ‏ ‏ کسی کو جیسے رکھتے ہیں نظر بند
تری پلکوں کی نازک کاریوں سے ‏ ‏ منبّت ہے تمام اپنا جگر بند
لگائی جب حنا ہاتھوں پر اُس نے ‏ ‏ کیا عالم کا دل خوں منبّت کر بند
یہ بسمل کس کا کشتہ ہے کہ جس کا ‏ ‏ تڑپتا ہے پڑا لوہو میں ہر بند؟
کھلے بندوں گر آ بیٹھے وہ در پر ‏ ‏ عجب کیا ہے کہ ہو جا رہگزر بند

فسانہ رہ گیا دنیا میں باقی — نہ اسکندر رہا، نے اس کا دربند

نہیں زلفوں کے حلقوں میں وہ رخسار
ہوئے ہیں مصحفیؔ شمس و قمر بند

۲۱۶

اگر کھولے چمن میں اپنے تو بند — وہیں بہنے سے ہو جا آبجو بند

زمیں صیدِ قمرغہ کا ہے میداں — سفر کی راہ ہے یاں چار سو بند

شگفتہ ہی نہیں ہوتا کسی طرح — کہے تو دل مرا پارہ ہے بو بند

کہیں ہیں، دل میں عاشق کے گرہ ہے — غلط، ہووے گی کوئی آرزو بند

نہیں مقدور یاں دم مارنے کا — زباں اپنی ہے تیرے روبرو بند

کوئی تیرا گریباں گیر ہو گا — دراز اتنے نہ رکھ جامے کے تو بند

کی اُن نے روزنِ در کر، گِل اندود — نگاہوں کی بھی راہِ جستجو بند

کیا تھا مصحفیؔ کے زخمِ دل کو — ق — ابھی جرّاح نے کر کے رفو بند

سو کر دٹ میں وہ ٹانکا کھُل گیا ہے
نہیں ہوتا ہنوز اس کا لہو بند

۲۱۷

کیے اس گل نے جوں جامے کے وا بند — چمن کا دو ہیں رستہ ہو گیا بند

پڑھی زنجیریں ہیں پاؤں میں جن کے — دل ان لوگوں کی الفت کا ہے پابند

چمن میں کس کے آنے سے ہوئی ہے — رہِ آمد شدِ بادِ صبا بند؟

دعا میری بھی کیا بر وقت پہنچی! — اجابت کا سحر در ہووے تھا بند

جو کوئی وصل کا طالب ہو، خوباں — کریں ہیں تیغ سے اس کے جدا بند

لے ڈالیں ہیں دل کو چٹکیوں میں — قیامت ہیں یہ طفلانِ حنا بند

چمن میں مصحفیؔ سا دل گرفتہ
مگر آیا جو ہو گئی ہے ہوا بند

۲۱۸

کہاں تک پھریں اُڑتے اِدھر اُدھر اِ صیّادا | تری ہی نذر ہیں اب لے یہ مشتِ پر صیّاد
جنھوں کے دل میں رہا تیری وضع سے کھٹکا | نہ سوئے سایۂ گل میں وہ نیند بھر صیّاد
نہ ذوقِ شبنم و گل بھولیں ہم اسیری میں | بجائے دانہ کھلادے اگر گہر صیّاد
کہاں وہ سینہ، کہاں وہ دل اور کہاں وہ جگر | جو تیرے ناوکِ مژگاں کا ہو سپر صیّاد.
قرا ولی تری آنکھوں سے سیکھ جاتے ہیں | ہیں وے جو حق میں غزالوں کے فتنہ گر صیّاد
وہ خوں گرفتہ ہوا کون قابلِ فتراک ؟ | جو آج دامنِ زیں ہے بہار پر صیّاد
خدا کے واسطے چوبِ قفس کو سرخ نہ کر | ہمارے خون پہ باندھے ہے کیوں کمر صیّاد
ہزار حیف ہے اس عندلیبِ غافل پر | کہ آیا جس کے اوپر وقت بے خبر صیّاد
طیور اب ترے ہاتھوں سے کیونکہ ہوں جاں بر | جفا و جور کرے جب تو اس قدر صیّاد
چمن میں کونسا ہے آشیانۂ بلبل | کہ جس میں تو ہو بھرے نئیں پڑے ہیں پر صیّاد

پھر اور کیا ہے سبب مرغِ دل کی وحشت کا؟
نظر پڑا کوئی اے مصحفیؔ مگر صیّاد

۲۱۹

کیا غم مجھے، گو ہووے قفس کا مرے در بند | اُڑ جاؤں قفس لے کے، نہ ہوں گر مرے پر بند
نے جاوے کوئی یاں سے نہ واں سے کوئی آوے | ہے شہرِ بتاں کی رہِ پیغام و خبر بند
ممکن نہیں ہم دیکھ سکیں اور طرف کو | کر رکھا ہے آنکھوں نے تری ہم کو نظر بند
ہوتا ہوں تصوّر میں ترے جب کہ مراقب | رہتی ہیں میاں آنکھیں مری دو دو پہر بند
موتی ہی نکالیں گے اگر کھولیں گے ان کو | مانندِ صدف اب تو ہیں یہ دیدۂ تر بند

آساں نہیں اس زلف کے حلقوں سے رہائی　　جس زلف کے حلقوں میں کہ ہوں شمس و قمر بند

تنبیہہ ہیں کیونکہ نہ ہووے کہ نظر میں
لگتا ہے چھری سا یہ ترے جامے کا ہر بند

ذ

۲۲۰

ہم نے بھیجا جو کبھی یار کو لکھ کر کاغذ　　گیا برباد ہی مانندِ کبوتر کاغذ
کیا کروں یوں تو تو پڑھتا ہی نہیں خط میرا　　ہاں مگر لکھ کے لگا دوں ترے در پر کاغذ
نامہ قاصد نے دیا اس کو جو میرا تو کہا　　"ایسے رہتے ہیں پڑے راہ میں اکثر کاغذ"
یوں تنگوں میں لگا دیتا ہے تو ناوکِ ناز　　خط ہی لکھنے کو نہیں تجھ کو میسّر کاغذ!
نامۂ شوق جو ہر دم ہی لکھا کیجے گا　　لکھتے لکھتے یونہیں ہو جاوے کا دفتر کاغذ
ہو گئے لختِ جگر آہ سے یوں آوارہ　　جنبشِ بادِ سے جوں گل کے ہوں ابتر کاغذ

مصحفی لکھ ورقِ دل پہ تو اس کی تصویر
اس سے دنیا میں نہیں اور کوئی بہتر کاغذ

۲۲۱

شوق سے لکھیے اگر جانبِ جاناں کاغذ　　ہو کبوتر کی طرح آپ پر افشاں کاغذ
ہم فقیروں کو تو کیا چاہیے افشاں کاغذ　　خط لکھیں اس کو اگر ہو کوئی بھگواں کاغذ
پرزے پرزے جو کوئی ہو سو لکھے نامۂ شوق　　بھیجنا یار کو ایسا نہیں آساں کاغذ
لکھ کے رونے کا سخن اس کو اڑا دیجے اگر　　ابر کی طرح ہوا میں کرے طوفاں کاغذ
خط پہ خط منت جو لکھے جاتے ہیں معشوقوں کو　　شہرِ عشّاق میں کیا ہو گئے ارزاں کاغذ
دردمنداں کا ترے نامہ جو پہنچے تجھ تک　　کھولے اس کو تو کرے نالہ و افغاں کاغذ

خط لکھوں اس کو اور افسوس نہ ہووے تزئیں — خون رو رو کے کیا چاہیے افشاں کاغذ
ان پہ کیا کیا نہ حکایت ہیں لکھی سرخی سے — لختِ دل کے ہوئے سب، صرف گلستاں کاغذ

مصحفیؔ نام ہے دیوان کا، ہاں ہیں تو سہی
ورقِ گل کی طرح چند پریشاں کاغذ

۲۲۲

کہتے ہیں وصل کی شب جس کو، سو وہ رات ہے شاذ — ساتھ عاشق کے غرض اُس کی ملاقات ہے شاذ
رہ میں ہر چند کہ مل جاوے وے از رہِ لطف — پوچھے وہ بات مری گا ہے، سو یہ بات ہے شاذ
مدعی! پھر کبھی عرصے میں نہ آنا ہرگز — یار بیلیں اسے کہتے ہیں کہ یہ مات ہے شاذ
شور ہے اشک کے باراں کا مرے، عالم میں — چشم وا کیجے تو البتہ یہ برسات ہے شاذ

مصحفیؔ صرف نہ کر اُس پہ تو اوقات کہ واں
مطّرد ہے ستم اور لطف و عنایات ہے شاذ

ر

۲۲۳

بہارِ گل نہ رہی اس قدر چمن میں دیر — کہ بیٹھے دل زدہ کوئی سایۂ سمن میں دیر
ہوا تو آ کے سب اسبابِ غسل آمادہ — شہیدِ عشق کے پھر کیا ہے اب کفن میں دیر
مری مجال ہے مل کر اُٹھوں نہ واں سے شتاب — ملک نہ بیٹھ سکے جس کی انجمن میں دیر
میں لکھ کے خط کوئی قاصد وطن کو گر بھیجا — لگائی اس نے بھی جا کر بہت وطن میں دیر
بھلا تمیز تو کر بوئے مشک و گیسو میں — رہی ہے، بادِ صبا! تو بھی تو ختن میں دیر
میں اس پتنگ کے جی دینے کا ہوں دیوانہ — جو گر کے شمع سے تڑپا کیا لگن میں دیر
میاں! نہ تیغ علم کیجیو، کہ کہتے ہیں — ابھی جراحتِ دل کے ہے بہ شدن میں دیر

میں سینہ چاکی گل تجھ کو دیکھ لیتا، ہائے! رہا نہ ہاتھ مرا چاکِ پیرہن میں دیر
یہ عشق وہ ہے کہ جب اپنے وعدے پر آیا ہوئی نہ تیشے سے پھر قتل کوہکن میں دیر
خط آئے پر بھی نہ چھوٹا مرا دلِ قیدی رہا اسیر تری زلفِ پُر شکن میں دیر
رفوئے چاکِ گریبانِ گل کر، اے ناصح! ابھی ہمارے تو ہے چاکِ پیرہن میں دیر

گئے کہاں تھے، میاں مصحفیؔ، بتاؤ تو
لگائی رات بہت تم نے انجمن میں دیر

۲۲۴

اس تیغ زن کو، یارو! مرے دل سے کیا خبر؟ قاتل کو بیقراریِ بسمل سے کیا خبر؟
بیدل جو کوئی ہو تو اسے دل سے کیا خبر؟ ڈوبے ہوئے کو بحر کے ساحل سے کیا خبر؟
ہم کو تو مار ذبح کیا، اس کے ہجر نے قاصد تو کہہ تو لایا ہے قاتل سے کیا خبر؟
منہ اُٹھ گیا جدھر کو اُدھر ہی چلے گئے آوارگانِ شوق کو منزل سے کیا خبر؟
پوچھو نہ جا کے شیخ سے یہ مسئلہ کوئی اس بے تمیز کو حق و باطل سے کیا خبر
مجنونِ دشت گرد ہی واقف جو ہو تو ہو ہر راہ رو کو لیلیٰ کے محمل سے کیا خبر

شمعِ شبِ فراق بنے ہم تو مصحفیؔ
ہم دل جلوں کو عیش کی محفل سے کیا خبر

۲۲۵

آخر گئے ہی تجھ کو وہ بے وفا سمجھ کر تیری گلی میں عاشق آئے تھے کیا سمجھ کر.
کافر مجھے نہ کہیو، اے مومنانِ صادق! کرتا ہوں بت کو سجدہ میں تو خدا سمجھ کر
نامے کو اُس کے پڑھ کر اوّل تو خوش ہوا تھا آخر کو رو دیا میں کچھ مدّعا سمجھ کر
ایسا نہ ہو کہ جاوے برباد خاکِ عاشق رکھیو گلی میں اُس کی پاؤں، اے صبا! سمجھ کر
بیگانگی سے اس کی واقف نہ تھا میں ہرگز میں اس کو دل دیا تھا یار آشنا سمجھ کر

ہم نے تو حال دل کا سب خوب ہی لکھا ہے — من بعد مرگ لیکن کس نے پڑھا سمجھ کر؟
نظروں میں ایک بوسہ مانگا تھا ہم نے اس سے — اس نے بھی زیرِ لب ہی کچھ کچھ کہا سمجھ کر
زلفوں سے اس کی مل کر شانے نے خط اٹھایا — ہم ڈر کے دُور بھاگے اُن کو بلا سمجھ کر
اے مصحفی وہاں سے جیتا نہ کوئی آیا
اس کی گلی میں، پیارے! جا ہے تو جا سمجھ کر

۲۲۶

راتوں کو تو گلیوں میں نہ اے ماہ لقا! پھر — باز آ کہیں ان چالوں سے، از بہرِ خدا پھر
اپنا بھی یہ چہرہ گلِ خورشید کے مانند — رخِ یار کا جیدھر گیا اودھر ہی گیا پھر
گر رخصتِ یک آہ میں لی دل سے تو، یارو! — دیکھو گے کہ جاوے گی زمانے کی ہوا پھر
یہ دیدۂ تر دے ہیں کہ گر جوش پر آویں — دریا کو کہیں "تو مری لہروں میں بہا پھر"
اے مصحفی رسوائی ہے ان باتوں میں، ناداں
جوں سایہ تو اس شوخ کے پیچھے نہ لگا پھر

۲۲۷

سر کھول کے، کافر! نہ نہا نہر کے اوپر — ان باتوں سے آوے گی بلا شہر کے اوپر
دیکھو گے یہ سب سلسلے ہو جائیں گے برہم — گر آ گئی وہ زلفِ سیہ لہر کے اوپر
بے طرح جھڑی باندھی ہے اس دیدۂ تر نے — طوفان نہ نازل ہو کہیں دہر کے اوپر
یہ بھی کوئی غصہ ہے، مری جان کھپے ہے — کم بخت پڑے قہر ترے قہر کے اوپر
اے مصحفی ہے لذتِ دنیا سمِ قاتل
کس واسطے مرتا ہے تو اس زہر کے اوپر

۲۲۸

ہے اس کی آئینے میں، خط و خال پر نظر — کرتا ہے کب ہمارے وہ احوال پر نظر

اٹھکھیلیوں سے کتنوں کو پامال کر دیا
کیجو خدا کے واسطے اس چال پر نظر

گر دیکھیے بہار، دلِ داغ داغ کی
طاؤس کے نہ کیجے پر و بال پر نظر

اک حشرِ تازہ ہووے گا دیوانِ حشر میں
جب ہم کریں گے نامۂ اعمال پر نظر

قلیاں ہوا ہے جب سے لبِ یار کا ندیم
مشتاقِ بوسہ رکھتے ہیں مُنہنال پر نظر

رو رو کے خونِ دل شفقی اُس کو کر دیا
ٹک چشمِ تر کے کیجیو رومال پر نظر

اتنا یہ دل غنی ہے، کہ بندے کی مصحفیؔ
نے چشمِ جاہ پر، نہ زر و مال پر نظر

۲۲۹

یار! یہ دونوں اگر کم ہوں تو کم ہی بہتر
نہ ترا پیار بھلا اور نہ ستم ہی بہتر

راستی خوب تو ہے لیک نہ ہر جا، اے دل!
اس کی وہ زلفِ گرہ گیر تو خم ہی بہتر

سر بچا کر جو تری تیغ کا لے ہاتھ پہ وار
وائے! اس ہاتھ پہ وہ ہاتھ قلم ہی بہتر

وصل میں ہجر کا دھڑکا ہی لگا رہتا ہے
ایسی شادی سے، دلا! ہم کو وہ غم ہی بہتر

یک دو دم بیش نہیں گلشنِ ہستی کی بہار
اس سے تو سیرِ گلستانِ عدم ہی بہتر

اور نافہم کوئی جان مری! کیا سمجھے
کہ سمجھتے ہیں تری بات کو ہم ہی بہتر

مصحفیؔ، خارِ گلستاں میں کہاں ایسی بہار
اشکِ گلگوں سے تری ہر مژہ نم ہی بہتر

۲۳۰

مقتل میں لائی جب مجھے تقدیر کھینچ کر
جلاد سر پہ آ گیا شمشیر کھینچ کر

تھا دیدنی ہی حال مرا تب تو رہرواں
اُس کو، سے لے گئے مری تصویر کھینچ کر

کیا جانیں یہ سلوک؟ مریدوں کو راہ پر
لا دے نہ جب تلک کششِ پیر کھینچ کر

ان کی بھی کچھ خبر ہے تجھے، وے جو مر گئے
کوچے میں تیرے نالۂ شبگیر کھینچ کر

اس خوش مژہ کے سامنے جو کوئی آ گیا　　مارا کمانِ ابرو سے اک تیر کھینچ کر
پھر اس طرف کوئی نہ گیا جب کہ لے گئے　　اس کو سے میری لاش بہ تشہیر کھینچ کر
جاتا تھا اپنے پانو میں کاہے کو، مصحفیؔ
زنداں میں لے گئی مجھے زنجیر کھینچ کر

۲۳۱

لائی تو یاں تلک مجھے تقدیر کھینچ کر　　پھر دیر کیا ہے؟ آئیے شمشیر کھینچ کر!
صانع نے ہاتھ سے قلمِ صنع رکھ دیا　　اُس حسنِ لایزال کی تصویر کھینچ کر
میں کس قطار میں ہوں، جہاں مجھ سے سیکڑوں　　مر مر گئے اذیتِ زنجیر کھینچ کر
مت کھینچ سر کو تیر کے یوں ورنہ تو، میاں!　　پچھتائے گا جگر سے مرے تیر کھینچ کر
اس دشتِ پُر خطر میں بہت ہم سے ناتواں
رہ رہ گئے ہیں دامنِ رہ گیر کھینچ کر

۲۳۲

اس قدر بھی تو، مری جان! نہ ترسایا کر　　مل کے تنہا تو گلے سے کبھی لگ جایا کر
دیکھ کر ہم کو نہ پردے میں تو چھپ جایا کر　　ہم تو اپنے ہیں، میاں! غیر سے شرمایا کر
یہ بری خو ہے دلا! تجھ میں، خدا کی سوگند　　دیکھ اس بت کو تو حیران نہ رہ جایا کر
ہاتھ میرا بھی جو پہنچا تو میں سمجھوں گا خوب　　یہ انگوٹھا تو کسی اور کو دکھلایا کر
گر تو آتا نہیں ہے عالمِ بیداری میں　　خواب میں تو کبھی، اے راحتِ جاں! آیا کر
اے صبا! اوروں کی تربت پہ گل افشانی چند　　جانبِ گورِ غریباں بھی کبھی آیا کر
ہم بھی، اے جانِ من! اتنے تو نہیں ناکارہ　　کبھی کچھ کام تو ہم کو بھی تو فرمایا کر
تجھ کو کھا جائے گا اے مصحفیؔ! یہ غم اک روز
دل کے جانے کا تو اتنا بھی نہ غم کھایا کر

۲۳۳

یوں کہہ کے گیا دل "تو مجھے یاد کیا کر
بیٹھا ہوا غم میں مرے فریاد کیا کر"

یکبار اڑا دینے میں کیا لطف ہے صیّاد!
تو پوچھ کے ہم سے، ہمیں آزاد کیا کر

کیا ایسی حیا ہے، نہ تبسّم، نہ نگا ہے
گا ہے تو ہمارا بھی تو دل شاد کیا کر

ظاہر نہ کہا کر تو مرے قتل کو اس سے
آنکھوں میں اشارہ سوے جلّاد کیا کر

کیا خو ہے تری بادِ صبا! یہ بھی، پرے ہو
مت خاک ہماری کو تو برباد کیا کر

کیا ذکر ہے ہم، شیخ! تری باتوں میں آدیں
تو اپنے مریدوں ہی کو ارشاد کیا کر

ڈرتا ہوں کہ تیرا کہیں سینہ نہ تڑق جائے
اے مصحفی اس طرح نہ فریاد کیا کر

۲۳۴

باندھ آیا تھا کمر وہ دشمنِ جاں کھینچ کر
کتنا پچھتاتے ہیں ہم کل اس کا داماں کھینچ کر!

میں لگا سر پیٹنے کو، رات جس دم لے چلی
دل کو میرے خواہشِ زلفِ پریشاں کھینچ کر

آج اُس وحشی نے پھیری راہِ صحرا، ہم جسے
کل بخواری لے گئے تھے تا بہ زنداں کھینچ کر

رحم کر گورِ غریباں کی بھی مشتِ خاک پر
چل نہ یوں دامن کو، اے سروِ خراماں! کھینچ کر

کل جو پیکاں ساتھ اپنے دل لیے نکلا مرا
یار پچھتائے مرے سینے سے پیکاں کھینچ کر

اڑ نہ جاوے ہاتھ سے تیرے مرا یہ مرغِ دل
باندھیو تک اس کے پر، اے طفلِ ناداں! کھینچ کر

کچھ نہیں معلوم ہوتا ہم کو۔ جرمِ مصحفی
لے چلے ہیں یار کیوں اس کا گریباں کھینچ کر؟

۲۳۵

کندن سے نور تن کی پھبن دیکھ ڈنڈ پر
پھر آ گیا ہے وہ بتِ کافر گمنڈ پر

ازبس خضاب دوست ہیں شدّت سے شیخ جی
رہتی ہے ان کے ہاتھوں سے آفت ارنڈ پر

اچھا ہو کس طرح سے مرا داغِ دل، کہ یاں
ناخن سے نت خراش رہے ہے کھرنڈ پر

کر دل کے آئنے کو مرے صاف اینٹ سے
موقوف کچھ جلا نہیں اُس کی کرنڈ پر

اے مصحفیؔ میں بیٹھ کے کیا واں غزل پڑھوں
جا ئیکہ لاکھوں گردنیں ہلتی ہوں کھنڈ پر

۲۳۶

مُنہ سے برقعے کو مری جاں نہ اتارا آخر
کام در پردہ کیا تم نے ہمارا آخر

موجِ دریا کی طرح اینٹھو ہوا ب کا ہیکو
لو جی ہم نے ہی کیا تم سے کنارا آخر

اوّل عمر میں دیکھا اُسے جس نے یہ کہا
"کام آتش کا کرے گا یہ شرارا آخر"

جس سے دیں آنکھیں ملا اُس صنم کافر نے
اتنا گھورا کہ اُسے جان سے مارا آخر

دوستاں! مصحفیِ خستہ کا کیا کیجے علاج
ق
غمِ خوباں سے موا ہے یہ بچارا آخر

سوچ کر بہرِ خدا تم بھی تو کچھ بتلاؤ
کار افتادہ بایں قوم، شمارا آخر

۲۳۷

جس بت نے نہ باندھا کبھی زنّار کمر پر
اُس بت کے سجی رہتی ہے تلوار کمر پر

شملہ وہی جو ہووے باندازۂ شیخی
پھر دُم ہے جو لٹکا سرِ دستار کمر پر

کب شاخِ گل اس طرح لچکتی ہے ہوا سے
کرنا نظر اُس کی، دمِ رفتار، کمر پر

کیا دخل ہے بہلہ کا، مجھے رشک ہے یارو
اپنا بھی دھرے ہاتھ اگر یار کمر پر

شوریدہ سری اس کی تو بے وجہ نہیں ہے
عاشق ہے تری زلف کا ہر تار کمر پر

اتنا ہے وہ آوارہ کہ جب دیکھوں ہوں اُس کو
ہے پیچ گلے میں، سرِ دستار کمر پر

اے مصحفیؔ ہو چشم میں سوزن کے تبر ہے
مت آنکھ کو سی اس کی تو زنہار کمر پر

۲۳۸

تیروں پہ تیر کھا کر زخموں پہ زخم اُٹھا کر — آئے تری گلی سے ہم خون میں نہا کر
ہے ٹھوکروں سے تیری مردوں کے دل کو صدمہ — محشر خرام میرے ٹک راہ سے چلا کر
پیارے! یہ دشمنی ہے، کچھ دوستی نہیں ہے — پلکوں کو پھیر لینا، یوں انکھڑیاں مِلا کر
ٹک گھور کر جو دیکھا ظالم نے، ڈر کے مارے — کل وو ہیں پی گیا میں، آنکھوں میں آنسو لا کر
مت اُس چمن کے، یارو! تم گل کا رنگ پوچھو — آئے ہیں جس چمن سے ہم آشیاں جلا کر
پیارے! یہ دیدہ بازی تم کو نہیں ہے اچھی — مُنہ دیکھ آئنے میں اپنا ٹک اک حیا کر

اے مصحفی یہ آنسو ضایع نہ ہونے پاویں
پلکوں سے گر گریں تو دامن میں لے لیا کر

۲۳۹

یہ دلّی کا نقشا سنوارا زمیں پر — ق — کہ لاعرش کو یاں اتارا زمیں پر
قسم ہے سلیماں کی بیٹھیں زماں میں — یہیں پریوں کا تھا گزارا زمیں پر
میں وہ سنگِ رہ ہوں کہ جو ٹھوکروں میں — پھرے ہر طرف مارا مارا زمیں پر
فلک نے جو اپنے تئیں دوٗر کھینچا — یہ حرکت ہوئی ناگوارا زمیں پر
زمیں کٹ نہ جاوے مرے آنسوؤں سے — چلے ہے سدا یہ دو دھارا زمیں پر
میں آنکھوں کا تیری عجب رنگ دیکھا — نظارا فلک پر، اشارا زمیں پر
سرِ خصم ہو زیبِ فتراک ہے ہے! — پھرے لوٹتا سر ہمارا زمیں پر
جو چاہے کرے فکر اچھی زمیں میں — نہیں ہے کسی کا اجارا زمیں پر
جہاں سُم پڑا تیرے گھوڑے کا، اس جا — ہوا جلوہ گر چاند سارا زمیں پر
کیا بے ستوں میں، جو میں جا کے نالہ — بہا آب ہو سنگِ خارا زمیں پر
چلا شب وہ مجلس سے اٹھ کر تو وو ہیں — قیامت ہوئی آشکارا زمیں پر
گیا ہاتھ سے دل جو میرا، تو پھر وہ — پھرا لوٹتا جیسے پارا زمیں پر

ترے کشتے کہتے ہیں آنکھوں سے تیری نظر کیجیو ٹک خدارا زمیں پر
کوئی مصحفی کو اٹھاتا نہیں ہے
پڑا ہے موا یہ بچارا زمیں پر

۲۴۰

گرداب کے ہو جیسے گل دسر و دمن سے دور
وہ نالہ کھینچیے کہ جو پہنچے چمن سے دور
غیروں سے اختلاط رہا اُس کو تا سحر
ہم ساری رات بیٹھے رہے انجمن سے دور
ہر اک گلی میں ہو دیں اگر سیکڑوں کے خوں
نام خدا کہ کچھ نہیں اس بانکپن سے دور
کیا گردش فلک سے گلہ ہے، کہ لے گئی
ہم کو تو تیری چشم کی گردش وطن سے دور
چاہا تھا چٹکی لوں میں، کہ اتنے میں بول اٹھا
"چل بے رکھ اپنے ہاتھ کو میرے بدن سے دور"
اے شمع! جائے رحم ہے حال اُس پتنگ کا
پابوس کی ہوس میں موا جو لگن سے دور
مدفوں کا تیرے کھوج نہ ثابت ملا، مگر
اک چند استخواں تو پڑے تھے کفن سے دور
اُس بت کو مصحفی سے ملا دے مگر خدا
کیا لطف ہے جو ہو دے صنم برہمن سے دور؟

۲۴۱

پتھر پہ جب گرے ترے ہاتھوں سے چھوٹ کر
رو دے نہ کیونکہ شیشہ بھلا پھوٹ پھوٹ کر؟
اس آہ شعلہ بار کو یارب یہ کیا ہوا؟
اک بار رہ گئی جو ہوائی سی چھوٹ کر
غافل خبر لے جلد، کوئی تیری راہ میں
کہتے ہیں، رہ گیا ہے ابھی سینہ کوٹ کر
مدت سے شہر دل کا مرے بے چراغ ہے
کیا جانے لے گیا ہے اسے کون لوٹ کر
مت مصحفی کے دل کو ٹپک اپنے ہاتھ سے
وہ آئینہ نہیں کہ بنے پھر یہ ٹوٹ کر

۲۴۲

زلف کا چھٹنا ترے رخسار پر — ہے گھٹا کا جھومنا گلزار پر
سیکڑوں کے دم میں ہو جاتے ہیں خون — اُس گلی میں، سایۂ دیوار پر
اس چمن میں اپنی ہستی کی مثال — قطرۂ شبنم ہے نوکِ خار پر

مصحفیؔ کرتا ہے کوئی نالہ فاش
آستیں رکھ دیدۂ خونبار پر



۲۴۳

شاید ہوئی نہیں مری حاجت روا ہنوز — سوئے فلک دراز ہیں دستِ دعا ہنوز
اس گل کو سینہ چاکیِ عاشق سے کیا خبر؟ — اس باغ کی لگی نہیں اس کو ہوا ہنوز
اک دن ہلا دیا تھا کسی کی نگاہ نے — آیا نہیں ہے تب سے مرا دل بجا ہنوز
گو دور ہوں میں تجھ سے، تو مجھ کو جدا نہ جان — کم بخت دل مرا ہے ترا مبتلا ہنوز
بیگانگی میں کیونکہ کروں، ہائے دل کے بیچ — کرتی ہے سیر وہ نگہِ آشنا ہنوز
دیکھا تھا ایک دن کہیں اس گل کو باغ میں — آوارۂ چمن ہے نسیم و صبا ہنوز
ہاتھوں سے اُس کے رنگِ حنا اُڑ گیا، وے — تڑپے ہیں خوں میں کشتۂ رنگِ حنا ہنوز
اے دیدہ خوب رولے کہ اس نوبہار میں — ہر اک پلک سے تیری نہیں خوں، بہا ہنوز

دیکھا تھا مصحفیؔ نے کہیں اس کو ایک دن
پھرتا ہے کوچہ کوچہ وہ سر پیٹتا ہنوز

۲۴۴

ہے دلبروں میں تو ہی عاشقوں کا اک خونریز — لہو بھرا ترا دامن ہے ہم کو دستاویز

ہو جیسے جامِ بلوریں میں بادۂ گلگوں
قدح ہر اشک کا یاں خونِ دل سے ہے لبریز

اُٹھا غبار تو وہ بھی ہوا مشابۂ خط
سوائے ہند کے دیکھی نہ خاک قاتل خیز

لگیں نہ کیوں لبِ معشوق دل میں عاشق کے؟
کہ اس کی ناوکِ مژگاں تو ہیں سبھی سر تیز

شفا نصیب مرے کیونکہ ہو کہ اے یارو!
رحیم دل ہے طبیب اور میں ہوں بد پرہیز

گیا تھا لے مجھے دل، رات کوئے جاناں میں ق
جو واں میں بیٹھ گیا پڑھ کے شعرِ درد آمیز

پکڑ کے ہاتھ یہ کہنے لگا کہ اے ظالم
یہ کون جائے نشستن ہے، مصحفیؔ برخیز

۲۴۵

بادل سے برستے ہیں مرے دیدۂ تر روز
ساون کا سا گزرے ہے، میاں! مجھ پہ تو ہر روز

اغیار کی مجلس میں جو تم جاتے ہو شب کو
آ رہتی ہے اس بات کی ہم تک بھی خبر روز

باتوں میں لگائے ہی مجھے رکھتا ہے ظالم
وعدے وہی جھوٹے ہیں وہی، شام و سحر، روز

میں اپنی ہی کچھ زیست سے جیتا ہوں وگرنہ
بندھ رہتی ہے قاتل کی، مرے خوں پہ کمر روز

اے غیرتِ خورشید! یہ روپوشی کہاں تک؟
برقعے کو اٹھا، میری شبِ تار کو کر روز

اے مصحفیؔ اُس کوچے میں دل بسکہ لگا ہے
جاتے نہیں اور کرتے ہیں ہم عزمِ سفر روز

۲۴۶

وہی ٹھوکر ہے اور وہی انداز!
اپنی چالوں سے تو نہ آیا باز

کس طرف کو کرم کیا؟ کوئی دم
آئیے بیٹھیے نہ، بندہ نواز!

دیکھتے ہی پرِ کلاہ اس کا
ہوش عنقا کے کر گئے پرواز

اس کا آہستہ بولنا ہے غضب
تس پہ ہے قہر نرمیِ آواز

قصۂ عشق ہے وہ طول و طویل
جس کا انجام ہے نہ کچھ آغاز

کہیں مطلوب کا نشاں نہ ملا
ہم نے عالم میں کی بہت تگ و تاز

رازِ دل کس سے کہیے، حیراں ہوں
نظر آتا نہیں کوئی ہمراز

آنکھیں جب کھل گئیں، زمانے کے ق
ہم نے دیکھے بہت نشیب و فراز

نہیں معلوم آگے آگے ہمیں
کیا دکھاویں یہ طالعِ ناساز

مرتبہ دیکھ کر سخن کا مرے
رہے حیراں سبھی سخن پرداز

جب سے ہم مانگنے لگے ہیں دعا
درِ اجابت کا ہو گیا ہے فراز

یہ بھی قسمت! کہ تیری مجلس میں
ہم ذلیل اور غیر ہوں ممتاز

تیری صورت کو جب سے دیکھا ہے
خاک شو ہو گئے ہیں آئنہ ساز

زلف جھک کر سلام کرتی ہے
رخ کو، اور رخ کہے ہے عمر دراز!

میری تربت پہ آ، خراماں ہو
سرکشی چھوڑ، اے بتِ طنّاز!

تیغ سے ایک کو نہ مارا ہائے!
میں تو ہوں ان بتوں کا کشتۂ ناز

اے صبا! اس گلی میں گر جاوے ق
کہیو میرا ابھی تو سلامِ نیاز

مصحفی لکھنؤ میں دلّی سے
آیا طے کر کے راہِ دور و دراز

لیکن اس خاک میں بھی اس نے کہیں
کچھ نہ دیکھا بجز نشیب و فراز

۲۴۷

آچکا خط پہ سر مو نہ گیا ناز ہنوز
ہے اسی ڈھب پہ نگاہِ غلط انداز ہنوز

دل ودیں لے تو چکے اب کہو کس کی خاطر
سرمہ آلودہ ہیں یہ چشمِ فسوں ساز ہنوز

کوچۂ یار سے آئی ہے مگر صبحِ نسیم
باغ میں گل کے جو ہیں بندِ قبا باز ہنوز

بے پر و بال کیا، تو بھی قفس میں مجھ کو
چین دیتی ہی نہیں شوخیِ پرواز ہنوز

لگ گیا تھا کہیں ہاتھ اس کا ذرا مستی میں
پردۂ دل سے مرے آتی ہے آواز ہنوز

ان کے ہاتھوں سے کہاں جاؤں کہ اُس مجلس میں
ذکر میرا ہی لیے جاتے ہیں غمّاز ہنوز

گرچہ اس کوچے میں جاتا نہیں میں تو بھی دلے
کچھ نہ کچھ بات پڑھا رہتے ہیں عمّاز ہنوز

ہوں میں اے مصحفی آئینہ نہ زنگ دلے
مجھ سے غافل ہے مرا آئنہ پرداز ہنوز

س

۲۴۸

رو کش ہے ترے حسن سے، نے زہرہ نہ برجیس
کی حق نے عطا تیرے تئیں صورتِ بلقیس

کچھ کم نہیں پھوڑے سے یہ دل میری بغل میں
گر راتوں کو کُلتا ہے، تو ہے دن کو دہی ٹیس

جس دن سے، میاں! عید کا تو چاند ہوا ہے
روتے ہی گزرتے ہیں تری یاد میں دن تیس

با خاک برابر تو ہوئے ہاتھ سے تیرے
ہم سوختہ جانوں کو، فلک! اتنا بھی مت پیس

اس سینے میں جو چاک ہے بے صرفہ دیا ہے
اس سینے میں کیا کام کرے سوزنِ ادریس

دل لے گیا ہے ہاتھ سے کل میرے جو لڑکا
ڈرتا ہوں کہ رسوا نہ کرے، ہے وہ اک ابلیس

جاتے ہیں اگر پیر و جواں سیرِ چمن کو
اے مصحفی جاویں، ہمیں اس بات سے کیا ریس؟

۲۴۹

پہلو ہے مرا گرم بفرشِ پرِ طاؤس
ہوں داغوں کی کثرت سے میں ہم بسترِ طاؤس

ہے شعلہ پُر دود دل اپنا، کہ ہوا ہے
گہ تاجِ خروس اور گہے افسرِ طاؤس

اُڑتے ہیں ان آہوں سے جو راتوں کو شرارے
آتا ہے ہوا پیچ نظر لشکرِ طاؤس

کیا نام رکھوں اس کا کہ یہ داغِ دل اپنا
فلسِ پرِ ماہی ہے، نہ فلسِ پرِ طاؤس

نیرنگیِ افلاک کو جس دن سے لکھوں ہوں
ہے خامہ مرا نقش کشِ پیکرِ طاؤس

سو مہر سے داغوں کی مزیّن ہے وہ سارا
محتاجِ گواہی نہیں کچھ محضرِ طاؤس

یوں اس دلِ سی پارہ میں ہیں، داغ بتاں کے — جس طرح کہ مصحف میں دھرے ہوں پرِ طاؤس
آنے کی ترے سن کے خبر، صحنِ چمن میں — جاروب کشی کرتے پھریں ہیں پرِ طاؤس
گلشن میں نہ رہتا وہ، اگر کوئی ذرا بھی — ہوتا ترے کوچے کی طرف رہبرِ طاؤس
صوفی ہے تو ہنگامِ خوشی گریہ کیا کر — کہتی ہے گہہ رقص یہ چشمِ ترِ طاؤس
کیا ذکر کرے، پھر کوئی زیبائی کا اس کی — جائے کہ ترا جلوہ ہو غارت گرِ طاؤس

اے مصحفی رعنا نہیں محتاجِ تکلّف
بال و پرِ طاؤس ہیں خود زیورِ طاؤس

۲۵۰

نیرنگی ہے کس کی یہ چمن گسترِ طاؤس؟ — لائے ہیں جو یہ رنگ ہزاروں پرِ طاؤس
گل کھائے ہیں از بس کہ ترے عشق میں، میں نے — ساعد نظر آتا ہے مرا شہپرِ طاؤس
کیوں آنکھ اٹھاوے کوئی آئینوں سے اس کے — کچھ جوہرِ آئینہ نہیں جوہرِ طاؤس
رکھتا ہے جو کچھ، جوں زرِ گل اُس کو اڑا دے — پر سو جگہ گانٹھ نہ دے جوں زرِ طاؤس
کب نکلا میں نیرنگیِ رفتار سے اُس کی — ہر نقشِ قدم جس کا ہے غارت گرِ طاؤس
شیطاں سے نہ غافل ہو کہ یہ تا درِ فردوس — گہ مار کی صورت ہے گہے پیکرِ طاؤس
گر وہ بتِ طنّاز ہو گلشن میں خراماں — کیا دور کرے اُس کی جلو لشکرِ طاؤس
فانی نہیں جس چیز کا محکم ہو علاقہ — برباد میں جاتا نہ سُنا افسرِ طاؤس
طاؤس کا خوں مفت کیا، جس نے بنایا — دستہ ترے خنجر کا برنگِ سرِ طاؤس

اے مصحفی اک وضع نہیں رنگ فلک کا
ہے دن کو پرِ زاغ تو شب کو پرِ طاؤس

۲۵۱

یار کرتا نہیں نگاہ، افسوس! — چشم پوشی سے اُس کی، آہ افسوس

میں نہ دیکھا رخ اس کا آہ افسوس! | کر گیا جھانک کر نگاہ، افسوس!
تو نے میری طرف کو، اے گمراہ! | نہ غلط کی کبھو بھی راہ، افسوس!
ایک خط بھی نہ یار تک پہنچا | مفت کاغذ کیے سیاہ افسوس!
دل مرا اُس کو چاہتا ہے، ولے | اُس کو میری نہیں ہے چاہ افسوس!
جوں مہِ عید چھپ گیا وہ ہیں | جلوہ کر کے وہ کج کلاہ، افسوس!
اُس کے جور و جفا سے دنیا میں | ایک عالم ہے داد خواہ، افسوس!

مصحفی دستِ تیغِ خوباں سے
ہو گیا قتل، بے گناہ افسوس!

۲۵۲

اُٹھ گیا بن کہے ہی یار، افسوس! | جی کی جی میں رہی، ہزار، افسوس!
تا دمِ نزع، اپنی آنکھوں کو | تھا تمھارا ہی انتظار، افسوس!
دستِ اندازِ خلق سے، اے گل! | لُٹ گئی تیری سب بہار، افسوس!
ہو گیا رازِ عشق فاش تمام | تجھ سے، اے چشمِ اشکبار، افسوس!
اُڑتے ہی اس کے تیرِ مژگاں کا | مرغِ دل ہو گیا شکار، افسوس!
نہیں قسمت میں تشنہ کاموں کی | تیری شمشیرِ آبدار، افسوس!
دیکھ کر مصحفی کو غرق بخوں | ق مجھ کو آتا ہے بار بار افسوس

داغ ہے دل پہ اس کی صورت کا
کیا ہی مارا گیا ہے یار، افسوس!

۲۵۳

کیوں ترا مبتلا کیا؟ افسوس! | کیا کہیں دل نے کیا کیا، افسوس!
مجھ سے، اے گردشِ فلک! تو نے | یار میرا جدا کیا، افسوس!

چھوڑ کر میری آشنائی کو — اُس نے اور آشنا کیا، افسوس!

آئنہ دیکھنا ہے، کیا معنی؟ — تو نے ترکِ حیا کیا، افسوس!

مصحفیؔ اُس کے پان کھانے نے
خوں مرا بر ملا کیا، افسوس!

۲۵۴

نقصِ طالع سے دیجیے کس کو دوس — ہم سے وہ بھاگتا ہے لاکھوں کوس

اشک مژگاں پر آ کے کہتے ہیں — اپنی ہستی ہے کانٹے کی سی اوس

یہ بھی قسمت کہ میں پریشاں ہوں — اور زلفیں تری کریں پا بوس

چیت غافل کہ اب کوئی دم میں — بجتا ہے کوچ کا یہاں سو کوس

مصحفیؔ اب تو گریہ کر موقوف
آ سینوں کے خوں میں ڈوبے کوس

۲۵۵

کیوں نہ یہ زلف پھبے اب ترے رخسار کے پاس — کہ طرحدار ہے زیبندہ طرحدار کے پاس

یہ اسیرانِ قفس لطفِ چمن کیا جانیں — کون لیجاتا ہے ہم کو گلِ گلزار کے پاس

تجھ سے طمّاع سے پیارے بنے کیونکر سودا — جبکہ جز جان نہ ہو تیرے خریدار کے پاس

رستموں نے میاں ابروے تری منہ موڑا — وے ہیں ہیں کہ چلے جاتے ہیں تلوار کے پاس

اب تلک چشمہ وسیلاب بہے جاتے ہیں — ایک دن روئے تھے ہم بیٹھ کے کہسار کے پاس

جو مرے حال کو سنتا ہے وہ رو دیتا ہے — ہائے اب لے جاؤں یہ غم کون سے غمخوار کے پاس؟

حق تو یہ ہے کوئی کم ہووے گا ہم سا جانباز — شوق سے آپ چلے جاتے ہیں ہم دار کے پاس

اُس کی ٹک خاطرِ نازک ہی کا ڈر ہے ورنہ — منہ تو سرگوشی میں لے جاتا ہوں رخسار کے پاس

مصحفیؔ اک غزل اب اس سے بھی بہتر لکھ اور
جا کے پڑھنی ہے بہم بیٹھ کے دو چار کے پاس

۲۵۶

کون آتا ہے عیادت کو، دلِ زار کے پاس ؟ — لوگ سب جمع ہیں اُس نرگسِ بیمار کے پاس

رشکِ معشوقیِ صیّاد کا میں بندہ ہوں — جس نے رکھا نہ قفس کو مرے گلزار کے پاس

پاسِ عصمت اُسے اتنا ہے کہ وہ طفلِ حسیں — بیٹھتا ہی نہیں ٹک، اپنے گنہگار کے پاس

ہم پہ وہ مایہ کہاں ؟ لیک زروے تقریب — جا کھڑے ہوتے ہیں ہم، اس کے خریدار کے پاس

روسیہ زلف کو کیونکر نہ کہوں اپنا رقیب ؟ — دیکھتا ہوں اسے ہر دم ترے رخسار کے پاس

ایسے ظالم سے کوئی کیونکہ بچے خورد و بزرگ — جس کے خنجر بھی کمر بیچ ہو تلوار کے پاس

لے تو خوش رہ کہ میاں! ہم نے ہی آنکھیں موندیں — دیکھتے کب تئیں ہر دم تجھے اغیار کے پاس

ہم بمنّت اُسے اب گھر میں جگہ دیتے ہیں — جس نے ہم کو نہ دیا بیٹھنے دیوار کے پاس

لعلِ لختِ جگر و گوہرِ اشک، غرض — کونسا تحفہ کہ ہم لے نہ گئے یار کے پاس؟

کیوں نہ ہر روز خرابی مری مہماں ہووے؟ — کہ میں گھر مول لیا، خانۂ خمّار کے پاس

مصحفی چشم سے ساقی کی نہ رکھ تو صحبت
بیٹھنا خوب نہیں صوفی کو میخوار کے پاس

ش

۲۵۷

نہیں دلدار کوئی، ہووے دل آزار ہی، کاش! — گل تو معلوم، لگے ہاتھ مرے خار ہی کاش!

جس کی میں حسرتِ دیدار میں جاں دیتا ہوں — ایک ذرّہ وہ دکھا دے مجھے رخسار ہی کاش!

گرچہ عشّاق ترے سارے ہیں گردن زدنی — علفِ تیغ ہو لیکن یہ گنہگار ہی، کاش!

لطف سے اُس بتِ خونخوار کے ہم در گزرے — آ کے غصّے میں لگا دے کوئی تلوار ہی کاش!

نظر آتا ہے مجھے دُور سے جو طفلِ حسیں — میں یہ کہتا ہوں کہ یہ ہووے مرا یار ہی، کاش!

درِ گلزار تو کب مُنہ پہ مرے کُھلتا ہے ؟ — کھول دے بادِ صبا رخنۂ دیوار ہی، کاش!

مصحفیؔ دیکھنا ہے اُس کے خریداروں کو
آج وہ جلوہ نما ہو سرِ بازار ہی کاش

۲۵۸

کرے ہے جوں جوں اپنے حسن کی وہ شوخ آرائش
ہمارے عشق کی ہوتی ہے یاں ویسی ہی افزائش

تبسم اُس دہانِ تنگ میں کیونکر کہ رہ پاوے؟
کہ جس کے بیچ تنگی سے نہیں تنکے کی گنجائش

مرا دل عشق کے گلشن کا اے یارو! وہ بلبل ہے
نہ آوے جس کو غیر از سایۂ گل خوابِ آسائش

جو نوکر سرو قد تیرے کے ہیں سرکارِ عالی میں
سوائے نقدِ غم ان کو ہے بالائی بھی پیدائش

نہیں کچھ مصحفیؔ اتنا تو مفلس سوچتے کیا ہو
بطورِ امتحاں کیجے کبھی اُس پر بھی فرمائش

۲۵۹

وقفہ، اے پیکِ نگاہ! دیدۂ تر ہے درپیش
دن ہیں برسات کے، اور رہ میں خطر ہے درپیش

بزمِ ہستی میں کچھ آسودہ نہیں بیٹھے ہم
جوں چراغِ سحری ہم کو سفر ہے درپیش

دلِ حیراں کی مرے دیکھیو کیا صورت ہو؟
اب تو واں آئنہ ہی آٹھ پہر ہے درپیش

امتحاں باتوں میں کرتے ہو ہمارا، اے واہ!
کھینچیے تیغ کو واللہ یہ سر ہے درپیش

مثلِ آئینہ وہ حیرانِ تماشا ہے ترا
جس کے صورت تری، اے رشکِ قمر! ہے درپیش

زلف و رخسار کا اس آئنہ سیما کے خیال
اپنی آنکھوں کے، غرض شام و سحر ہے درپیش

کیوں نہ رک رک کے گریں دیدۂ تر سے اب اشک
مصحفیؔ دل کے مرے لختِ جگر ہے درپیش

۲۶۰

بھڑکے ہے تپِ عشق کی دل میں غضب آتش
اے گریہ! چھڑک آب کہ ٹک جاوے دب آتش

کیا کام کیا تو نے؟ مرے دل کو جلایا! / کعبے کو لگاتا ہے کوئی بے ادب، آتش!

شاید کہیں گزرا ہے تو دامن کو جھٹک کر / دہکی نہیں سینے میں مرے بے سبب آتش

جھمکا تھا وہ اپنی ہی تو اس آتشِ دل کا / موسیٰ کو جو آئی تھی نظر وقتِ شب آتش

کس ساعتِ بد ہو گی بنا خانۂ دل کی؟ / لگتی ہے اسی گھر کے تئیں جب نہ تب آتش

جلنے کے سوا کام نہیں اس کو، رکھی ہے / اللہ نے پروانے کے دل میں عجب آتش

برق اس کے دمِ گرم سے کس طرح بر آوے؟ / ہو ہر نفسِ سرد کا جس کے لقب آتش

جل جائے گا عالم، مجھے مت خوف میں لاؤ / ہے برق کے مانند مرے زیرِ لب آتش

کیونکر کہوں، ہجراں میں ترے اب نہیں جلتا / ویسی ہی طپش اور وہی روز و شب آتش

انگارے سے دہکے ہیں مرے سینے میں اب تک / کس روز بجھا شعلہ، ہوئی سرد کب آتش

اے مصحفی پوچھ اس کی نہ کچھ نرمی و گرمی
ظالم گہہ لطف آب ہے، وقتِ غضب آتش

۲۶۱

دانستہ کیا جس نے مرا نام فراموش / ہوتا نہیں مجھ سے وہ دل آرام فراموش

یاد آتا ہے جس وقت ترے کوچے کا جانا / ہو جاتے ہیں اس وقت تو سو کام فراموش

ہم سے سبقِ عشق مسلّم نہیں ہوتا / گر صبح کو ہے یاد، تو پھر شام فراموش

اللہ رے تری شوکت و شاں! دیکھ کے جس کو / قاصد نے کیا خوف سے پیغام فراموش

اک مرتبہ دیکھی جو تری چشم کی گردش / لے ہاتھ پہ ساقی نے کیا جام فراموش

میں ہوں وہ گرفتار کہ صیّاد نے جس کو / گر صید کیا ہووے تہِ دام فراموش

چھڑکا ہے نمک اس نے مرے لختِ جگر پر / ہو کیونکہ تری لذّتِ دشنام فراموش

اے مصحفی کیا بھیج کے خط یاد دلاؤں
اس نے تو کیا مجھ کو بہ ابرام فراموش

۲۶۲

جنّت کی تمنّا ہے نہ گلزار کی خواہش
رہتی ہے ہمیں اک ترے دیدار کی خواہش

دل دام میں زلفوں کے جو پھڑکے ہے تو پھڑکو
کام آتی ہے کیا مرغِ گرفتار کی خواہش

مُنہ موڑ نہ قاتل! دلِ کم ذبح سے میرے
ہے اس کے تئیں اور بھی اک وار کی خواہش

جی دوڑے ہے اس کا تو نت اک تازہ ہوس پر
ہو ایک تو کہیے دلِ بیمار کی خواہش

بوسے کی طلب ہم بھی کریں اس کے لبوں سے
نکلی ہو کبھی اس سے جو دو چار کی خواہش

مت جانو موئے پر گئی زاہد کی بزرگی
ہے ویسی ہی اب تک اُسے دستار کی خواہش

ہے ظلم اُسے مرہمِ کافور لگانا
جس زخم کو ہو مرہمِ زنگار کی خواہش

ہم بھی نہیں رکھتے ہیں دریغ اس سے سراپا
اے مصحفیؔ ہے یوں ہی اگر یار کی خواہش

ص

۲۶۳

رکھتا ہوں میں تجھ سے جی سے اخلاص
ہرگز نہیں اور کسی سے اخلاص

کیا جانے وہ قدرِ صافیِ دل
ہے اس کو تو آرسی سے اخلاص

دشمن کو بھی دوست جانتے ہیں
ہے اپنے تئیں سبھی سے اخلاص

دشمن تمھیں کون جانتا ہے؟
تم بانٹتے ہو سبھی سے اخلاص

اے مخلصِ بے ریا کسی کے
موقوف کیا ابھی سے اخلاص

رکھتا ہے وہ دشمنِ محبّت
ق
یوں اور تو ہر کسی سے اخلاص

کیا جانیے کیا خطا ہے اس کی
جو ترک ہے مصحفیؔ سے اخلاص

۲۶۴

پاس اپنے تو، اے یارو! نے سیم نہ زر خالص
یا اشکِ مصفّا ہیں، یا خونِ جگر خالص

تیرے لبِ شیریں کا وہ نرخ نہیں پاتی
ہر چند فروشندہ رکھتا ہو شکر خالص

کیا عیب ہمارے کو، بتلاوے کوئی یارو
ہیں عاشقِ صاف اُس کے رکھتے ہیں نظر خالص

قطرات سے آنسو کے، ہیں تارِ نظر روشن
میں اُس میں پروئے ہیں از بس کہ گہر خالص

اُٹھ مصحفیؔ مسجد سے میخانے میں آیا ہے
پیمانے میں اے ساقی! لا کے تو بھر خالص

ض

۲۶۵

کچھ خط ہی نہیں فدائے عارض
ہے زلف بھی مبتلائے عارض

لغزش سے نظر نہیں ٹھہرتی
اللہ رے تری صفائے عارض

پھر گل کی طرف کبھو نہ دیکھے
بلبل کو جو تو دکھائے عارض

جوں زلف ہوں گو کہ دل پریشاں
جانے ہے تری بلائے عارض

ہر حلقۂ زلف میں ترے، یار!
خالی ہے ہمیشہ جائے عارض

کم حوصلہ تھا، کسی کو جوں خال
میں دل نہ دیا سوائے عارض

مُنہ پیٹتا دیکھ مصحفیؔ کو
دل نے بھی کہا کہ ہائے عارض

۲۶۶

دیکھ آئینے میں اپنی وہ بہارِ عارض
پیار کی نظروں سے ہوتا ہے نثارِ عارض

مل گئے خاک میں گل چہرہ ہزاروں ایسے
کہ نہ جھاڑا کسی نے ان کا غبارِ عارض

آئنہ صدقے گیا تھا ترے مکھڑے کے میاں
اس میں کا ہیکو تھے یہ نقش و نگارِ عارض

زلف کو دیکھ کے تیری مجھے رشک آتا ہے
کہ میسّر ہے اُسے بوس و کنارِ عارض

گل کا یہ مُنہ ہے کرے حسن کا اس کے دعویٰ؟
مہر و مہ ہو نہ سکیں جس کے دو چارِ عارض

اب وے عارض کے تلے ہاتھ دھرے سوتے ہیں
کبھی گل تکیوں پہ تھا جن کا قرارِ عارض

عالمِ نیم رخی کو تری تصویر کے دیکھ
مل گئی خاک میں سب گل کی بہارِ عارض

کیا برے لوگ ہیں وہ بھی جو مرے گل رو کا
نگہِ گرم سے کرتے ہیں فشارِ عارض

مصحفیؔ محو ہوں کس کا میں جو رہتی ہیں سدا
پتلی آنکھوں کی مری آئنہ دارِ عارض

ط

۲۶۷

کس دن لکھا تھا آپ کو میں عاشقانہ خط؟
جو سَو سَو گالیاں مجھے دیتے ہو بے نقط

بغدادِ حسن بھی ہے عجب جاگہ جس کے بیچ
دیتے نہیں خلیفہ کو اک جرعہ آبِ شط

ہم کب سزائے نکہتِ بادِ بہار تھے؟
ایدھر بھی ہو گئی رہِ پیکِ صبا غلط

کھینچا ہے بس کہ سر بفلک بحرِ اشک نے
ہے نسرِ طائر اُس میں شناور لیسانِ بط

وے دن گئے کہ پیتے تھے جامِ شرابِ رخ
اپنی معاش خونِ جگر پر ہے اب فقط

افغاں! کہ نامہ بر کے مجھے اضطراب سے
مہلت ہوئی نہ اتنی کہ دے لوں قلم کو قط

مخشوش ہاتھ آیا تھا دیوانِ مصحفیؔ
لکھتے ہوئے چلے گئے ہم بھی غلط سلط

۲۶۸

رکھتا ہے بس کہ ہاتھ گریباں سے اختلاط
جوں گل ہے چاکِ جیب کو داماں سے اختلاط

کیا جانے خواب بند کیا کس کی چشم نے! مژگاں کو ایک پل نہیں مژگاں سے اختلاط

جوں گل سوائے شبنم الماس ریز ہا رکھتا ہے کون سینہ فگاراں سے اختلاط؟

مذہب میں اپنے دوستی تنگ کفر ہے کیونکر کریں نہ گبرو مسلماں سے اختلاط

وے دن گئے کہ تھا دلِ صد چاک کو مرے جوں شانہ اُس کی زلفِ پریشاں سے اختلاط

بن سازش اس کی بزم میں پاوے نہ بار شمع کرنا ہمیں ضرور ہے درباں سے اختلاط

امرد پرست تو نہیں اتنا میں مصحفی
پر بیش و کم ہے فرقۂ نسواں سے اختلاط

ظ

۲۶۹

عالم ہے مرے بیاں سے محظوظ میں عشق کی داستاں سے محظوظ

سینے پہ لگی سناں جو اُس کی دل خوب ہوا سناں سے محظوظ

کیا جانے وہ لذّتِ قفس کو؟ جو مرغ ہو آشیاں سے محظوظ

تو ساتھ نہ ہو تو، ہم نہ ہوویں سیرِ گل و گلستاں سے محظوظ

ہم لذّتِ زخم پر مریں ہیں وہ ہوتے ہیں امتحاں سے محظوظ

بلبل کی فغاں تو بے اثر ہے کیا ہووے گل اس فغاں سے محظوظ

اک زخم بھی کارگر نہ آیا ہوں کشتے ترے کہاں سے محظوظ؟

جو مردہ پسند لوگ، ہوویں ق اے مصحفی رفتگاں سے محظوظ

میں عیسیِ وقت ہوں تو ہرگز
ہوں وے نہ مری زباں سے محظوظ

ع

۲۷۰

میں کیا گریہ، دن اور رات شروع
پھر ہوا موسمِ برسات شروع

میری تربت پہ کوئی شعر پڑھو
نہ کرو مصحف و آیات شروع

یار مل کر وہیں جاتا بھی رہا
کرنے پائے بھی نہ ہم بات شروع

میں گیا بزم میں اُس کی تو، بہ غیر
کیں وہیں اس نے اشارات شروع

دیکھیں پایانِ محبت کیا ہو
ہیں ابھی عشق کی آفات شروع

عشق کی پڑھتے ہیں جو شخص حدیث
وے نہیں کرتے ہیں مشکات شروع

مصحفی دیکھیے کیا ہو؟ اس نے
کی ہے غیروں سے ملاقات شروع

۲۷۱

ہر ایک کی معاش کی ہے اک وضع
تدبیر و تلاش کی ہے اک وضع

ہے سروِ چمن اگرچہ خوش ڈول
پر تیری تراش کی ہے اک وضع

اب تک دمِ آخری میں میرے
نالے کی خراش کی ہے اک وضع

ہے گل کا قماش سرخ اور زرد
بلبل کی قماش کی ہے اک وضع

اے مصحفی دیکھ، ماہِ نو میں
اُس زین کی قاش کی ہے اک وضع

۲۷۲

جن کے مکاں چمن ہیں وے لوٹیں بہارِ شمع
ہم غمزدوں کی بزم میں کب ہے گزارِ شمع؟

تاریک گو ہو راہِ عدم، جا دیں گے چلے
کچھ وے نہیں ہیں ہم کہ کریں انتظارِ شمع

کیا صبح ہوتے بجلی پڑی اس پہ کیا ہوا؟
کیوں سرد ہو گیا نفسِ شعلہ بارِ شمع؟

صحبت اگر یہی ہے تو اس انجمن کے بیچ
کچھ گل کھلا رہے گا، دلِ داغدارِ شمع

ہے رشک مجھ کو اس کے نصیبوں پہ، کیا کہوں
پروانہ کس طرح سے ہوا ہے نثارِ شمع

بے داغ ایک تارِ گریباں نہیں مرا
گر سوختہ ہیں ان کو بنایا ہے تارِ شمع

ہر شب تصوّرِ رخِ پُر نور میں ترے
تا صبح میری آنکھیں رہی ہیں دوچارِ شمع

منعِ قلق بہ تیغ بھی عاشق کو ہے محال
کچھ سر کٹے سے کم نہ ہوا اضطرارِ شمع

رو کش نہ مجھ سے دشمنِ کم مایہ ہو سکے
کیا آگے آفتاب کے ہے اعتبارِ شمع

لے کر گیا ہوں داغِ سہی قامتاں، بہ خاک
کیجو مرے مزار پہ روشن قطارِ شمع

دیکھا تھا اُس کو پردۂ فانوس سے کہیں
تھمتے نہیں ذرا مژۂ اشکبارِ شمع

شوخی تو دیکھ، ہاتھوں سے مکھڑا چھپا لیا
لے کر گیا میں رات جو اُس کو دوچارِ شمع

پروانہ سر پٹک کے لگن ہی میں مر گیا
ایسے کہاں نصیب کہ ہو ہمکنارِ شمع

دیکھا ہے جب سے اُس مہِ تاباں کو مصحفیؔ
کچھ زرد ہو گیا ہے تبھی سے عذارِ شمع

غ

۲۷۳

باندھے ہے جب کمر سے مرا خوش خرام تیغ
کرتی ہے خونِ بے گنہاں، گام گام تیغ

یوں بے دریغ ذبح کیا کس کو جو تری
تا قبضہ بھر رہی ہے لہو سے تمام تیغ

لڑنے لگی ہیں پھر تری آنکھیں ہر ایک سے
چلتی ہے دوستوں میں پھر اب صبح و شام تیغ

کہتے ہیں یوں کہ قطع ہوا وہ سرِ کرد
دیکھیں ہیں یہ جو بر رخِ ماہِ سیام تیغ

کیا جانے کس کو قتل کیا! آج مضطرب
آتا ہے ہاتھ میں وہ لیے بے نیام تیغ

صیّاد نے کیا ہے عجب ظلم اختراع
کرتا ہے جائے دانہ نہاں، زیرِ دام تیغ

اس کی ہر ایک وضع کے کشتے ہیں ہم، کہ ہے
دستِ کشیدہ خنجر و طرزِ سلام تیغ

کیا رحم تجھ کو میری جوانی پر آ گیا؟
لی وقتِ قتل تو نے جو کل تھام تھام تیغ

کیا جانے کس کے خوں کا وہ پیاسا ہے مصحفیؔ
رکھنے لگا ہے ہاتھ میں اپنے مدام تیغ

۲۷۴

کبھی جو غصّے کے وقت اس کے ہاتھ آئی تیغ
تو اس نے کھینچ کے میرے ہی اک لگائی تیغ

اگر یہ ہاتھ ہیں تیرے، تو ایک دن ہم کو
دکھا رہے گی ترے ہاتھوں کی صفائی تیغ

نہ بچ کے آیا کوئی اس کے ابرو مژہ سے
کسی کے تیر لگا اور کسی نے کھائی تیغ

اسے بھی سخت تمنائے سرخ پوشی تھی
بھلا ہوا کہ مرے خون میں نہائی تیغ

وہ خانہ جنگ پھنکیتوں میں ہے بڑا ہتھ چھٹ
سر اس کا دو ہی کیا جس کے اک لگائی تیغ

میں چاند روزے کا دیکھے تھا شب کھڑا سرِ بام
کہ اتنے میں ترے ابرو نے لا دکھائی تیغ

وہ بیچ چوک کے کل مصحفیؔ سے بگڑا تھا
لپٹ کے یاروں نے ہاتھ اس کے سے چھڑائی تیغ

۲۷۵

جب اس نے قبضہ پکڑ ہاتھ میں اٹھائی تیغ
قیامت ایک، غریبوں کے سر پہ لائی تیغ

ہمارے ساتھ بڑی اس نے کج ادائی کی
تری کمر پہ میاں جس نے کج بندھائی تیغ

میں شب جو سر بفلک کھینچنے کا قصد کیا
تو کہکشاں نے مجھے دور سے دکھائی تیغ

تو سادگی تو ذرا دیکھ میرے قاتل کی
کہ قتل کر مجھے دامن میں کل چھپائی تیغ

میں ہاتھ چوم لیے اس کے دوڑ کر دو ہیں
جب اس نے سر پہ مرے پیار سے لگائی تیغ

اٹھایا سر جو میں گاہے، تو دستِ قاتل سے
چمک کے سر پہ مرے برق سی کچھ آئی تیغ

سنا ہی ہوگا یہ قصّہ، کہ مر گیا قابیل ق جب اُس غریب کے ہابیل نے لگائی تیغ
مقامِ عشق میں ایسے ہی خون ہوتے ہیں عجب نہیں ہے جو بھائی پہ کھینچے بھائی تیغ
کٹے وہ کیونکہ نہ دل میں کہ مصحفیؔ شبِ دوش
میں خالی دے گیا وار اس نے جب چلائی تیغ

۲۷۶

مرے سینے کا بن سرخی نہیں داغ برنگِ لالہ ہے یہ آتشیں داغ
فلک پر بھی ترے خالِ جبیں نے کیا ہے ماہ کو، اے مہ جبیں! داغ
ہوئے تھے جل کے خاکستر جہاں ہم عجب کیا ہے وہاں کی ہو زمیں داغ
ترے بندِ حنا کا کشتہ ہے دل تبھی تو یہ کہیں خوں ہے کہیں داغ
برنگِ لالہ جس پہلو کو دیکھو ہمارے دل کا ہے پہلو نشیں داغ
دُھلایا دست و تیغ اُس نے تو کیا، ہیچ رکھے ہے خون کے اب تک آستیں داغ
مرا دل مصحفیؔ خاتم بنا ہے
ہے اس خاتم پہ نیلم کا نگیں داغ

۲۷۷

آتا ہے عجب سج سے وہ کاندھے پہ دھرے تیغ کیا جانے علمِ قتل کو اب کس کے کرے تیغ!
بیٹھے ہیں ہوسِ کشتہ کئی آج سرِ راہ جی دینے پہ، مت لائیو ظالم تو ورے تیغ
قاتل جو لگانا ہے تو ٹک ہٹ کے لگانا ڈرتا ہوں ترا خون میں دامن نہ بھرے تیغ
اے صیدِ دل! اُس کوچے سے جاوے گا کدھر کو؟ مژگاں کے ورے تیر ہیں، ابرو کی پرے تیغ
اے مصحفیؔ اُس گل کی نہ ہو طبع شگفتہ
جب تک کہ مرے خوں میں وہ رنگیں نہ کرے تیغ

ف

۲۷۸

تھے جو جنوں زدہ، گئے زنجیر کی طرف
ہم کو قضا جولانیٔ تو شمشیر کی طرف

ہر اک کشش میں اُس کی کھنچا جا ہے جی مرا
دیکھوں کمان کی کہ ترے تیر کی طرف

ہاتھوں سے اپنے اب کے بن آیا جو کچھ تو ہم
پیکِ دعا کو سمجھیں گے تاثیر کی طرف

جب کر چکا تمام تو پھر، آہ رہ گیا
نقاش دیکھ کر تری تصویر کی طرف

قاصد جواب خط کا مرے خاک لائے گا
روتا گیا ہے اُس بتِ بے پیر کی طرف

مشتاق دید میں ہی نہیں تیرے تیر کا
تکتی ہے چشم صید بھی رہگیر کی طرف

دلّی پہ رونا آتا ہے کرتا ہوں جب نگاہ
میں اس کہن خرابے کی تعمیر کی طرف

سب عقدے کھول دیجیو اس کے نوائے صبا!
جا دے کہیں جو زلفِ گرہ گیر کی طرف

یوں قتل کر نہ ڈالیے باتوں میں میری جاں!
ٹک آدمی کی دیکھیے تقصیر کی طرف

جب لعلِ لب سے اپنے تو ہوتا ہے دُرفشاں
رہتا ہوں دیکھ میں تری تقریر کی طرف

مانی نے ہاتھ سے قلمِ صنع رکھ دیا
خطِ بتاں کی دیکھ کے تحریر کی طرف

اپنی ہی تیغِ کاری کی تعریف اس نے کی
دیکھا نہ سخت جانیٔ نخچیر کی طرف

رسوا کریں ہیں یار مجھے ورنہ مصحفیؔ
اپنا مزاج تو نہیں تشہیر کی طرف

۲۷۹

دیکھا ہے جب سے اس بتِ خود کام کی طرف
خاطر کو میل ہی نہیں آرام کی طرف

ہم اُس شکار گاہ کے صیاد ہیں جہاں
آیا نہ پر بھی اُڑ کے کبھی دام کی طرف

اوروں نے جا خموں سے منہ اپنے بھڑا دیے
کم ظرف ایک ہم ہی گئے جام کی طرف

گردش تمھاری چشم کی دیکھیں کدھر کو ہو؟ — تکتی ہے ساری بزم اسی جام کی طرف
پروانہ وار تو جو نہ آیا تو جل گیا — میں دیکھ کر چراغِ سرِ شام کی طرف
یہ آئنے میں آنکھ ہی پھرتے پہ کی نگاہ — دیکھا مری بھی گردشِ ایّام کی طرف؟
آغازِ خط میں حسن کا کھاتے نہیں فریب — مدِّ نظر جنھوں کے ہے، انجام کی طرف
ترکیب والے اور بھی دلّی میں ہیں، ولے — غالب ہے دلبرانِ خوش اندام کی طرف
جو اس گلی سے گزرے ہے دیکھے ہے بار بار — دَر کی طرف گیے تو گیے بام کی طرف
میرے نوشتے پر نہ ہنسو، دیکھو ٹک میاں! — اپنے رقیب کے بھی سر انجام کی طرف

دیکھا جو پختہ میوہ کوئی میں نے مصحفیؔ
دل لے گیا مجھے طمعِ خام کی طرف

۲۸۰

زلفیں رہیں مکھڑے پہ کھل، اک اِس طرف اک اُس طرف — موتی رہے کانوں میں ڈھل، اک اِس طرف اک اُس طرف
میں ہوں وہ میکش، اے مغاں! مجلس میں جس کی حوریاں — کف پر لیے ہیں جامِ مل، اک اس طرف اک اس طرف
ساعد کا میرے پشت و رو کہنی تلک سب داغ ہے — کھاتا رہا ہوں بسکہ گل، اک اس طرف اک اس طرف
گر تیری یکتائی کرے شمشیرِ غیرت کو علم — ہو جاویں دو ہیں جزو و کل، اک اس طرف اک اس طرف

جاؤں کدھر؟ اے مصحفیؔ، تیغیں نکالے ہاتھ میں
ابرو رہیں قاتل کے تُل، اک اس طرف اک اس طرف

۲۸۱

افعیِ سیاہ ہے تری زلف — یا مری ایک آہ ہے تری زلف
سنبل پہ پڑے ہے آنکھ کس کی؟ — تا پیشِ نگاہ ہے تری زلف
رخسار ترا ہے گل ولیکن — اُس گل کی گیاہ ہے تری زلف
گردِ گل مار حلقہ زن ہے — یا ہالۂ ماہ ہے تری زلف

کیوں کر کوئی اس سے بچ کے نکلے مارِ سرِ راہ ہے تری زلف
دل چاکی و خستگی پہ میری باشانہ گواہ ہے تری زلف
آنکھ اس سے بندھی ہے مصحفیؔ کی
زنجیرِ نگاہ ہے تری زلف

۲۸۲

ساتھ ساقی کے گیا اپنا تو مے پینے کا لطف اس سے مرنا ہی بھلا، اب کیا رہا جینے کا لطف
سبزۂ نوخیز خط کا حسن کچھ پنہاں نہیں لعل سے لب سے ترے پیدا ہے اس مینے کا لطف
تو نے مُنہ پھیرا اور اس کا نور سا جاتا رہا تھا تری صورت ہی تک اے یار آئینے کا لطف
ہم تو عاشق پیشہ ہیں کیا جانیں ان باتوں کو آہ! ایسے معشوقوں کے پوچھا چاہیے کینے کا لطف
صبح کے مانند ہے چاکِ گریباں تک بہار
مصحفیؔ پنہاں نہیں اُس شوخ کے سینے کا لطف

ق

۲۸۳

کس سے کہیے آہ! کیا ہوتا ہے عشق؟ کچھ نہ پوچھو بد بلا ہوتا ہے عشق
ماجرائے عشق تو مجھ سے نہ پوچھ سخت کافر ماجرا ہوتا ہے عشق
کام بیگانے سے کچھ اس کو نہیں آشنا سے آشنا ہوتا ہے عشق
اس کا مارا کوئی بچتا ہی نہیں ہائے تیرِ بے خطا ہوتا ہے عشق
نظریں کس پرہیز سے کرتی ہیں سیر جب تلک باہم چھپا ہوتا ہے عشق
فسق کو کہتے نہیں ہم لوگ عشق یعنی عشقِ باصفا ہوتا ہے عشق
گو کہ بے عشقی میں گزرے سال و ماہ عاشقوں سے کب جدا ہوتا ہے عشق

عشق مت کر عشق مت کر مصحفیؔ
مان اے ناداں برا ہوتا ہے عشق

۲۸۴

کھیل جاتے ہیں جان پر عاشق
جان دیتے ہیں آن پر عاشق

کوئی ان گالیوں سے ٹلتے ہیں
ہم ہیں تیری زبان پر عاشق

خواری ان عاشقوں کی، وے جو ہوئے
تجھ سے ناقدر دان پر عاشق

تازہ آفت تو ایک یہ ہے کہ ہم
ہوئے اس نوجوان پر عاشق

جان دینے کو سود جانتے ہیں
ہم ہیں اپنے زیان پر عاشق

اس قدر گرتی ہے رہے تو یہ برق
ہے مرے آشیان پر عاشق

مصحفیؔ گر تو، مرد کامل ہے
دل نہ رکھ اس جہان پر عاشق

۲۸۵

کسی پر میں نہ یاں از خود کیا عشق
کچھ آپھی آپ پیدا ہو گیا عشق

یہ سب چہلیں ہیں اس کی ہی طرف سے
تکلف بر طرف کیا حسن، کیا عشق

کیا رسوا عبث یاروں نے واللہ
مجھے اک دیکھنے کا اس سے تھا عشق

کیا بندہ بتوں کا مجھ کو اس نے
ہے یار و بخت کا فر ماجرا عشق

نہیں دل بستگی ہر گز کسو سے
مگر ہے مصحفیؔ اک شعر کا عشق

۲۸۶

عشق میں اس کے ہوئے ہیں بسکہ ہم رسوائے خلق
رات دن اکثر اٹھایا کرتے ہیں ایذائے خلق

خلق سب مجھ کو برا کہتی ہے تیرے عشق میں
گو کہے، میرے تئیں بھی کب ہے اب پروائے خلق؟

ہائے جس کوچے میں نالے کی ہمیں رخصت نہ تھی
اب اُسی کوچے میں ہے آٹھوں پہر غوغائے خلق

ایک یوسف جلوہ گر ہے مصر کے بازار میں
تسپہ اس کے ساتھ ہے یہ گرمیِ سودائے خلق

مصحفی کے سر پہ رہیو سایہ تیری زلف کا
آفتابِ حشر میں جس دن کہ ہووے جائے خلق

ک

۲۸۷

وے شخص جو کہتے ہیں کہ ہے ذاتِ خدا ایک
دیکھیں تو بتاں کو بھی بھلا آ کے ذرا ایک

ان خانگی معشوقوں سے نسبت نہیں اس کو
وہ خانہ برانداز تو ہے طرفہ بلا ایک

ایمان سا جاتا رہے ہے شیخ کا وہیں
ہوتی ہے جو پانچوں میں نماز اس کی قضا ایک

اس کوچے میں آئے تھے کفن باندھ کے سر سے
جو یار، سو اں ان میں سے تو جیتا نہ بچا ایک

قاتل ہے تجھے تیغ کا گر اپنی بھروسا
تا دو ہی کرے مجھ کو تو ایسی ہی لگا ایک

شاید کہیں سر کھینچا مرے سروِ رواں نے
جو آج گلستاں کی طرف فتنہ اٹھا ایک

جب مصحفیِ ریختہ گو ہو گیا خاموش
مذکور ہوا سب میں کہ اس فن وہ تھا ایک

۲۸۸

روتے روتے سو گیا ہے یہ دلِ رنجور ٹک
اے فغاں! اس وقت تُو تو مجھ کو رکھ معذور ٹک

زخم پر میرے نمک چھڑ کا مرے جرّاح نے
کیا غضب ہوتا، جو رکھتا مرہم کافور ٹک

اب تلک خمیازہ کھینچیں ہیں پڑے اس باغ میں
سو گئے تھے ہم بزیرِ سایۂ انگور ٹک

آئنہ کیا، جس کو دل چاہے تمھارا دیکھیے
پر میاں! ادھر کیجیے ہماری بھی طرف منظور ٹک

اب تلک نرگس کی آنکھیں ہیں خجالت سے جھکی
وا ہوئی تھیں باغ میں وہ نرگسِ مخمور ٹک

بوسے لے لے بے ادب کھو دیتے ہیں رونق تمام
آ دے ہے اس طفل کے چہرے پہ جوں ہی نور ٹک

مرد و زن کا حشر ہے کوچے میں اس کے مصحفیؔ
ماجرا کہیے گا کم ہونے تو دے یہ شور ٹک

۲۸۹

کہاں ہم اور وہ رونا سحر تک
یہ باتیں ہو چکیں بس چشمِ تر تک

ادھر آ دیکھ چشمِ خونفشاں میں
بہارِ لالہ ہے داغِ جگر تک

وہ اب تلوار کھینچے کیوں نہ آوے؟
دریغ اس سے نہیں یاں ہم کو سر تک

چہ جائے غیر یارب اس گلی میں
مجھے ہے رشک اپنے نامہ بر تک

نہ اڑ جاویں گے اب تو چھوڑ صیّاد
رہے دام و قفس میں بال و پر تک

چہ جائے زلف اُس آئینہ رُو کو
خیالِ سایہ ہے موئے کمر تک

گرے ہے مصحفیؔ کوئے بتاں میں
کوئی اب ہم سے پہنچا جا ہے گھر تک؟

۲۹۰

شب شوق لے گیا تھا ہمیں اس کے گھر تلک
پر غش سا آ گیا وہیں، پہنچے جو در تلک

گر ہم کو لگ گئی ہیں کبھی ہچکیاں تو ہم
آٹھ آٹھ آنسو روئے ہیں دو دو پہر تلک

ڈرتا ہوں میں یہ گم نہ کرے آپ کو کہیں
پھر جعد کو ہوئی ہے رسائی کمر تلک

پروانہ کیا اڑے ہے چراغاں میں، تو نہیں
پہنچا جو کوئی شعلہ ترے بال و پر تلک

صحرائے کشتگاں میں ترے کل گیا تھا میں
دیکھوں تو لالہ زار ہے حدِّ نظر تلک

پھیلاؤ بحرِ اشک کا اپنے میں کیا کہوں
پہنچی ہے موجِ گریہ مری بحر و بر تلک

وے دن کدھر گئے کہ میں لکھ لکھ کے خطِّ شوق
جاتا تھا آپ گریہ کناں، نامہ بر تلک

تیزی میں نوکِ نشترِ مژگاں کی کیا کہوں
دل میں اگر چبھے تو وہ پیرے جگر تلک
شب اس کی بزم میں جو گئے ہم تو مصحفی
ایسے جمے کہ واں سے نہ اٹھے سحر تلک

۲۹۱

لاوے تو لاوے اس کے تئیں میرے گھر تلک
پہنچا تو ہے یہ نالہ مقامِ اثر تلک
کالے کی لہر ہووے خجل جس کے سامنے
اللہ رے تیری زلف کا چھٹنا کمر تلک
گو دل میں بال ہے ترے، ہو جائے گا درست
پہنچا اگر یہ شیشہ کسی شیشہ گر تلک
لنگی ہے تیری تیغِ تغافل، عجب ہے یار
گر موجِ خوں نہ گزرے دو عالم کے سر تلک
ہو جاں گے پتلیوں ہی پہ آنسو تو رے کی بوند
گر کام کر گئی تفِ دل چشمِ تر تلک
آنسو وہ لعلِ بیش بہا ہے، کہ جوہری
قیمت میں جس کی دیتے ہیں لعل و گہر تلک
اپنا چراغِ عمر سرِ شام ہو گیا
جلنے کا اس کے کام نہ پہنچا سحر تلک
جاتا ہے گر تو یار کے کوچے میں مصحفی
چل میں بھی تیرے ساتھ ہوں اس رہگزر تلک

گ

۲۹۲

کہتی ہے نمازِ صبح کی بانگ
اٹھ صبح ہوئی ہے کچھ دعا مانگ
دیکھا میں چہار دانگِ عالم
پر ہاتھ لگا نہ کچھ بھی اک دانگ
سیمیں بدن اس کا، چاندنی میں
ڈرتا ہوں پگھل نہ جاوے جوں رانگ
ٹوٹا جو ہمارا شیشہ دل
پہنچے گی فلک تک اس کی گل بانگ
بہروپ ہے یہ جہاں کہ جس میں
ہر روز نیا بنے ہے اک سانگ

کرتا ہوں سوال جس کے در پر — آتی ہے یہی صدا کہ "پھر مانگ"
دلّی میں پڑیں نہ کیوں کہ ڈاکے؟ — چوروں کی ہر ایک گھر میں ہے تھانگ
لے شوخ یہ خونِ مصحفی ہے
چل بچ کے نہ آتے جاتے یوں لانگ

۲۹۳

اس نے دیکھا صاف کیا اس دیدۂ پرخوں کا رنگ — کچھ مکدّر سا نظر آیا مجھے جیحوں کا رنگ
اس قدر کاہے کو چہرہ اس جواں کا زرد تھا — عشقِ لیلی نے کیا ہے ہائے یہ مجنوں کا رنگ
لالۂ خودرو کی جا کر دیکھ ٹک اس کے بہار — جیسے کندن سا جھمکتا ہے ٹڑاہاموں کا رنگ
جس طرح ابرِ سیہ سے جلوہ فرما ہو شفق — یوں مِسی سے ہے نمایاں اس لبِ میگوں کا رنگ
کب حنائے بستہ کے باندھے سے حاصل ہو وہ لطف؟ — گو الٹ کر یار پھر باندھیں مرے مضموں کا رنگ
نیم بسمل کی طرح خوں میں تڑپ کر رہ گیا — آخر آخر یہ ہوا پیارے ترے مفتوں کا رنگ
گرچہ سو سو بار دھویا اس نے آبِ گرم سے — دامنِ قاتل سے پر چھوٹا نہ میرے خوں کا رنگ
آہ پر بختِ جگر کو کر دیا تو نے جو نصب
مصحفی کیا تھا یہی اس مصرعِ موزوں کا رنگ

۲۹۴

رکھتی ہے جو عارض کی ترے جلوہ گری رنگ — ویسا تو کہاں پا وے میاں حور و پری رنگ
دیکھا ہے تجھے جلوہ کناں جب سے چمن میں — ہر گل کا اڑاتی ہے نسیمِ سحری رنگ
رد کش ترے ہونٹوں سے جو ہوتا ہے وہ شاید — ہے تشنۂ خوں اپنا عقیقِ جگری رنگ
جو نالہ کہ آغشتہ بخوں سینے سے نکلا — پایا نہ میں اس میں بھی بجز بے اثری رنگ
تربت پہ مری ہم نفساں عود جلانا — یعنی ہوں میں مقتولِ لباسِ اگری رنگ
یارو وہ دمِ آخر ہے مرا یاس کے مارے — کیوں زرد نہ ہو جیسے چراغِ سحری رنگ؟

بیداد ہے دینا، اُسے نسبت رگِ گل سے
رکھتی نہیں ہرگز تری نازک کمری رنگ

گزرا نہیں گر دل سے وہ خونیں جگراں کے
رکھتی ہے ترے تیر کی پھر کیوں یہ سری رنگ؟

عارض پہ ہوا خط کا غبار آ کے نمایاں
اب کیونکہ نہ ہو حسن کا تیرے سفری رنگ؟

اللہ رے اس تیری بنا گوش کا جلوہ
رکھتا نہیں ایسا کوئی گل برگِ تری رنگ

تا دامنِ قاتل نہ ہو آلودۂ تہمت
زخموں میں چرایا ہے یہ خونِ جگری رنگ

گرد یکھیے جوں شمعِ سحر بشرے کو اُن کے
ہے بزم نشینانِ جہاں کا سفری رنگ

ہم سنگ کروں اس کا، اگر لختِ جگر کو
ہو جاوے سبک وہیں عقیقِ جگری رنگ

اے مصحفیؔ جو گل کہ اُگا خاک سے میری
لایا نہ وہ آخر کو بجز بے ثمری رنگ

ل

۲۹۵

اُمڈے ہیں نین سے آج بادل
بھر جاویں گے روتے روتے جل تھل

اے عشق! جہاں ہے یار میرا
مجھ کو بھی اُسی جگہ تو لے چل

یا رب! اک نہ چین سے وہ سووے
جس نے کہ کیا ہے مجھ کو بیکل

نت اپنی تو بوریے پہ گزری
دیکھا نہ بخواب فرشِ مخمل

گر قتل کرے ہے عاشقوں کو
مجھ کو بھی تو ذبح کرے اوّل

کیا فکر کریں کہ ہے ہمیشہ
دل منتشر و حواس مختل

سیدھا ہوا بارے مار کھا کر
نکلے ہی نہ تھا کبھی ترا بل

اے مصحفیؔ اب سزا کو پہنچا
اس کوچے میں تو، پھر آئیو کل

۲۹۶

دامن کے تئیں ذرا اٹھا چل　　یعنی یہ ہے عاشقوں کا مقتل

ہے عشق وہ بحرِ بے سر و بن　　آخر ہے نہ جس کا کچھ، نہ اوّل

کچھ انیٹھے ہی جائے ہے وہ ہم سے　　اللہ رے تیری زلف کا بل

صندل کا درخت ہے ترا قد　　اور ہاتھ ہیں جیسے شاخِ صندل

کیا سرمے کی کچھ سیاہی کم تھی؟　　آنکھوں میں دے آئے ہو جو کاجل

یہ حضرتِ مصحفیؔ کا سر ہے

پانو کے تلے تو اس کو مت مل

۲۹۷

چپ، بس بہت ہوئی تری فریاد مبتذل　　اب آپ کو نہ کر دلِ ناشاد مبتذل

آیا نہ مرغِ تازہ، کبھی تیرے دام تک　　کھینچا بھی کوئی تو نے تو صیاد مبتذل

آگے صفائے عارض و قد کے ترے میاں!　　ہے حسن و جلوۂ گل و شمشاد مبتذل

بیداد یہ پڑا ہے کہ پانو میں خلق کے　　ہوتا ہے تیرا کشتۂ بیداد مبتذل

اے خوں نہ جوش کیجیو اس نو بہار میں　　صد جا ہوا ہے نشترِ فصّاد مبتذل

ہو مرغِ دل نہ طائرِ رنگِ حنا کی طرح　　ہاتھوں میں تیرے طفلِ پریزاد مبتذل

یاروں کی فکرِ تازہ کی عالم میں دھوم ہے　　مضمون باندھتے نہیں استاد مبتذل

اور ہی ادا ہے تیغ لگانے میں یار کے　　ہے وضع قتل کی ترے جلّاد مبتذل

پہنچے ہے کب وہ داد کو عاشق کی دوستاں　　ہوتا نہ خوب شیوۂ بیداد مبتذل

دنیا نہ جائے دید ہے موند آنکھیں مصحفیؔ

پاتا ہوں میں بہت یہ غم آباد مبتذل

۲۹۸

آکر ہماری خاک پہ اس نے چڑھائے گل　　آخر کو جذبِ عشق نے یاں بھی کھلائے گل

گریہ روش ہے تیری تو دامن کی جھونک سے پامالِ ناز ہو دیں گے سب تختہ ہائے گل
ہے دیدنی بہار، جنوں کی مرے کہ میں ٹکڑے جگر کے رکھتے ہیں سر پر بجائے گل
آیا تھا صبح، بند کھلے کون باغ میں جو آج چاک چاک ہے جیبِ قبائے گل
بھڑکے نہ کیونکہ فصلِ بہار آتشِ جنوں دامن جھپکتی آتی ہے ہر دم ہوائے گل
خوبانِ ہفتہ دوست کے ملنے سے درگزر آئے ہے ان کے رنگ میں بوئے وفائے گل
ہم کو چمن میں جانے سے کیا ربط مصحفی
نے آشنائے بلبل و نے آشنائے گل

۲۹۹

گو نہ ہاتھ آئے ہمارے ترے رخسار کا پھل ہم نے نظروں سے چنا گلشنِ دیدار کا پھل
بند کر لب کہ نتیجہ ہے دعا کا دشنام دوستی چھوڑ کہ یاں دشمنی ہے پیار کا پھل
میوہ خانہ اس حسن ز لبس شیریں سے اس کے خواہندہ نہیں کھاتے ہیں بازار کا پھل
غیر از سیبِ زنخداں نہیں درکار مجھے باغباں تجھ کو مبارک رہے گلزار کا پھل
گو کہ وہ تلخ تر از طعمِ سمِ قاتل ہو کامِ عشاق میں میٹھا ہے غمِ یار کا پھل
دیکھنا تو ہے مرے تپ کو وے یہ ڈر ہے ہاتھ کہیں جاوے پھپولوں میں نہ غمخوار کا پھل
مصحفی قبضے میں رکھوں گا میں اس ابرو کو
زور ہی ہاتھ لگا ہے مرے تلوار کا پھل

۳۰۰

کر دیا اس کی کمر نے ہم کو بیمارِ خیال بیٹھے بیٹھے ہو گئے ہیں ہم گرفتارِ خیال
گر خیال اس کا کبھی آیا ہے اپنے خواب میں خواب میں بھی ہم رہے ہیں نازبردارِ خیال
یاد آیا میکہ میں راتوں کو جب بیدار تھا تھی مری آنکھوں کی پتلی خالِ رخسارِ خیال
وہ برہمن زادہ ہووے کیونکہ یار اپنا، کہ ہے باندھنا مشکل کمر سے اس کی زنارِ خیال

جس گھڑی رفتار کا تیری تصور بندھ گیا
پھر رہی آنکھوں ہی میں پھرتی وہ رفتارِ خیال

دیکھیے سودائے کاکل سے بچے گا کیونکہ دل؟
بے طرح پیچھے پڑا ہے اس کے آزارِ خیال

اُس کے آنے کا بھی اب وہ بے وفا مانع ہوا
ہم غنیمت جانتے تھے جس کا دیدارِ خیال

ہو چکے وہ دن جو وہ رشکِ قمر تھا روبرو
مصحفیؔ اب میں ہوں تنہا اور شبِ تارِ خیال

۳۰۱

دھویا گیا تمام ہمارا غبارِ دل
گریے نے دل سے خوب نکالا بخارِ دل

اتنا نہیں کوئی کہ خبر اُس کی آ کے لے
کب سے بجھا پڑا ہے چراغِ مزارِ دل

دل جس گھڑی کہ ہونے لگے صدقے یار کے
اس وقت اپنی جان ہی کیجے نثارِ دل

صبر و قرار کب کا ہمارے وہ لے گیا
سمجھے تھے جس کو مایۂ صبر و قرارِ دل

تیر و کماں کو لے کے وہ نکلا ہے ہاتھ میں
اُس بت کو پھر ہوئی ہے ہوائے شکارِ دل

کہتے ہیں داغِ عشق کسے، ہم کو کیا خبر
اک قطرہ خونِ گرم تو ہے ہم کنارِ دل

ہونٹوں تک آتے آتے ہوئی وہ بھی سرد، آہ!
اک آہِ سرد تھی جو مری غمگسارِ دل

مانندِ لالہ اس چمنِ دہر میں مرا
یہ داغِ تازہ ہے سببِ افتخارِ دل

مجبور ہوں میں کیونکہ کروں ضبطِ گریہ، آہ!
بے اختیارِ چشم ہے، بے اختیارِ دل

دل داغِ غم سے جل کے ہوا خاک، یا نصیب!
لائی یہ رنگ تیرگیِ روزگارِ دل

آتا ہے جی میں، پہلو میں دل کو چھپا رکھوں
یاں تک کہ وہ کیا ہی کرے انتظارِ دل

رازِ دل اپنا کس سے کہوں ہائے مصحفیؔ
ملتا نہیں کوئی مجھے تو رازدارِ دل

۳۰۲

یوں پڑا رہتا ہے اس ابروئے خمدار میں بل
جیسے ہوتا ہے پرانی کسی تلوار میں بل

پیچ پر پیچ ہی کھاتا ہے جو دیکھے ہے اُسے
ہیں پڑے بسکہ تری پٹّیِ دستار میں بل

بیٹھی ہی جاتی ہے کچھ اس کے بدن سے کافر
اُس برہمن بچے کے بسکہ ہے زنّار میں بل

جو سہی سروِ گلستانِ خوش اندامی ہیں
ہر قدم چلتے ہوئے کھاتے ہیں رفتار میں بل

دل اُلجھتا رہا تا صبح ہمارا، شب کو
پڑ گیا اس کے جو پھولوں کے ذرا ہار میں بل

پیچ پگڑی کے تری رشک سے بل کھاتے ہیں
جب سے دیکھے ہیں ترے طرّۂ طرّار میں بل

اینٹھی ہی جاتی ہے کچھ زلف تری عاشق سے
تب تو پڑتا ہے میاں اس کے ہر اک تار میں بل

ہاتھ اے بہلہ نہ رکھ اُس پہ کہ میں ڈرتا ہوں
پڑ نہ جاوے کہیں موے کمرِ یار میں بل

مصحفی جبکہ وہ مستانہ قدم رکھتا ہے
کیا غضب پڑتے ہیں اس کیفیِ میخوار میں بل

م

۳۰۳

جب واقفِ راہ و روشِ ناز ہوئے تم
عالم کے میاں خانہ بر انداز ہوئے تم

نسبت تمھیں کیا تازہ نہالانِ چمن سے
اب نامِ خدا سرو سرافراز ہوئے تم

میں تم سے نہ بولوں گا کبھی اے لبِ تشنہ!
اُس بن بہ تبسّم بھی اگر باز ہوئے تم

وہ خاک مرقع ہوئی اے دیدۂ خونبار!
جس خاک کے صفحے پہ چمن ساز ہوئے تم

مرغانِ چمن کرتے ہو کیوں ہرزہ درائی؟
کیا قہر ہوا کچھ جو خوش آواز ہوئے تم

پہنے سے میاں جامۂ گل دوز کے بر میں
طاؤس صفت اور بھی طنّاز ہوئے تم

اے مصحفی مرغانِ چمن رہ گئے خاموش
جب باغ میں جا زمزمہ پرداز ہوئے تم

۳۰۴

ہر چند ہے وہ نورِ نظر روبروے چشم
تس پر بھی چین دیتی نہیں جستجوے چشم

تم اس میں اپنا پھول سا مکھڑا نہ دیکھیو　　آتی ہے آئنے سے میاں مجھ کو بوئے چشم
جب دیکھتا ہوں گل کو تو اُس مو کمر بغیر　　چبھتی ہے آنکھ میں رگِ گل مثلِ موئے چشم
جھمکیں ہیں آبِ اشک میں گر برگِ لختِ دل　　جوئے چمن سے کم نہیں اپنی بھی جوئے چشم
بن دیکھے رو دے خوب کے رہتی نہیں کبھی　　کیا کیجیے یہی پڑی اپنی تو خوئے چشم
پیارے جو سو طرح کا ادا فہم ناز ہو　ق　سمجھے تو سمجھے وہ ہی تری گفتگوئے چشم
یعنی کہ اُس کی چشم کو دیکھا ہی کیجیے
ہے مصحفیؔ مری تو یہی آرزوئے چشم

۳۰۵

بے نام و نشاں بہت رہے ہم　　پردے میں نہاں بہت رہے ہم
کچھ بات چلی تھی شمع رو کی　　شب گریہ کناں بہت رہے ہم
اب جاتے ہیں اس جہاں کو، تم میں　　اے اہلِ جہاں بہت رہے ہم
شب گھر سے وہ ماہ رو نہ نکلا　　در پر نگراں بہت رہے ہم
اس بت کی کمر کبھو نہ دیکھی　　چندے بہ گماں بہت رہے ہم
کیوں سوئے عدم ابھی سے جاویں　　دنیا میں کہاں بہت رہے ہم؟
تم جاؤ چلے کہ تم سے پیچھے　　اے پیش رواں! بہت رہے ہم
مژگاں کی صفوں میں کل مقابل　　با تیر و سناں بہت رہے ہم
جاتا ہے اُچٹ دل اپنا دو ہیں　ق　ٹک جم کے جہاں بہت رہے ہم
اب چلیے کہیں کو لکھنؤ سے
اے مصحفیؔ! یاں بہت رہے ہم

۳۰۶

ایک سے آنکھیں لڑا بیٹھے ہیں ہم　　ان دلوں پھر جی چلا بیٹھے ہیں ہم

جب بہار آئی ہے، گل کے سامنے
کر گریباں چاک، جا بیٹھے ہیں ہم

دیکھ کر آشفتہ اُس کی زلف کو
ڈر کے مارے مُنہ چھپا بیٹھے ہیں ہم

بے حواسی سے شب اس کی بزم میں
حالِ دل اپنا سُنا بیٹھے ہیں ہم

بِن بلائے در پہ تیرے بار ہا
جب ہوئی ہے صبح، آ بیٹھے ہیں ہم

چھیڑ مت، ہر دم نہ آئینہ دکھا
اپنی صورت سے خفا بیٹھے ہیں ہم

دیکھ کر آنکھوں کو اُس کی، مصحفیؔ
ان دنوں سرمہ سا کھا بیٹھے ہیں ہم

۳۰۷

جب تک کہ میں ہوں، رہیو مرے روبروئے چشم
مت مجھ سے مُنہ چھپائیو اے آرزوئے چشم

دیکھا ہے جب سے رخنۂ دیوار کو ترے
رہتا ہے آفتاب کا اُودھر ہی روئے چشم

کب چھوٹتا ہے دامنِ مژگاں سے داغِ خوں؟
جب تک نہ موجِ گریہ کرے شست و شوئے چشم

جانا ہیں تیرے رخنۂ دیوار سے کہ یار
تجھ کو بھی چین دیتی نہیں جستجوئے چشم

سرخی سی اب تلک نظر آجائے ہے مجھے
اے گریہ تو نے خوب نہ کی شست و شوئے چشم

یاں تک کیا میں گریہ کہ خوباں کے عشق میں
ساتھ آبرو کے اپنی، گئی آبروئے چشم

نرگس نہیں یہ تربتِ یوسف پہ مصحفیؔ
تھا خوب روئے ہے خاک پر اس کی علوئے چشم

۳۰۸

یوں چلتے ہیں لوگ راہ ظالم؟
کوئی چال ہے یہ بھی آہ ظالم؟

اوروں کی طرف تو دیکھتا ہے
ایدھر بھی تو کر نگاہ، ظالم!

ہے راست تو یہ کہ میں نہ دیکھا
تجھ سا کوئی کجکلاہ، ظالم!

کچھ رحم بھی ہے؟ تری جفا سے
اک خلق ہے داد خواہ، ظالم!

کس واسطے بولتا نہیں تو؟ کیا مجھ سے ہوا گناہ ظالم؟

اے مصحفیؔ دل کہیں نہ دیجے
ہوتی ہے بری یہ چاہ ظالم

۳۰۹

ہے خطِ یار، شب کو نیا لکھ رکھیں گے ہم
قاصد! تو صبح آئیو، جا لکھ رکھیں گے ہم

مارے صفا کے دل میں ٹھہرتا نہیں وہ حسن
کاغذ اوپر یہ حسن و صفا لکھ رکھیں گے ہم

ہیں یادگارِ عالمِ فانی یہ دونوں چیز
اُس کی جفا اور اپنی وفا لکھ رکھیں گے ہم

پر مبتذل ہوا ہے تو اے شوخ بعد ازیں
ہر جائیوں میں نام ترا لکھ رکھیں گے ہم

آیا نہیں سمجھ میں کہ کہتے ہیں کس کو عشق؟
اک پرزے پر یہ حرف جدا لکھ رکھیں گے ہم

عنابِ اشک سے تپِ دل دور ہو گئی
کتنی مفید ہے یہ دوا لکھ رکھیں گے ہم

کرنا نہیں اسے قلم انداز مصحفیؔ
یہ ریختہ ہوا ہے نیا لکھ رکھیں گے ہم

۳۱۰

غنچے نے ترے لب سے لیا دامِ تبسّم
اور آنکھوں سے سیکھا گلِ بادامِ تبسّم

لاکھوں کو کیا صید تری جنبشِ لب نے
گلشن میں ہزاروں کا ہوا دامِ تبسّم

زلفوں میں اچنبھا نہیں کچھ اُس کی بناگوش
یاں کرتی ہے نت صبح تہِ شامِ تبسّم

گل رشک سے جلتے ہیں، جو کرتا ہے چمن میں
چولی کے مسکنے میں وہ اندامِ تبسّم

جس گھر میں ہو خورشیدِ رخِ یار کا جلوہ
موجود ہے واں تا بہ لبِ بامِ تبسّم

کون آج تری بزم میں آیا ہے جو ساقی!
ہنستی ہے صراحی، کرے ہے جامِ تبسّم

اندازِ نزاکت ہے حد اس غنچہ دہن کا
کیونکر نہ رگِ گل پہ رکھے نامِ تبسّم

اس زیرِ لبِ خندہ کے کشتوں میں ہوں جس کا
نزدیک ادا فہموں کے ہے نامِ تبسّم

اے مصحفیؔ میرے دلِ ناشاد کی خاطر
ایجاد کیا اس نے یہ دشنام تبسّم

۳۱۱

سننے پائے نہ دہن اس کے سے دشنام تمام
جنبشِ لب ہی میں اپنا تو ہوا کام تمام

تو وہ گل ہے کہ گلستانِ جہاں میں پیارے
محو ہیں تیری ہی سج دھج کے گل اندام تمام

میں ہوں اس کفر کے صدقے کہ یہ اپنی حسنِ سیاہ
لے گئی زلف تری رونقِ اسلام تمام

بے تکلّف تری آنکھوں سے اُسے کیا نسبت
کیونکہ سوزن زدہ ہے دیدۂ بادام تمام

کوئی صیّاد نہیں سوئے چمن رو کرتا
اس برس ٹوٹے پڑے ہیں قفس و دام تمام

میں وہ گردن زدنی ہوں کہ تماشے کو مرے
شہر کے لوگ کھڑے ہیں بہ سرِ بام تمام

کہیو ساقی سے کوئی جاوے جو میخانے میں
کہ "دعا دیتے ہیں تجھ کو یہ مے آشام تمام"

اتنا بے قدر تو ہوں میں کہ کسی نے ہرگز
اُس کے مُنہ سے نہ سُنا ہوگا مرا نام تمام

مصحفیؔ اتنی سمیّت ہے کہاں کالے میں
زہر کی گانٹھ ہے وہ زلفِ سیہ فام تمام

۳۱۲

جوں شمع، داغِ غم نے جلایا بدن تمام
نکلی نہ دل سے پر ہوسِ سوختن تمام

وہ مرغِ نیم بسملِ نازِ بتاں ہوں میں
رنگیں ہے جس کے خون سے صحنِ چمن تمام

ہیں کشتہ اس کی تیغ کے کتنے پر اس طرح
لوہو میں شور بور ہے کس کا کفن تمام

مژگانِ چشمِ یار کی خنجر زنی نہ پوچھ
ہیں معرکے میں عشق کے وے صف شکن تمام

اس کے بدن سے حسن ٹپکتا نہیں تو پھر
لبریزِ آب و رنگ ہے کیوں پیرہن تمام ؟

شیریں بہت چڑھی تھی سر اُس کے سو آخرش
کھا آپ زخمِ تیشہ ہوا کوہکن تمام

از بس کہ دل رکھے ہیں وہاں کتنے مار کر
لوہو سے بھر رہا ہے وہ چاہِ ذقن تمام

ہم کو قسم ہے یار کی لکنت کی مصحفیؔ
گر اُس کے مُنہ سے ہم نے سنا ہو سخن تمام

۳۱۳

ہوتا نہیں ہے یار کا جور و ستم تمام
اس منچلے میں کاش کہ ہو جاویں ہم تمام

کاغذ نہ آیا واں سے کبھی ہائے اے ندیم!
خط لکھتے لکھتے گھس بھی گیا یاں قلم تمام

سودا نہ کیونکہ کیجیے ابروے یار سے؟
تیغِ ولایتی کی طرح ہے وہ خم تمام

اس بت کدے میں ہے کوئی تجھ سا بھی جلوہ گر
حیراں ہیں جس کی شکل کے نت یہ صنم تمام

سو بار تو نے وعدہ کیا اور نہ پھر ملا
تیری تو یار جھوٹی ہی نکلیں قسم تمام

واماندگاں کی رہ سے کبھی پھر بھی کر گزر
چشمِ پُر انتظار ہیں نقشِ قدم تمام

وہ شخص دل گداختہ ہوں میں کہ مصحفیؔ
ٹپکے ہے گفتگو سے مری درد و غم تمام

۳۱۴

وہ دن گئے کہ ہم کو کبھی تھا ریا سے کام
کیا کیجیے کہ اب تو پڑا ہے خدا سے کام

پیدا کیا ہر ایک کو اک کام کے لیے
اس کو جفا سے کام ہے، ہم کو وفا سے کام

بادِ صبا سے بیش ہے واں اپنی رفتگی
تس پر بھی ہائے ہم کو ہے بادِ صبا سے کام

اتنا جو ہم سے رہتے ہو بیگانہ میری جاں!
شاید پڑا ہے تم کو کسی آشنا سے کام

ٹک ان بتوں کی چشم کی گردش تو دیکھیو
خانہ خراب، کرتی ہیں کس کس ادا سے کام

خائف ہیں تند خوئی سے تیری جو اہلِ ہوش
تو دیکھ تو کہ لیتے ہیں کس التجا سے کام

اپنی مرادیں مانگنی ساری گئے ہیں بھول
شام و سحر ہے اب ہمیں تیری دعا سے کام

خالی کروں ہوں ریختہ کہہ دل کو مصحفیؔ
تحسیں سے مدّعا ہے نہ کچھ مرحبا سے کام

۳۱۵

یا تو گل دیتے تھے چمن کر خویش و بیگانے کو ہم
یا ترستے ہیں قفس میں باغ تک جانے کو ہم

مے اگر پی ہم نے بن ساقی تو خونِ دل پیا
لائے گردش میں نہ اپنے سر کے پیمانے کو ہم

یار دامن سے ترے کوئی شعلہ بھڑکا چاہیے
جوں خس و خاشاک پھر آندھی ہیں جل جانے کو ہم

اپنا سر رکھنا قدم پر تیرے، یاد آتا ہے یار
دیکھتے ہیں جبکہ پائے شمع پروانے کو ہم

کچھ تو اے شیریں لبو! انصاف بھی درکار ہے
بوسہ لینے کو رقیب، اور گالیاں کھانے کو ہم

فوجِ طفلاں بر قفا اور اشکِ گلگوں در جلو
روز ہی اک شان سے جاتے ہیں ویرانے کو ہم

شمع آسا قصۂ سوزِ دل اپنا ہے دراز
صبح کر دیویں اگر چھیڑیں اس افسانے کو ہم

مصحفی ہرگز کسی کی بات کو سنتا نہیں
کب تلک سمجھاویں یارب ایسے دیوانے کو ہم

۳۱۶

کیا کریں جا کے گلستاں میں ہم
ہیں بہ کنجِ قفس فغاں میں ہم

جانتے آپ سے جدا تجھ کو
کرتے گر فرق جسم و جاں میں ہم

ہیں تجلّیِ ذات کے تیری
ایک پردہ سا درمیاں میں ہم

گل کا یہ رنگ ہے تو اب اک دن
آگ رکھ دیں گے آشیاں میں ہم

واں تغافل نے اپنا کام کیا
یاں رہے مہر کے گماں میں ہم

آسماں کو نشانہ کرتے ہیں
تیر رکھتے ہیں جب کماں میں ہم

مر کے نکلے قفس سے، خوب ہوا
تنگ آئے تھے اس مکاں میں ہم

گر یہی آہ ہے تو دیکھو گے
رخنہ کر دیں گے آسماں میں ہم

شاخِ گل کے گلے سے لگ لگ کر
روتے ہیں موسمِ خزاں میں ہم

باغ تک جاتے، ہاں اگر پاتے
طاقت اس جسمِ ناتواں میں ہم

مصحفی عشق کر کے آخر کار
خوب رسوا ہوئے جہاں میں ہم

۳۱۷

کچھ اس قدر نہیں سفرِ ہستی و عدم
گر پانو اٹھائیے تو یہ عرصہ ہے دو قدم

شیخی تو دیکھ رات گلستاں کو ے گیا
ٹکڑے جگر کے آپ میں دامن میں کر بہم

ملنے کا ہم سے تو نہیں اے آرزوے جاں!
اک روز ہو چکیں گے اسی آرزو میں ہم

وہ آفتاب چہرہ کہیں ہو گیا تھا صبح
ہیں اس چمن میں سبزے کی مژگاں ہنوز نم

چھوٹے نہ دامِ زلف سے اُس صید بند کے
سر کو پٹک پٹک کے موئے طائرِ حرم

شبنم سے آنسوؤں کی مرے دیکھیو صفا
بلبل! تجھے بہ پاکیِ دامانِ گل قسم

کب اعتدالِ قد کو ترے پہنچے ہے میاں!
ہر چند سرو بھی ہے بجوشش قامتی علم

کیونکر نہ حرف اس کے بھلا پیچدار ہوں
لکھتا ہے مصحفیؔ صفتِ زلفِ خم بہ خم

۳۱۸

صیاد نے ہمیں نہ کیا صید، ہے ستم
آئے تھے شوقِ دام میں اُڑ آشیاں سے ہم

کاغذ پہ میری چشم سے آنسو ٹپک پڑے
جب کر چکا میں نامہ بصد آرزو رقم

اُگلی پڑے ہے اب تو تری تیغِ خوش غلاف
آ گئے تو اس قدر تو نہ تھا مائلِ ستم

کیا سر اٹھاویں اب کہ مہ نو کو دیکھ کر
دھوکے میں تیغِ ابرو کے، مارے پڑے ہیں ہم

بے صرفہ کھینچیو نہ گریباں کو میرے چاک
ناموسِ عشق کی ہے تجھے اے جنوں قسم

نومید مصحفیؔ سے نہ ہو یار وقتِ نزع
تم نے سُنا نہیں ہے کہ اک دم ہزار دم

۳۱۹

نقشِ نگیں ہے دل میں تو اپنے بتاں کا نام
گو یاد ہووے ان کو نہ مجھ خستہ جاں کا نام

ہوتا ہے دل شگفتہ کب اُس بن، مرے حضور
آ کر کے لو ہزار کوئی گلستاں کا نام

بتلائیو کہ بھول گیا ہوں میں، بوجھ کر
یارو! کسی کو یاد ہے اُس دل ستاں کا نام

عنقا کی طرح کوچے میں عزلت نشیں ہوں لیک
مشہورِ روزگار ہے مجھ بے نشاں کا نام

یاں خار و خس کے آتشِ گل ہے سُراغ میں
مرغِ چمن تو لیجیو مت آشیاں کا نام

جانا تھا میں بہار ہے، کل باغباں سے
مُنہ زرد ہو گیا مرا سنتے خزاں کا نام

سر دے چکا نہ مصحفی اس بات پر، میاں!
مت لیجیو ہر کسی سے کبھی امتحاں کا نام

۳۲۰

جب تک کہ تری گالیاں کھانے کے نہیں ہم
اٹھ کر ترے دروازے سے جانے کے نہیں ہم

جتنا کہ یہ دنیا میں ہمیں خوار رکھے ہے
اتنے تو گنہگار زمانے کے نہیں ہم

ہو جاویں گے پامال، گزر جاویں گے جی سے
پر سر ترے قدموں سے اٹھانے کے نہیں ہم

آنے دوائے جس کے لیے چاک کیا ہے
ناصح سے گریباں کو سِلانے کے نہیں ہم

جب تک کہ نہ چھڑکے گا گلاب آپ وہ آکر
اس غش سے کبھی ہوش میں آنے کے نہیں ہم

جاویں گے صبا باغ میں گلگشتِ چمن کو
پر تیری طرح خاک اُڑانے کے نہیں ہم

اے مصحفی خوش ہو گا نہیں ہم سے وہ جب تک
سر کاٹ کے نذر اس کی بھجانے کے نہیں ہم

۳۲۱

سر اپنے کو تجھ پر فدا کر چکے ہم
حقِ آشنائی ادا کر چکے ہم

تو سمجھے نہ سمجھے ہمیں، ساتھ تیرے
جو کرنی تھی اے بے وفا کر چکے ہم

خدا سے نہیں کام اب ہم کو یارو!
کہ اک بت کو اپنا خدا کر چکے ہم

میں پوچھا "مرا کام کس دن کروگے؟"
تو یوں مُنہ پھرا کر کہا "کر چکے ہم"

گھرُس نے تو اب ان کو چیرے میں اپنے
تماشائے زلفِ دوتا کر چکے ہم

تو جاوے نہ جاوے جو کرنی تھی ہم کو		سماجت تری اے صبا کر چکے ہم
نہ بولیں گے پیارے، تری ہی سنیں گے		تو دشنام دے اب دعا کر چکے ہم
کبھو کام اپنا کسی سے نہ نکلا		بہت خلق کی التجا کر چکے ہم

لڑی مصحفیؔ آنکھ جس سے کہ اپنی
پھر آخر اُسے آشنا کر چکے ہم

۳۲۲

وہ چاندنی رات اور وہ ملاقات کا عالم		کیا لطف میں گزرا ہے غرض رات کا عالم
جاتا ہوں جو مجلس میں شب اُس رشکِ پری کی		آتا ہے نظر مجھ کو طلسمات کا عالم
برسوں نہیں کرتا تو کبھو بات، کسو سے		مشتاق ہی رہتا ہے تری بات کا عالم
کر مجلسِ خوباں میں ذرا سیر کہ باہم		ہوتا ہے عجب ان کے اشارات کا عالم
دل ان کا نہ لوٹے کبھی پھولوں کی صفا پر		شبنم کو دکھادوں جو تری گات کا عالم
ہم لوگ صفات اُس کی بیاں کرتے ہیں، ورنہ		ہے وہم و خرد سے بھی پرے ذات کا عالم
وہ کالی گھٹا اور وہ بجلی کا چمکنا	ق	وہ مینہ کی بوچھاڑیں، وہ برسات کا عالم
دیکھا جو شبِ ہجر تو رویا میں کہ اُس وقت		یاد آیا شبِ وصل کی اوقات کا عالم

ہم مصحفیؔ قانع ہیں بخشک و ترِ گیتی
ہے اپنے تو نزدیک مساوات کا عالم

۳۲۳

کیا وصل کی شب کی میں کہوں رات کا عالم		وہ رات تھی یارب کہ طلسمات کا عالم
ہر چند کہ سیمیں بدناں خوب ہیں سارے		پر سب سے جدا ہے یہ تری گات کا عالم
اوقات بسر، خونِ جگر کھا کے کروں ہوں		عالم سے جدا ہے مری اوقات کا عالم
کیا کام ہے دل پھیرنا اُس رشکِ پری کا		تسخیر میں یاں اپنی ہے جنّات کا عالم

اے مصحفیؔ چل تو بھی قطب کو کہ کہیں ہیں
آتا ہے بہت چھڑیوں میں میوات کا عالم

۳۲۴

ایک عالم میں کیا لو در بدر میرے تئیں
بیش ازیں، اے عشق! اب رسوا نہ کر میرے تئیں

دن میں سو سو بار جانا اس کے گھر میرے تئیں
نت وطن ہی میں رہے ہے اب سفر میرے تئیں

دل گیا اُس کی گلی میں، ظلم مجھ پر کر گیا
اپنے جانے کی نہ کی اس نے خبر میرے تئیں

روبرو غیروں کے آنا، یہ کوئی انصاف ہے
منہ کو پردے میں چھپانا دیکھ کر میرے تئیں

وائے بے صبری کہ رک کر جب کبھی روتا ہوں میں
ہچکیاں لگ جاتی ہیں دو دو پہر میرے تئیں

چپ ہی رہنے دو مجھے، پوچھو نہ کوئی میری بات
کیونکہ رونا آئے ہے ہر بات پر میرے تئیں

بعد مدّت کے لگی ہے صبح ہوتے میری آنکھ
چھیڑ مت، سونے دے اے بادِ سحر! میرے تئیں

رہ سکا ہرگز نہ دل بن دیکھے اس کے، مصحفی
شوق نے آخر بنایا نامہ بر میرے تئیں

۳۲۵

بوئے گل لائی ہی آخر شور پر میرے تئیں
صبح گلشن میں نہ کرنا تھا گزر میرے تئیں

چندے اک آسودگی سے کیا ہی لگ جاتی تھی آنکھ
اب لگی دکھ دینے پھر بادِ سحر میرے تئیں

شب کوئی پیچھے یہ میرا دشمنِ جانی نہ ہو
اپنے سایے سے بھی اب لگتا ہے ڈر میرے تئیں

کرکے مجھ سے اختلاط آخر کو پچھتائے ہی تم
آپ نے عاشق نہ جانا تھا مگر میرے تئیں

خوبیِ قسمت تو دیکھو، ہو گیا ان سے بھی بیر
عمر جن لوگوں میں کرنی ہے بسر میرے تئیں

مجھ کو ہے صیّاد سے شکوہ کہ اُس بے درد نے
موسمِ گل میں کیا بے بال و پر میرے تئیں

سرمہ آسا خاک میں اے مصحفی میں مل گیا
کھا گئی کیا جانیے کس کی نظر میرے تئیں

۳۲۶

ازبس کہ نہیں قرار جی میں
سو گزریں ہیں باتیں یار جی میں

خط ہو کے ندان منہ پر آیا
تھا اُس کے جو کچھ غبار جی میں

جوں ناوکِ غمزہ اُس نے پھینکا
لگتے ہی ہوا دو سار جی میں

ہے ہے کہ بھرے ہیں سو ملولے — اس میرے امیدوار جی میں
میں دیکھ کے تجھ کو رو دیا جب — کچھ تیرے بھی آیا پیار جی میں؟
سن ایک ہی سخن کدھر چلا تو؟ — باتیں ہیں ابھی ہزار جی میں
سوزن سے کوئی نکالے کیونکر؟ — مژگاں کے چبھے ہیں خار جی میں
اک بار تیری گلی میں آوں — آتا ہے یہ بار بار جی میں
میں تجھ سے کہی سب اپنے دل کی — اب تو بھی نہ رکھیو، یار! جی میں

اے مصحفی! درد کا ادب کر
اوپجے ہے جو کچھ سو مار جی میں

۳۲۷

کوئی مے بند کرے، کوئی پری شیشے میں — مخترع ہم ہیں کہ آتش ہے بھری شیشے میں
سبز جامے میں ترا لطفِ بدن گر دیکھے — دخترِ رز نہ کرے جلوہ گری شیشے میں
لختِ دل پھرتے ہیں یا ڈال گئی ہے لاکر — برگِ گل آج نسیمِ سحری شیشے میں
اس نے مانگی تھی مے سرخ ولیکن میں نے — بھر دیا پھول کے خونِ جگری شیشے میں
ٹکڑے ٹکڑے جو تڑق کر یہ ہوا، تھی ساقی — بند کس کی ہوسِ جامہ دری شیشے میں؟
موم ہو جاوے وہیں دیکھے اگر پتھر بھی — دخترِ رز کی یہ جادو نظری شیشے میں
خُم کے خُم ہو گئے خالی مرے مے پینے سے — نہ نمی جام میں اب ہے نہ تری شیشے میں

مصحفی آج تو ساقی کی خوشامد سے ہے ضرور
بھر کے لایا ہے مے بے خبری شیشے میں

۳۲۸

اور اگر پھول و پان دیتے ہیں — ہم تمھیں اپنا جان دیتے ہیں
ایک شب رہ ہمارے پاس، اے بت! — ہم خدا درمیان دیتے ہیں
جان لینے میں اضطراب ہے کیا؟ — لیجیے مہربان دیتے ہیں
ہم نے چاہا بہت کہ بیٹھیں ولے — بیٹھنے آسمان دیتے ہیں؟

وے ہمیں ہیں کہ دستِ دشمن میں　　اپنا تیر و کمان دیتے ہیں
ہم تو بیروں باغ ہی کب کے　ق　مصحفی اپنا جان دیتے ہیں
بخت اُس کے کہ جس کو گلشن میں
جاے یک آشیان دیتے ہیں

۳۲۹

پردہ اٹھا کے مہر کو رخ کی جھلک دکھا کہ یوں　　باغ میں جا کے سرو کو قد کی لچک دکھا کہ یوں
آتشِ گل چمن کے بیچ جب ہمہ سو ہو شعلہ زن　　اپنے لباسِ سرخ کی اس کو بھڑک دکھا کہ یوں
جو کوئی پوچھے، جانِ من! شوخی و جلوہ کس طرح　　لمعۂ برق کی طرح ایک جھمک دکھا کہ یوں
شیشے کے بیچ دخترِ رز کرتی ہے شوخ چشمیاں　　تو بھی ٹک اپنی چشم کی اس کو بھڑک دکھا کہ یوں
نظریں ملاوے گر کوئی تجھ سے کبھی تو جانِ من!　　اس کے تئیں تو دور سے آنکھیں تنک دکھا کہ یوں
کبک و تدرو گر کریں آگے ترے خرامِ ناز　　اپنی خرامِ ناز کی ان کو لٹک دکھا کہ یوں
راتوں کا تجھ سے جاگنا گر کوئی پوچھے، مصحفی
چشمِ ستارہ باز ہیں، اُس کو فلک دکھا کہ یوں

۳۳۰

اور سب تم سے ورے بیٹھے ہیں　　ایک ہم ہیں کہ پرے بیٹھے ہیں
پھٹ چکا جب سے گریباں تب سے　　ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں
شیشۂ مے کی طرح، اے ساقی!　　چھیڑ مت ہم کو، بھرے بیٹھے ہیں
قتل کا کس کے ارادہ ہے جو آپ؟　　ہاتھ قبضے پہ دھرے بیٹھے ہیں
مصحفی یار کے گھر کے آگے
ہم سے کتنے نکھر کر بیٹھے ہیں

۳۳۱

دنیا میں تیری شکل کا ہووے سو کوئی انساں کہاں؟　　یہ چشم کی گردش کدھر، یہ شوخیِ مژگاں کہاں؟
دل جو تماشا دوست تھا، پاتا نہیں اُس کی خبر　　کیا جانے ہو کر رہ گیا وہ غمزدہ حیراں کہاں؟

دیکھ اس کو جوں ہی غش کیا یہ کبھی نہ جانا ہم نے پھر
ساقی کجا؟ مے کس طرف؟ مجلس کدھر؟ جاناں کہاں؟

بیمار تیرے عشق کا، چنگا ہو پیارے! کس طرح؟
یہ تو مرض ہے لا دوا، اس درد کا درماں کہاں؟

عیش و طرب یکسو ہوا، غم آ کے ہم پہلو ہوا
منہ بند کر بیٹھے ہیں ہم، اب وے لبِ خنداں کہاں؟

رنگینیِ عشق اور ہی رکھتی ہے آب و تاب کچھ
رونا مسلّم ابر کا، پر چشمِ خوں افشاں کہاں؟

اس دم کہ ساقی وقفہ ہے، دے لے تو کوئی جام مے
کیا جانے لے جاوے مجھے، پھر گردشِ دوراں کہاں؟

تھا کون ایسا کشتنی، سچ بات کہہ کس سے ٹھنی؟
لو ہو میں بھر آیا ہے تو ظالم! ازہ، داماں کہاں؟

شمشیر و ابرو کی ترے کرتے خریداری وے
سودا زدوں کو ہم سے اب سر ہے تو پھر ساماں کہاں؟

گلیوں کے اندر دھوم ہے میرے جنوں کی ہر طرف
اس عشقِ شہر آشوب کو اب کیجیے پنہاں کہاں؟

میری طرح جامے میں تم ہرگز نہ ٹھہرو اک گھڑی
دیکھا ہے لیک، اے دوستو! تم نے اسے عریاں کہاں؟

یہ تو گماں ہرگز نہ تھا تیری خرد پر مصحفی
دل تو نے اب جا کر دیا افسوس اے ناداں! کہاں؟

۳۳۲

ایک دو گالیاں اُس شوخ کی کھا رہتے ہیں
اپنا جو روز مقرر ہے سو پا رہتے ہیں

مثلِ خورشید ترے کوچے سے ہم، اے غیرتِ ماہ!
شام کو جاویں تو پھر صبح کو آ رہتے ہیں

رہنے والوں نے ترے کوچے کے کیا دیکھا ہے
مجھ سے کس واسطے وے آنکھیں ملا رہتے ہیں؟

بس کہ وہ طفل کچھ ان روزوں میں کُھل کھیلا ہے
بند جامے کے کبھی گر دیکھو تو وا رہتے ہیں

دن کے ہوتے تو کہاں بار ہمیں اُس کو ہیں
پر کبھی چوری چُھپے رات کو جا رہتے ہیں

نہیں معلوم کہ کیا ہم سے ہوئی ہے تقصیر
آپ کچھ اب تو نہایت ہی خفا رہتے ہیں

مجھ کو یہ سوچ ہے جیتے ہیں وے کیونکر یارب
اپنے معشوقوں سے جو شخص جدا رہتے ہیں؟

جی رہو یا نہ رہو اُس کی گلی میں جانا
مصحفی ہم کوئی ان باتوں سے کیا رہتے ہیں؟

۳۳۳

آنسوؤں سے بس کہ یاں رہتا ہے کارِ آستیں | سلکِ گوہر ہو گیا ہے تار تارِ آستیں
دیکھتا ہے جب اُسے اس دیدۂ خونبار پر | حلقِ بسمل ہو نہیں سکتا دوچار آستیں
جس طرح ہو شاخِ گل پر غنچۂ گل خوشنما | اُس کی ساعد پر ہے تکموں سے بہارِ آستیں
روتے روتے جا رہے ہم حلقۂ گرداب میں | اک ذرا یوں ہی کیا تھا کل فشارِ آستیں

دیکھ کر طوفاں کو میرے اشک کے اے مصحفی
ابرِ دریا بار ہوتا ہے نثارِ آستیں

۳۳۴

ابرو سے کہہ، میاں! نہ کرے تیغ رانیاں | منہ موڑ دیں گی ورنہ مری سخت جانیاں
عشقِ بتاں میں کس سے کہوں کیا کیا حصول | تھیں میرے تئیں خدا کو یہ شکلیں دکھانیاں
ہم لطفِ سیرِ باغ کو کیا جانیں، ہم صفیر! | ہم نے تو کیں قفس میں سدا پر فشانیاں
نظارہ دوست ہے یہ دل اتنا کہ نت اسے | وہی دیدہ بازیاں وہی آنکھیں لڑانیاں
پانو میں خار، چشم میں نم، دل پہ داغِ غم | رکھتا ہوں تیرے عشق کی کتنی نشانیاں

اے مصحفی تو عشق میں رسوا بھی ہو چکا
پر بے حیا، گئیں نہ تری شعر خوانیاں

۳۳۵

جس طرح سب جہان میں کچھ ہیں | ہم بھی اپنے گمان میں کچھ ہیں
لختِ دل کچھ گرے ہیں دامن میں | مژۂ خوں فشان میں کچھ ہیں
یہ جو بسمل پڑا تڑپتا ہے | حسرتیں اس کی جان میں کچھ ہیں
ہے زمیں فتنہ گر، ابھی شاید | گردشیں آسمان میں کچھ ہیں

کم نہ جانو انھیں یہ طفلِ سرشک — دیکھو گے ایک آن میں کچھ ہیں
تم جو نت امتحاں کرو ہو مرا — خوبیاں امتحان میں کچھ ہیں
مصحفیؔ دے تو داغِ دل کی خبر
پھول اس گلستان میں کچھ ہیں

۳۳۶

ہم سے کیا کرو نہ میاں! تم ٹھٹھولیاں — سنتے بھی ہو، جو بولتے ہیں لوگ بولیاں
ہم اُس تمامِ ناز کے کشتوں میں ہیں کہ ہائے! — مر مر گئے ہیں جس کی اداؤں پہ لولیاں
ٹک کسمساتے ہوتی ہیں سو سو جگہ سے چاک — ان خوش چھبوں کی ہائے رے یہ تنگ چولیاں
ہم دل بہ کف نہادہ تبھی اُس کے گرد تھے — وہ جن دنوں کہ کھیلتے تھا لڑکوں میں گولیاں
اک ہم ہی خالی ہاتھ چلے اس چمن سے ہائے — گل چیں تو پھول لے گئے بھر بھر کے جھولیاں
اس غش کے بیچ مصحفیؔ ٹھنڈا ہی ہو گیا
اس نے تو اپنی آنکھیں بھی ہے ہے نہ کھولیاں!

۳۳۷

حیراں ہوں اپنے کام کی تدبیر کیا کروں؟ — جاتی رہی ہے آہ سے تاثیر، کیا کروں
شورِ جنوں ہوا ہے گلوگیر کیا کروں؟ — ہے ٹوٹی جاتی پانو کی زنجیر، کیا کروں؟
ناگفتنی ہے حالِ دلِ ناتواں مرا — آتی ہے شرم میں اُسے تقریر، کیا کروں؟
دل مانگتا ہے مجھ سے مجھے بھی دیے بنے — اتنی سی چیز پر اُسے دلگیر، کیا کروں؟
دیکھا جو مجھ کو نزع میں قاتل نے یوں کہا — "اُس جاں بلب پہ کھینچ کے شمشیر، کیا کروں؟"
بن دیکھے اس کے دل کو تسلّی نہیں مرے — نقّاش اس کی لے کے میں تصویر، کیا کروں؟
اے یارو! دردِ دل کی مرے بات ہے کڈھب — مت پوچھو، تم سے اُس کی میں تقریر، کیا کروں؟
پوچھا میں مصحفیؔ سے "ہوا کیوں تو دربدر؟" — بولا کہ "یوں ہی تھی مری تقدیر، کیا کروں؟"

۳۳۸

اب نت کی ہے تری جفا کون؟ — تجھ سا تھ کرے، میاں وفا کون؟

تو شوق سے گالیاں دے ہم کو — ان باتوں کا ماننے ہے برا کون؟

یہ عقدۂ دل ہے سخت عقدہ — دیکھیں تو کرے ہے اس کو وا کون؟

سو بار گیا میں اُس کے در پر — پوچھا نہ کسی نے یہ بھی: "تھا کون؟"

کس واسطے پھر کے تیغ باندھی — جیتا ہوا اب یہاں رہا کون؟

جی جائے تو ہے چلا و لیکن — معلوم نہیں کہ لے چلا کون؟

ہم بہ کے چلے ہیں بحرِ غم میں — اب ہاتھ پکڑ تھما رکھے کون؟

ہر چند سب آشنا ہیں لیکن — اس وقت میں اپنا آشنا کون؟

ہے مصحفی اور بزمِ خوباں
اس بزم میں اس کو لے گیا کون؟

۳۳۹

کیا کہیے کہ کیا ہے یہ دلِ زار بغل میں — اک حق نے دیا ہے ہمیں آزار بغل میں

آتا ہے یہی دل میں جو ملتا ہے وہ تنہا — لے بھاگیے کافر کو کہیں مار بغل میں

تسبیح پہ دینداروں کی مت بھول کہ یہ لوگ — خرقے کے تلے رکھتے ہیں زنّار بغل میں

سامان مرے قتل کا کچھ کم نہیں اس پاس — خنجر جو کمر میں ہے تو تلوار بغل میں

میں حسرتِ آغوش میں مر مر ہی گیا، ہائے! — اک رات بھی آیا نہ مری، یار بغل میں

اے مصحفی! مت آپ سے اس دل کو جدا کر
شیشے کے تئیں رکھتے ہیں میخوار بغل میں

۳۴۰

عاشق ہو مصحفیؔ بھی گر اس کا عیب نہیں
آتا ہے دوڑ دوڑ جو یہ بے سبب نہیں

ہر دم پکارتے ہو کنایے سے کیا میاں
جاؤ جی بیٹھو "اوبے" ہمارا لقب نہیں

کیا تجھ سے شوخ چشم سے آنکھیں ملایئے
آنکھوں میں تیری شرم نہیں کچھ ادب نہیں

جوں ہی کسی نے بات کہی ہم نے رو دیا
وہ حوصلہ کہ تھا ہمیں آگے سو اب نہیں

کیا بیٹھے منہ میں پانی چواتے ہو، دوستو!
دیکھو گے ایک دم میں کہ یہ جاں بلب نہیں

پڑھتے ہیں تیرے واسطے ہم اسم یا عزیز
اے دوست سیم و زر کی ہمیں کچھ طلب نہیں

اک بات پر ہی اس سے تسلی کروں میں دل
پر کیا کروں کہ بات بھی کہنے کا ڈھب نہیں

شب قدر و شب برات سے کیا ہم کو فائدہ
دنیا کے بیچ وصل ہی کی جب کہ شب نہیں

بن حکم کیونکہ بزم میں اس کی قدم رکھوں
عاشق تو ہوں میں مصحفیؔ، پر بے ادب نہیں

۳۴۱

آتا ہے کس کو پیارے راتوں کو خواب تجھ بن!
وہی نت کی آہ و زاری، وہی اضطراب تجھ بن

کیونکر پیوں میں، پیارے! جامِ شراب تجھ بن
ہر قطرہ مے گلو میں ہے زہر ناب تجھ بن

اے میری جان! سچ کہہ کیدھر تو چھپ رہا ہے؟
سر پیٹتے پھریں ہیں یاں شیخ و شاب تجھ بن

پڑھنے کا حرف کیا ہے، از بہرِ فال کھولی
کھولی کبھی جو ہم نے، پیارے! کتاب تجھ بن

گہہ سینہ کوٹتا ہوں، گہہ سر کو پھوڑتا ہوں
یاں سو خرابیاں ہیں، خانہ خراب! تجھ بن

یا رب وہ قطرہ مجھ کو الماس ہو کے لگیو
گر میں کبھی پیا ہو یک قطرہ آب تجھ بن

کب مصحفیؔ کو، پیارے! جینا بھلا لگے ہے
جو دم ہے زندگی کا سو ہے عذاب تجھ بن

۳۴۲

نہ تنہا ہم ہی مثلِ گل گریباں چاک رہتے ہیں
جو تیرے ملنے والے ہیں سبھی غمناک رہتے ہیں

ہر اک دورے میں حسن و عشق کا ہنگامہ برپا ہے
تکلف برطرف، گردش سے کب افلاک رہتے ہیں

اگر جامہ نہیں تو خاک ہی پنڈے کو مل بیٹھے
کوئی آزادہ تن وابستۂ پوشاک رہتے ہیں

زبس ہم کو نہایت شوق ہے امرد پرستی کا
جہاں جاویں وہاں اک آدھ کو ہم تاک رہتے ہیں

گلی کوچوں میں پی پی مے، انھیں بدمستیاں کرنیں
کوئی بدمستیوں سے مردمِ بیباک رہتے ہیں

ہزار آلودہ دامن ہوں نہیں ڈر ان کو محشر کا
جنھوں کے دست و دل ریو و ریا سے پاک رہتے ہیں

پڑا ہے شیخ صاحب کو مزہ لکڑی چبانے کا
کوئی یہ منہ میں اپنے بن کیے مسواک رہتے ہیں

کسی کو وہ نہاں گل رکھ تو کیا بو بھی نہیں دیتا
ہزاروں دیر و مسجد میں رگڑتے ناک رہتے ہیں

جوابِ نامہ کب لکھتا ہے وہ اے مصحفی ہم کو
عبث خط بھیج کر ہم منتظر بر ڈاک رہتے ہیں

۳۴۳

آتشِ غم میں بس کہ جلتے ہیں
شمع ساں استخواں پگھلتے ہیں

وہ ہی دشت اور وہی گریباں چاک
جب تلک ہاتھ پانو چلتے ہیں

دیکھ تیری صفائے صورت کو
آئنے منہ سے خاک ملتے ہیں

جوششِ اشک ہے وہ آنکھوں میں
جیسے اس سے کنویں ابلتے ہیں

دیکھ عارض کو تیرے گلشن میں
سیکڑوں رنگ گل بدلتے ہیں

شوخ چشمی بتاں کی مجھ سے نہ پوچھ
کہ یہ نظروں میں دل کو چھلتے ہیں

دیکھیو شیخ جی کی چال کو ٹک
اب کوئی دم میں یہ پھسلتے ہیں

بن لیے کام دل کا اُس کو، سے
مصحفی ہم کوئی نکلتے ہیں

۳۴۴

دن کو تو سن لو میری میں کچھ بات اگر کہوں
ہاں اس کا ڈر نہیں نہ سنو رات اگر کہوں

ہر بیت میں کنایہ ہے ہر شعر میں ادا
پھر دُور کیا ہے درسِ اشارات اگر کہوں
چپ ہی بھلی ہے، فائدہ کیا ہے، سنے ہے کون؟
میں اپنے دردِ دل کی حکایات اگر کہوں
کہتا ہے ہو کے چیں بہ جبیں "چل بے! دور ہو"
میں اُس سے گاہے بہرِ ملاقات اگر کہوں
آنکھیں جھکی ہی رہتی ہیں کچھ، ان کو مصحفی
برجا ہے ابرِ موسمِ برسات اگر کہوں

۳۴۵

عاشق کو ترے چاہیے کیا ہار گلے میں
بانہوں کے تئیں ڈال دے، اے یار! گلے میں
اللہ رے نزاکت! کبھی کھاتا ہے اگر پان
ہوتی ہے وہیں پیک نمودار گلے میں
یہ تو کہو کس کے ہو، میاں، خون کے پیاسے؟
جو ڈالے ہوئے پھرتے ہو تلوار گلے میں
لازم ہے کہ مقتل کی طرف تب مجھے لے جائیں
جب طوق ہو مانندِ گنہگار گلے میں
ہے دل میں کروں یار کے کوچے میں گدائی
سیلے کے تئیں ڈال کے اک بار گلے میں
جب زور سے زاہد کے میں اک دھول لگائی
سر پر سے اُتر آرہی دستار گلے میں
اے مصحفی کیا مجھ کو کہیں اہلِ مذاہب
تسبیح گلے میں ہے نہ زنّار گلے میں

۳۴۶

کیجیے ظلم، سزاوارِ جفا ہم ہی ہیں
کھینچیے تیغ کہ مدّت سے فدا ہم ہی ہیں
تفتہ دل، سوختہ جاں، چاک جگر، خاک بسر
کیا کہیں مصدرِ صد گونہ بلا ہم ہی ہیں
نہیں موقوف دعا اپنی تو کچھ بعدِ نماز
بیٹھتے اُٹھتے جو مانگیں ہیں دعا ہم ہی ہیں
یہ بھی کوئی طور ہے ٹک جلوہ دکھا چھپ جانا
اور بھی لوگ ہیں ترسانے کو کیا ہم ہی ہیں؟
وہ جو کہلاتے تھے زیں پیش ترے یاروں میں
جانِ من! اب تو ہمیں بھول گیا، ہم ہی ہیں
نہ برہمن کی مشیخت ہے، نہ رہبان کی قدر
اب تو اس میکدے میں نامِ خدا ہم ہی ہیں

عشوہ و ناز ترا ہم سے یہی کہتا ہے — "نہیں کرتے جو کبھی تیر خطا، ہم ہی ہیں"
بے نواؤں کی طرح آکے ترے کوچے میں — وہ جو کر جاتے ہیں اک روز صدا ہم ہی ہیں
آدھی رات آئے ترے پاس یہ کس کا ہے جگر — چونک مت آشنا کہ، اے ہوشربا! ہم ہی ہیں
مصحفیؔ ٹل گئے سب معرکۂ عشق کے بیچ
وہ جو ٹھہرے رہے ہیں ایک ذرا ہم ہی ہیں

۳۴۷

آتا ہے یہی جی میں فریاد کروں، روؤں — رونے ہی سے ٹک اپنا دل شاد کروں، روؤں
کس واسطے بیٹھا ہے چپ اتنا تو اے ہمدم! — کیا میں ہی کوئی نوحہ بنیاد کروں، روؤں
یوں دل میں گزرتا ہے جاکر کسی صحرا میں — خاطر کو ٹک اک غم سے آزاد کروں، روؤں
اس واسطے فرقت میں جیتا مجھے رکھا ہے — یعنی میں تری صورت جب یاد کروں، روؤں
اے مصحفیؔ آتا ہے یہ دل میں کہ اب میں بھی
رونے میں تجھے اپنا استاد کروں، روؤں

۳۴۸

اب میرے تیرے اور ہے کیا یار! درمیاں — اِلّا کہ قصرِ تن کی ہے دیوار درمیاں
تھا دل میں آئنے کے تئیں توڑ ڈالیے — اتنے میں آگیا رخِ دلدار درمیاں
زلفوں سے اس کی ہم نے جو سودا کیا کبھی — دو دو پہر تلک رہی تکرار درمیاں
مرجاوے گر رقیب تو جاوے خلش تمام — اُس گُل کے میرے ہے یہی اک خار درمیاں
حلقوں کو تیری زلف کے اس وقت دیکھیے — جس وقت ہو وہ چاند سا رخسار درمیاں
کل اس کی میری نظروں میں تلوار چل گئی — مارا گیا سو مفت دلِ زار درمیاں
ہم روزِ عیش دیکھ چکے، صبحِ حشر بھی — یوں ہی رہا جو وعدۂ دیدار درمیاں
کیا اس کی چشمِ مست کی دیتا نہ کچھ بھی داد — ہوتا جو کوئی مردمِ ہشیار درمیاں

بگڑا ہی تھا وہ مجھ سے ولے خیر یہ ہوئی
اہلِ محلّہ آگئے دو چار درمیاں

نئیں اس کی صلح و جنگ سے خالی ہر ایک شب
سوتا ہے ساتھ رکھ کے وہ تلوار درمیاں

کب وہ جواب نامے کا بھیجے گا مصحفیؔ
قاصد کو کیوں کرے ہے عبث خوار، درمیاں

۳۴۹

ازبس کہ چشم ترنے بہاریں نکالیاں
مژگاں ہیں اشکِ سرخ سے پھولوں کی ڈالیاں

کیا جانے ہے وہ طرّۂ مقطوع کس کے ہاتھ
آنکھوں میں کاٹتا ہوں میں نت راتیں کالیاں

خط آئے پر بھی یار کا بدلا نہیں مزاج
وہ ہی ادا و ناز ہے، ویسی ہی گالیاں

صیّاد! چاہتا ہے جو بلبل کی زندگی
کنجِ قفس میں رکھ تو گلوں کی پیالیاں

کیا اعتمادیاں کرے، دلا! عزل و نصب کا
ایدھر تغیریاں تو اُدھر ہیں بحالیاں

آنکھوں کا جوشِ اشک سے اب یاں وہ حال ہے
جیسے کہ سیمِ خام سے پر ہوں کٹھالیاں

میرا یہ طفلِ دل تبھی حلقہ بگوش تھا
اے شوخ! جن دنوں تیری زلفیں تھیں بالیاں

امرد پرست جان نہ کیوں دیں کہ مصحفیؔ
دل مرد ہو کے لیتی ہیں یہ چہرے والیاں

۳۵۰

اپنی تو ہجر ہی میں کٹیں راتیں کالیاں
بانہیں گلے میں یار نے کب آکے ڈالیاں؟

اس کی کمر تو کاہے کو پتلی ہے اس قدر
یہ ہم سے شاعروں کی ہیں نازک خیالیاں

اودھر سے شوقِ دید ہے اتنا کہ ہر طرف
دیواروں میں ہیں رخنے تو غرفوں میں جالیاں

لوہو بھرا ہے ہاتھ، حنائی نہ بوجھیو
ازبس کہ اس نے کتنوں کی جانیں نکالیاں

کرتی ہیں خون سیکڑوں تجھ کو بتاؤں کون
پانو کی سرخیاں، ترے ہونٹوں کی لالیاں

کل کر رہا تھا غیر سے نظروں میں گفتگو
پر دیکھتے ہی کچھ مرے آنکھیں چرالیاں

اے مصحفی تو ان سے محبت نہ کیجیو
ظالم غضب ہی ہوتی ہیں یہ دلّی والیاں

۳۵۱

اوروں کی دید بازیاں نظروں میں ٹالیاں — دیکھا جو ہم نے اُس کو تو آنکھیں نکالیاں
میرے جنوں کے خوف سے ہر صبح باغ میں — جوں شاخِ بید کانپیں ہیں پھولوں کی ڈالیاں
دیوانہ کون رقص کرے ہے جو ہر طرف — لڑکے بجاتے پھرتے ہیں گلیوں میں تالیاں
طوطی شکر شکن ہے، لبِ یار! کچھ تو بول — کیدھر گئیں وہ اب تری شیریں مقالیاں
معشوقِ تنگ چشم ملا ہم کو ہم نشیں! — باور نہیں تو دیکھ لے برقعے کی جالیاں
دل میں خیالِ زلف سے طوفاں نہ کیونکہ ہو — اکثر گھٹائیں اُٹھتی ہیں ایدھر سے کالیاں
کرتی ہیں خون سیکڑوں عاشق کے مصحفی
جس وقت پان کھاتی ہیں یہ چوڑے والیاں

۳۵۲

"کچھ ہماری بھی تمھیں فکر ہے اب یا کہ نہیں؟" — جوں ہی یہ بات کہی اس سے تو بولا کہ "نہیں"
اپنا سا ہم نے تو اس دل کو بہت سمجھایا — اس کی خاطر میں بھی کیا جانے کچھ آیا کہ نہیں
وائے قسمت! کہ جو کی وصل کی گاہے درخواست — در جواب اس نے یہی نامے میں لکھّا کہ "نہیں"
دسترس ہی جو نہ ہو اُس پہ تو ناچاری ہے — کونسی ورنہ مرے دل میں تمنا کہ نہیں
وہ ابھی برق کی سی جھمکی دکھا جاتا رہا
مصحفی غرفے سے تو نے اسے دیکھا کہ نہیں؟

۳۵۳

دل! تری بیقراریاں کیا تھیں؟ — رات وے آہ وزاریاں کیا تھیں؟

تیرے پہلو میں اُس کی مژگاں سے — برچھیاں یا کٹاریاں کیا تھیں؟
سرمہ دینے میں اُس کی آنکھوں کی — کیا کہوں آبداریاں کیا تھیں!
اپنا عاشق نہ تھا تو آئنے میں — نظریں وے پیاری پیاریاں کیا تھیں
جی کے دشمن بھلا یہ بتلا تو — میرے دشمن سے یاریاں کیا تھیں
اپنی قسمت میں، آہ کس سے کہوں — ذلّتیں اور خواریاں کیا تھیں
مصحفی گر نہ تھا تو عاشقِ زار
پھر تو یہ جاں نثاریاں کیا تھیں

۳۵۴

سدا خمیازہ ہی کھینچا، سدا کرتے رہے آہیں — نہ سوئے ڈال کر اک شب گلے میں یار کے بانہیں
قیامت تو غضب یہ ہے کہ یار وجس کو ہم چاہیں — وہ اپنے روبرو ڈالے گلے میں غیر کے بانہیں
غنیمت جان گلگشتِ چمن، زاہد! بہشتوں میں — کہاں یہ سبزہ، یہ آبِ رواں یہ تاک کی چھاہیں؟
سرِ رہ روک کر گر اُس کا ہم بیٹھے تو کیا حاصل — کوئی آتا ہے اس رستے سے وہ؟ اس کی ہیں سو راہیں
نشاں ہرگز نہ دلّی میں رہا صاحب کمالوں کا — ہوئیں با خاک یکساں کیسی کیسی ہائے درگاہیں
عجائب رسم ہے ہیہات! اقلیمِ محبت کی — وہ الٹا دشمنی کرتا ہے ہم سے، جس کو ہم چاہیں
تو کس کی یاد میں، اے مصحفی! جوں ابر روتا ہے؟
کہ بجلی کی طرح کوندیں ہیں، اے ظالم! تری آہیں

۳۵۵

کہتے ہیں مہر و وفا جس کو جہاں میں وہ نہیں — وہ جو اک چیز ترحم تھی بتاں میں وہ نہیں
اتنا پرہیز عبث کرتے ہو اس عاجز سے — تم جو کچھ سمجھے ہو سو اپنے گماں میں وہ نہیں
بہ گیا آنکھوں سے دل آب ہو، کیا جانے کدھر — اشک تو ہیں مژۂ اشک فشاں میں، وہ نہیں
لالہ پژمردہ، گل افسردہ، ہے نرگس بیمار — رنگ اس باغ کا ایّامِ خزاں میں وہ نہیں

وہ جو اک ناز خرامش میں تری نکلے ہے   خوش خرامی روشِ آبِ رواں میں وہ نہیں

مصحفی بے رخیِ گل سے سبھی نالاں ہیں
کون وہ مرغِ چمن ہے کہ فغاں میں وہ نہیں

۳۵۶

کون کافر یہ کہے "دیدار کی خواہش نہیں"   جی تو چاہے ہے ولیکن یار کی خواہش نہیں
حال پر اس تشنہ جاں کے اک نگاہِ لطف ہو   مجھ کو ساقی ساغرِ سرشار کی خواہش نہیں
کیا دکھاتے ہو ہمیں مژگان و ابرو دم بدم   یاں کسی کو خنجر و تلوار کی خواہش نہیں
اس پہ یہ موئے پریشاں بس ہیں سایے کے لیے   اس سرِ شوریدہ کو دستار کی خواہش نہیں
جب تلک ہیں تازہ و تر داغ سینے کے، صبا!   ہم اسیروں کو گل و گلزار کی خواہش نہیں
فائدہ کیا ہے کہ اب صحرا سے آویں سوے شہر   دین و دنیا سے گئے گھر بار کی خواہش نہیں

ہو چکا دل سیر جینے سے بہت، اے مصحفی
اب بجز مردن کچھ اس بیمار کی خواہش نہیں

۳۵۷

یا نہ ہوتی تھی کبھی اک مژہ تر پانی میں   یا پڑے بہتے ہیں اب لختِ جگر پانی میں
آج بے طرح تو رونا ہے چلا، اے قاصد!   میرا مکتوب کہیں کیجو نہ تر پانی میں
کیوں نہ اس رشک سے میں ڈوب مروں یارو! وہ شوخ   جاتا ہے پیرنے کو شام و سحر پانی میں
گریہ یاں تک میں کیا ہے کہ کھڑے ہیں احباب   کوئی تا زانو کوئی تا بہ کمر پانی میں
جھاڑے بال اس نے نہا کر تو گریں یوں بوندیں   تو کہے ٹوٹ پڑی سلکِ گہر پانی میں
آسماں پر وہ دکھاوے وہیں دن کو تارے   جھانکے ہو کر عرق آلودہ اگر پانی میں
بیچ دریا کے بھی ہوتی نہیں کم سوزشِ دل   گرچہ رہتے ہیں کھڑے دو دو پہر پانی میں
گریہ عاشق کو نہیں مانعِ نظارۂ یار   سچ ہے ماہی کو سب آتا ہے نظر پانی میں

ہم نہ کہتے تھے کہ اے مصحفیؔ تو اتنا نہ رو
عاقبت ڈوبا ہی ان آنکھوں کا گھر پانی میں

۳۵۸

کھولی زلف اس نے جو نہیں تا بہ کمر پانی میں
تھرتھری پڑ گئی ہر لہر اوپر پانی میں

رنگ گریے کا نہیں ایک ترے عاشق کے
آستیں خوں میں تو رومال ہے تر پانی میں

سیرِ دریا کو جو اُس بن میں کبھی جاتا ہوں
لہریں تلوار سی آتی ہیں نظر پانی میں

داغِ دل وہ نہیں جو سینے سے منفک ہووے
شست و شو کیجیے تا حشر اگر پانی میں

طرح مچھلی کے پڑا پیرے ہے یہ طفلِ سرشک
ہائے! مطلق نہیں لگتا اسے ڈر پانی میں

کشتۂ عشق کے مٹتا ہے کوئی خوں کا نشاں
باندھ کر لوٹ ڈبو دیویں اگر پانی میں

ابھی سر پیٹ چلے جاویں گے سب ماہی گیر
سر کے بالوں کو پریشان نہ کر پانی میں

یہ وہ آنکھیں ہیں کہ گھڑیال کے پیالے کی طرح
رہتی ہیں گریے سے اب آٹھ پہر پانی میں

مصحفیؔ آج جو آنکھوں سے گرے آنسو گرم
آتشِ دل نے کیا شاید اثر پانی میں

۳۵۹

ٹک سمجھ کر تو نہانے کو اُتر پانی میں
شکل آغوش ہے ہر ایک لہر پانی میں

دیدۂ تر میں عجب کیا ہے جو لہراوے وہ زلف
سانپ کا بھی کہیں ہوتا ہے گزر پانی میں

کبھی دیکھی بھی ہے دریا پہ چراغاں کی بہار؟
یوں جھمکتے ہیں مرے لختِ جگر پانی میں

دیدۂ تر سے ہو جو پائے رموزِ فلکی
ماہِ نو گم ہو تو دیکھیں ہیں بشر پانی میں

گریے کے ہاتھوں سے کیا دل کی پھر آبادی ہو
طرح یونان کی، ڈوبا یہ نگر پانی میں

اشکِ جاری کے مرے منع کی اب وہ ہے مثال
جیسے بہتے کو کہے کوئی ٹھہر پانی میں

بحرِ گریہ سے نہ نکلیں کبھی یہ چشمِ پر اشک
نت رہیں جوں صدفِ پُر ز گہر پانی میں

جھلکے ہے یوں وہ بدن جامۂ شبنم سے تمام
شوخیاں جیسے کرے عکسِ قمر پانی میں

شعلہ رُو آگے ترے حسن کے ہو کر کے عرق
شمع خجلت سے ہوئی جاتی ہے تر پانی میں

ہم نے کیا دیکھا کہ جس دن سے کھلیں یہ آنکھیں
فرطِ گریہ سے رہیں آٹھ پہر پانی میں

قلزمِ عشق کا ڈوبا کوئی ہاتھ آتا ہے
سیکڑوں جال بھی واں ڈالیں اگر پانی میں؟

آئی رَو اشک کی ناگہ تو وہیں بیٹھ گئے
ہم سے کچھ ہو نہ سکا فکرِ دگر پانی میں

مصحفیؔ اتنا بھی بے صرفہ نہ رُو، خانہ خراب!
ایک عالم کے تئیں غرق نہ کر پانی میں

۳۶۰

جو کھولے بال اپنے وہ بتِ بے پیر پانی میں
عجب کیا ہے پریشانی کرے تاثیر پانی میں

مصوّر گر ترے چہرے کی دیکھے رنگ آمیزی
ڈبو دے لے کر اپنے کاغذِ تصویر پانی میں

فلاطوں گریہ کیا کرتا ہے یوناں کی خرابی پر
یہاں ایسی ہزاروں ہو گئیں تعمیر پانی میں

یہ دریا یا کہ اک رزمیۂ صورت نگاراں ہے
کہ لہروں سے کھنچی ہیں جا بجا شمشیر پانی میں

مجھے دم لینے کب دیتا ہے یہ طوفان گریے کا؟
کروں کیا بن نہیں آتی ہے کچھ تدبیر پانی میں

مہوّس رنگ کندن سا ترا اگر اک جھلک دیکھے
بہا دے پھاڑ کر سب نسخۂ اکسیر پانی میں

بھنور سے عکسِ مہ نے گرد اپنے خط سا کھینچا ہے
پڑھے جیسے پری خواں دعوتِ تسخیر پانی میں

وہ مجھ خشکی رواں کی سختیِ منزل کو کیا جانے
جو ماہی کی طرح کرتا ہو نت شبگیر پانی میں

مرا دریائے نیلِ گریہ اس شورش سے بہتا ہے
کہ پیلِ مست کھینچے جس طرح زنجیر پانی میں

اگر، اے ماہیِ دریائے خوبی! تجھ کو ٹک دیکھے
نہ پھینکے بارِ دیگر جال ماہی گیر، پانی میں

نہ دیکھی ایک دن صورت یہ اُس نے، گرچہ پلکوں سے
میں خوں رو رو کے کھینچیں سیکڑوں تحریر پانی میں

مشبّک کر دیا ہے بس کہ اُس کو تیری پلکوں نے
نظر آتا ہے عکسِ ماہ جوں کفگیر پانی میں

صفا اس کی بنا گوش اور موتی کی میں کیا لکھوں
ملا رکھا ہے ہم رنگی سے اس نے شیر پانی میں

نہ اس کی ناوکِ مژگاں کا کشتہ اک فقط میں ہوں
ہوئے ہیں مردمِ آبی تلک نخچیر پانی میں

نہ تھا میں مصحفی اتنا گنہ گار اس کا، کیا کہیے
ڈبویا مجھ کو چشمِ تر نے بے تقصیر پانی میں

۳۶۱

ہماری طرف آپ کم دیکھتے ہیں — وے آنکھیں نہیں اب جو ہم دیکھتے ہیں
تو آوے نہ آوے ولے ہم تو ہر شب — تری راہ تا صبحدم دیکھتے ہیں
بہت جھوٹے وعدے کیے تو نے ہم سے — بھلا یہ کبھی تیری قسم دیکھتے ہیں
ہمیں جستجو کس کی در پیش آئی؟ — عرب ڈھونڈتے ہیں عجم دیکھتے ہیں
بہت دیکھا دنیا کو جاتے ہیں، یارو! — ذرا اب تو ملکِ عدم دیکھتے ہیں
یہی خط نویسی ہے ہر دم کی اس کو — تو ہاتھ اپنے اک دن قلم دیکھتے ہیں
بھروسا ہے کیا دم کا، یعنی کہ یاں کی — ہوا مختلف دمبدم دیکھتے ہیں

پڑے ہے نظر عیب ہی پر انھوں کی
ہنر مصحفی یار کم دیکھتے ہیں

۳۶۲

یا تو رہتا تھا وہ رخ شام و سحر آنکھوں میں — یا اب اک جھپکی کو ترسے ہے نظر آنکھوں میں
جس پہ کی ایک نظر ہو گیا وہ دیوانہ — اس پری زاد کی جادو ہے مگر آنکھوں میں
لے گیا آنکھ ملا دل کو مرے سب کے حضور — کر گیا وہ بتِ کافر تو ہنر آنکھوں میں
رنگ گریے کا ہم ان یاروں کو دکھلا دیں گے — آن جھمکا جو کوئی لختِ جگر آنکھوں میں
کرکے صورت کو تری یاد، میں اے لختِ جگر — اتنا رویا ہوں کہ آیا ہے جگر آنکھوں میں
اک گھڑی یاد سے بھولا نہ خیالِ رخِ دوست — یاں وہی شکل رہی آٹھ پہر آنکھوں میں
ہم سے ساغر کشیِ شب کا تم اخفا نہ کرو — نشّہ مے کا ہے اب تک بھی اثر آنکھوں میں
میں نظر بھی نہ کروں ان پہ کبھی، گر مہ و سال — پتلیاں بن کے رہیں شمس و قمر آنکھوں میں

گریہ آنکھیں ہیں تو اک روز بلا لاویں گی　　اس قدر، جان مری! اسر مہ نہ کر آنکھوں میں

مصحفی! کسبیوں کا منہ نہ تک، اے خانہ خراب!　ق　ورنہ رہ جائے گا اگر کر گئے گھر آنکھوں میں

ہیں یہ وے لوگ کہ دل کے تئیں لے جاتے ہیں
بہ کنایت، بہ اشارت، بہ نظر آنکھوں میں

۳۶۳

عشق ہے، آفت و بلا تو نہیں!　　اس کا مارا کوئی جیا تو نہیں

دل کی تڑپوں میں آن نکلے ہے　　دیکھیو کشتۂ ادا تو نہیں؟

پوچھتا کیا ہے حال دل کا مرے　　او میاں! تجھ سے کچھ چھپا تو نہیں

تو جو اس کی گلی میں جاتا ہے　　کہیں، اے دل تیری قضا تو نہیں؟

یعنی عاشق ہو اور ہر جائی　　اب تلک ہم نے یہ سنا تو نہیں

یوں جو تو، منہ پھرائے بیٹھا ہے　　کیوں میاں! مجھ سے کچھ خفا تو نہیں

بات پر اس کی میں جو بولا کہ 'کیا؟'　　کہا کچھ ذکر آپ کا تو نہیں

کس طرح سجدہ کیجیے اس کو　　ہے وہ بت بت ہی کچھ خدا تو نہیں

شیشۂ دل کو بیچتے ہیں ہم　　اک نگہ پر، گراں بہا تو نہیں

سودا اچھا ہے گر میاں صاحب!　　لے چکو تم تو کچھ برا تو نہیں

مصحفی! سچ تو کہہ، تو روتا ہے کیوں؟
کچھ کسی نے تجھے کہا تو نہیں؟

۳۶۴

قرآں میں نہ کسی کی ہم فال دیکھتے ہیں　　اپنے ہی چاکِ دل کا احوال دیکھتے ہیں

سرو رواں کی اپنے ہم چال دیکھتے ہیں　　ہوتا ہے ایک عالم پامال دیکھتے ہیں

کیا کیا ہمارے دل میں آتا نہیں، جب اس کی　　لپٹی ہوئی کمر سے اک شال دیکھتے ہیں

فتنے نے جن سے آگے ہرگز قدم نہ رکھا ۔ ان محشروں کو اس کے دنبال دیکھتے ہیں
بہتے ہیں اس گلی میں ہر سو لہو کے نالے ۔ رنگِ زمانہ اور ہی اس سال دیکھتے ہیں
معشوقِ سادہ رو پر دل دے گذرتے ہیں ہم ۔ نے زلف دیکھتے ہیں نے خال دیکھتے ہیں
یا دل کو دیکھتے تھے پہلو میں اپنے ہر دم ۔ یا ہم اب اس کی جاگہ اک بھال دیکھتے ہیں
اے مصحفی تجھے کیا رونے کی خو پڑی ہے
آنکھوں پہ تیری اکثر رومال دیکھتے ہیں

۳۶۵

مستی میں تفِ دل سے اگر نالہ کروں میں ۔ ہر لب گرو ساغرِ بتخالہ کروں میں
گر سحر طرازی کے اوپر آؤں تو وہ ہیں ۔ جو نقش کہ کھینچوں اسے گوسالہ کروں میں
اے لختِ جگر! تیری مدد ہووے تو شاید ۔ مژگاں کے حوالے کوئی پرکالہ کروں میں
سینہ مرا داغوں سے گلستان ہوا ہے ۔ ہے وقت کہ سیرِ چمنِ لالہ کروں میں
اے مصحفی اتنا بھی غنیمت ہے جو گاہے
دل خوش بہ سخن سازیِ دلالہ کروں میں

۳۶۶

کیونکہ ہر گل کے تئیں چاک گریباں دیکھوں ۔ ہائے ان آنکھوں سے یہ رنگِ گلستاں دیکھوں
کیا مصیبت ہے کھلے آنکھ تو رونا آوے ۔ اور جو جھپکے تو وہیں خوابِ پریشاں دیکھوں
خط تو لکھا ہے پہ تدبیر بتا، اے قاصد! ۔ صورتِ یار کو میں بھی کسی عنواں دیکھوں
کاش سوتا ہی رہوں میں کہ نہیں چاہتا دل ۔ ہر سحر اٹھ کے رخِ گبر و مسلماں دیکھوں
درِ جنت پہ بھی زنہار نہ رکھوں میں قدم ۔ گر ذرا چیں بہ جبیں صورتِ یاراں دیکھوں
یہ بھی قسمت ہے کہ جب اس کی گلی میں جاؤں ۔ تلخیِ غیر و ترش روئیِ درباں دیکھوں
لا رکھو آگے مرے کوئی مرقع ہی ذرا ۔ تا میں اس میں تو بہم صورتِ یاراں دیکھوں

کہتے ہیں جس کے تئیں وصل کا دن دنیا میں　　میں بھی وہ دن کبھی، اے گردشِ دوراں دیکھوں
چشم تر گوشۂ بہ امیدِ ترحم رکھوں　　تو جو آوے نہ نظر صورتِ حرماں دیکھوں
ہائے جن آنکھوں سے دیکھا ہوں میں روئے شبِ وصل　　کیونکہ ان آنکھوں سے روئے شبِ ہجراں دیکھوں
ہر بنِ مو پہ مرے داغ تھا، دل میں اس کے　　یہ نہ آیا کہ تماشائے چراغاں دیکھوں
ہائے وہ دل کہ جسے میں نے بغل میں پالا　　اب اسے یوں ہدفِ ناوکِ مژگاں دیکھوں

مصحفی شہر سے دل سخت تنگ آیا ہے
جی میں آتا ہے کہ ٹک جا کے بیاباں دیکھوں

۳۶۷

دنیائے دوں کی اپنے تئیں چاہ ہی نہیں　　شکرِ خدا کہ آرزوئے جاہ ہی نہیں
کرنے ہلاک تشنہ لبی مجھ کو لے گئی　　اس سرزمین میں کہ جہاں چاہ ہی نہیں
یا تیرگی سے روئے ہوا ہو گیا سیاہ　　یا آسماں پہ ہجر کی شب ماہ ہی نہیں
بیٹھے ہیں چپکے کس سے سرِ حرف وا کریں　　اس بزم میں کسی سے ہمیں راہ ہی نہیں
لکھا ہے اس نے خط میں ہر اک شخص کو سلام　　ایک اس میں نامِ بندۂ درگاہ ہی نہیں
اتنے بے خود گئے ہیں کہ اس انجمن کے بیچ　　کوئی کسی کے حال سے آگاہ ہی نہیں
اے دل! شبِ فراق سے مت ڈھونڈ روشنی　　یہ ہے وہ شب کہ جس کی سحرگاہ ہی نہیں
ملنے کی تیرے ہم کو بہت آرزو ہے، یار!　　پر کیا کریں کہ مرضیِ اللہ ہی نہیں

اے مصحفی ہر اک کو سخن کا غرور ہے
طرزِ سخن سے پر کوئی آگاہ ہی نہیں

۳۶۸

ہے نت سرِ شوریدہ مرا چاکِ قفس میں　　بیتاب ہوں نظارۂ گلشن کی ہوس میں
کم عمری میں جو دیکھے ہے حسن اس کا کہے ہے　　یہ طفل غضب ہووے گا دو چار برس میں

ہوں شانہ نہ چھوڑوں گا کبھی ہاتھ سے ان کو
زلفوں کے تری بال اگر آ گئے بس میں

اغلب ہے کہ فریاد سے اک لحظہ نہ چپ ہو
اس دل کو اگر تعبیہ کر دیجے جرس میں

مژگاں پہ مرے لختِ جگر جھمکیں ہیں جیسے
دیکھا نہیں یوں ربط کہیں شعلہ و خس میں

جوں شمعِ سحر اتنا نہیں عمر کا وقفہ
یاں کام ہے اپنا تو تمام ایک نفس میں

اے مصحفی، افسوس! ہے ان لوگوں سے شطرنج
جو فرق نہیں کرتے کبھو پیل و فرس میں

۳۶۹

اب مرغِ دل اپنا تو ہے صیّاد کے بس میں
خواہی اسے ہاتھوں میں رکھے خواہ قفس میں

دیکھا نہ کبھی تو نے، میاں! آنکھیں اٹھا کر
ان کو جو موئے جنبشِ مژگاں کی ہوس میں

پھرتا ہے اِدھر زلف میں شانہ تو اُدھر دل
اک لاگ چلی جاتی ہے جوں دزد و عسس میں

نیّات اگر یہ ہیں تو دیکھو گے زمانہ
اس سے بھی بتر ہووے گا ایک آدھ برس میں

کیا جانیے کیدھر کو گیا محملِ لیلیٰ
وہ ہوش ربائی نہیں آوازِ جرس میں

گر ناخنِ فریاد کرے عقدہ کشائی
سو زمزمے پنہاں ہیں مرے تارِ نفس میں

اے مصحفی مشکل ہے غزل ایک سی کہنا
اک بیت کہیں اچھی بھی ہو جاتی ہے دس میں

۳۷۰

نہ ہر دم ہر گھڑی اس ذلّت و خواری پہ روتا ہوں
میں تھا آزادہ دل، اپنی گرفتاری پہ روتا ہوں

الٹ کر گر پڑا ساغر مرا کل دستِ ساقی سے
تبھی تو طالعوں کی میں نگونساری پہ روتا ہوں

مجھے وقتِ وداعِ دوستداراں یاد آتا ہے
میں نت ناچار ہو کر اپنی ناچاری پہ روتا ہوں

مرا دل زلفوں کے حلقوں سے ہرگز چھٹ نہیں سکتا
میں اس بیمار کی پر پیچ بیماری پہ روتا ہوں

زمانہ سیم و زر سے مصحفی ایسا تھا کب خالی؟
نہ اپنی مفلسی عالم کی ناداری پہ روتا ہوں

۳۷۱

جو عاشق ہیں مضموں نیا باندھتے ہیں
ہر اک بات میں چٹکلا باندھتے ہیں

جو کرتے ہیں زلفوں کو اس کی حمائل
گلے سے وہ اپنے بلا باندھتے ہیں

میں کب سرمہ آنکھوں میں اس کی دیا ہے
یونہیں یار اک توتیا باندھتے ہیں

خدا جانے نکلیں گے کب گھر سے باہر
ابھی وے تو بندِ قبا باندھتے ہیں

غلط ہے کہ زلفوں سے اس کی بندھا ہے
مرے دل پہ یہ افترا باندھتے ہیں

فلک کی خبر کب ہے ناشاعروں کو
یونہیں گھر میں بیٹھے ہوا باندھتے ہیں

بلا پُر خرد ہیں یہ خونخوار لڑکے
کہ چہرے میں زلفیں ملا باندھتے ہیں

گلی میں تری آنے جانے سے، اے گل!
جو ہم ہیں تو پائے صبا باندھتے ہیں

وہی ایک معنی ہیں اس نُہ ورق میں
کہ جس کو بہ چندیں ادا باندھتے ہیں

ہم اس باغ سے اب تو رختِ سفر کو
بہ تکلیف بانگِ درا باندھتے ہیں

جو جیتے ہیں تو مصحفی آشیانہ
کسی شاخِ گل پر پھر آ باندھتے ہیں

۳۷۲

اگر اے برقِ عالم سوز! یہ ہیں تیری اچپلیاں
تو ہم کو ٹھہرنے دیں گی نہ یک جا دل کی بیکلیاں

گل اپنے دورِ پیراہن پہ اس گلشن میں نازاں تھا
پہ ششدر رہ گیا دیکھیں جو کُرتے کی ترے کلیاں

کوئی ہندوستاں میں کم کسی کی داد کو پہنچا
موے لاکھوں ہی عاشق اور ہزاروں ستّیاں جلیاں

قیامت ماجرا اس ناچ میں گزرا سحر ہوتے
کہ اک عالم کو کافر لولیاں پامال کر چلیاں

ملایا خاک میں یوں نوخطوں کو تیرے عارض نے
کسو نے کے جیسے چینٹیاں تلووں تلے ملیاں

بچا شمشیرِ ابرو اور کمندِ زلفِ پُرچیں سے
نہ پوچھو کیسی کیسی آفتیں سر سے مرے ٹلیاں

نہیں آساں ملا اے مصحفی دیدار عصمت کا
پھرا ہوں ڈھونڈتا مدت تلک میں شہر کی گلیاں

۳۷۳

آرام سے اک دن کبھی ہم بیٹھے نہ گھر میں
رکھا تری خواہش نے ہمیں روز سفر میں

صدقے ہوں میں پیارے ترے دانتوں کی چمک کے
یہ ہووے ہے شفافی کہاں سلکِ گہر میں

کیا تو بھی مری طرح سے عاشق ہے کسی کا؟
اے لالے! بتا کیوں ہے ترے داغ جگر میں؟

اے لختِ جگر، روز تری راہ تکوں ہوں
رکھا نہ قدم تو نے کبھو دیدۂ تر میں

وعدہ نہ کیا وصل کا، باتیں ہی بنائیں
گر ہم سے کبھی مل بھی گیا راہ گزر میں

اے آئنے! ہر چند کہ تو سادہ نما ہے
پر تیری نظر بازیاں ہیں اپنی نظر میں

اے مصحفی اتنا بھی کوئی سووے ہے غافل
اٹھ صبح ہوئی صرفہ ہے کیا خواب سحر میں

۳۷۴

شاید کہ ہم سے پھر نگہیں یار کی پھریں
کچھ ان دنوں میں آنکھیں لگیں یار کی پھریں

دل کی طرف کو پلکیں جوں ہی یار کی پھریں
لوکیں جگر میں پیرتیاں خار کی پھریں

کس کا بیان تجھ سے کروں؟ تیرے عشق میں
کیا کیا نہ حالتیں کہ دلِ زار کی پھریں

کہہ کس سے رفتگی ہوئی پیدا؟ کہ ان دنوں
طرزیں تمام ہیں تری رفتار کی پھریں

لایا کبھی نہ رو بہ شفا عشق کا مرض
سو صورتیں اگرچہ اس آزار کی پھریں

لوٹے مزے اسی نے یہاں، جس ذبیح کے
چھریاں گلے پر اس بتِ خونخوار کی پھریں

گہہ سرخ، گاہ زرد ہوا سب ہوا کا رنگ
کیا کیا ہوائیں اب کے چمن زار کی پھریں

ٹھہرا نہ ایک وضع پہ تیرا مزاج، شوخ!
سو وضع بندشیں تری دستار کی پھریں

دل گم ہوا مرا تو تری زلف کی لٹیں
سینے میں ڈوری ڈوری طرح مار کی پھریں

مژگاں کی فوج نے وہیں گھوڑے اٹھا دیے
باگیں جدھر کو ٹک نگہِ یار کی پھریں

کس کی مریض ہے یہ کہ کچھ دیکھتا ہوں میں
آنکھیں چمن میں نرگسِ بیمار کی پھریں

گر آ گیا زمانہ کبھی پھر بھی پہ ٹک
دیکھو گے صورتیں درو دیوار کی پھریں

کافر تو ہوگئے تری زلفوں کو دیکھ کر | ازبس کہ نیتیں اولی الابصار کی پھریں

اے مصحفی زمانہ بیک وضع ہی رہا
کج خوئیاں نہ چرخِ ستم گار کی پھریں

۳۷۵

پیچھے لگی وہ زلفیں دلِ زار کے پھریں | یاں تک کہ آخرش کو اسے مار کے پھریں
من بعدِ مرگ میرے مرے دل کی خواہشیں | اک عمر گرد آرزوے یار کے پھریں
رم خوردہ صید کون ہے وہ؟ جس کے شوق میں | زلفیں تری کمندیں بغل مار کے پھریں
مارِ سیاہِ زلف کو دیکھا جو حلقہ زن | نظریں نہ گرد اس گلِ رخسار کے پھریں
کیا کیا نہ ماہ پارہ تری آرزو کے بیچ | پردے میں مُنہ چھپائے شبِ تار کے پھریں
دم عشق کا بھریں تھیں جو دو چار حسرتیں | وہ پاس بھی نہ آ دلِ بیمار کے پھریں
تھا قصدِ سیرِ عرش ان آہوں کو شب ولے | جب واں تلک پہنچ نہ سکیں ہار کے پھریں
گر اس نے گل رکھا کبھی چہرے پہ، بلبلیں | جوں پیچ گردِ چہرۂ گلنار کے پھریں

کیا کیا نہ حورِ چہرہ کہ بالوں کو کھول کر
گردِ مزارِ مصحفیِ زار کے پھریں

۳۷۶

نے محرمِ قفس نہ شناساے باغ ہیں | ہم اپنی بے نصیبی کے ہاتھوں سے داغ ہیں
اک دن ہم اس چمن سے اٹھا لیں گے آشیاں | بلبل کے چہچہوں سے بہت بے دماغ ہیں
لائے ہیں پاے چرخ جو انجم سے آبلے | یہ ایک کس کی راہ میں گرمِ سراغ ہیں

ہاتھوں سے جل رہا ہوں میں کس کے جو مصحفی
سینے کے داغ جیسے کہ روشن چراغ ہیں

۳۷۷

کب ہیں نرگس کی یہ ایں شوخ ادائی آنکھیں؟ — ان نے تیری سی کہاں پائیں ہوائی آنکھیں

ایک تو ہر مژہ اس شوخ کی رُو گرداں ہے — تس پہ ہر لحظہ بتاتی ہیں رکھائی آنکھیں

سخت دیکھا ہیں الم ان سے، بہت بہتر تھا — پھوٹ جاتیں جو مری روزِ جدائی آنکھیں

سادگی ان کی مجھے ذبح کرے ہے یارو! — بس کہ اس شوخ کی رکھتی ہیں صفائی آنکھیں

بے بصر ہوتے ہیں محتاج عبث عینک کے — کام آتی نہیں زنہار پرائی آنکھیں

کھول کر آنکھیں ذرا سیرِ جہاں کر کہ یہاں — ذرّے ذرّے میں دکھاتی ہیں خدائی آنکھیں

ایک دن اس کی کفِ پائے ملیں تھیں میں نے — ہو گئی ہیں مری اس دن سے حنائی آنکھیں

حسن کو پردہ نشیں ہووے پرکھ جاتے ہیں — جن نظر بازوں کی رکھتی ہیں رسائی آنکھیں

یارب اپنی بھی کبھی رخنۂ دیوار کی طرح — حرم وصل میں کر گئی تھیں رسائی آنکھیں

ایک دن در پر کھڑے اس کو کبھی دیکھا تھا — تب سے دیدار کی کرتی ہیں گدائی آنکھیں

مصحفی کو نہ رہی طاقتِ نظارہ دریغ
اس نے سیں دیکھ تری تنگ قبائی آنکھیں

۳۷۸

حرکات اس کی سے نکلیں ہیں ادائیں لاکھوں — کیوں نہ دوں اس کے تئیں دل سے دعائیں لاکھوں

کوچۂ زلف میں اک رات میں جا نکلا تھا — دوڑیاں اٹھ کے مرے پیچھے بلائیں لاکھوں

باز آتے نہیں ہم تو بھی زیاں کاری سے — گرچہ اس عشق میں پاتے ہیں سزائیں لاکھوں

شیشۂ دل کو مرے یارا نہ پتھر پہ پٹک — ورنہ نکلیں گی ابھی اس سے صدائیں لاکھوں

ناز بردارِ بتاں ہم تو رہے تالبِ گور — مرتے مرتے بھی سہیں ان کی جفائیں لاکھوں

ہوجے ہرگز نہ دلا! عفوِ خدا سے نومید — بخش دیتا ہے وہ اک دم میں خطائیں لاکھوں

مصحفی خوابِ عدم سے کوئی اب اٹھتا ہے
گو اسے آن کے عیسیٰ سے جگائیں لاکھوں

۳۷۹

کیوں نہ لوں وصل کی شب تیری بلائیں لاکھوں
میں تیرے واسطے مانگی ہیں دعائیں لاکھوں

وائے قسمت کہ شفا مجھ کو میسّر نہ ہوئی
گرچہ کی ہیں مرضِ دل کی دوائیں لاکھوں

بیٹھے بیٹھے جو میں شب سینے پہ ناخن مارا
پردۂ دل سے مرے نکلیں صدائیں لاکھوں

کشتہ ہوں اس کی میں برہم زدنِ مژگاں کا
گردشِ چشم میں ہیں جس کی ادائیں لاکھوں

مصحفیؔ رنگِ گل اک وضع پہ کس طرح رہے
روز اس باغ میں چلتی ہیں ہوائیں لاکھوں

۳۸۰

وہی آہ و فغان و زاریاں ہیں
وہی راتیں وہی بیداریاں ہیں

نہ نامِ عشق لے ناداں کہ اس میں
بہت رسوائیاں اور خواریاں ہیں

میں حیراں ہوں کہ کیوں ہنسنے میں گل کے
ترے ہنسنے کی وضعیں ساریاں ہیں

کہیں ہیں جس کو خوباں پان کھانا
ہمارے حق میں وے خونخواریاں ہیں

مرے، ان نونہالوں نے، بدن پر
زبس پھولوں کی چھڑیاں ماریاں ہیں

جدا، جس نقش کو دیکھوں ہوں اس میں
ہزاروں رنگ اور گلکاریاں ہیں

محل کی رنڈیوں کا کیا کروں ذکر
جہاں گرم ان کی صحبت داریاں ہیں

وہی ٹھٹھے وہی چہلیں ہیں باہم
وہی چھینٹیں، وہی کلکاریاں ہیں

نہ پوچھ اے مصحفیؔ احوال دل کا
کہ اس دل کو کئی بیماریاں ہیں

۳۸۱

نہ تنہا دل میں سو نشتر چبھے ہیں
ترے ہر مو میں یہاں خنجر چھپے ہیں

زمیں کو کھودیے تو اس کے نیچے
ہزاروں سر دلیں اور در چھپے ہیں

فقیروں کو بچشمِ کم نہ دیکھو
کہ ان میں اولیا اکثر چھپے ہیں

کہے تھے دایہ طفلی میں وہ بھوں دیکھ
ابھی اس تیغ کے جوہر چھپے ہیں

اگر سینے کو میرے چاک کیجے
تو اس میں مثلِ گل دفتر چھپے ہیں

نہ چادر پوشوں کو تو سرسری دیکھ
کہ رعنا قد پسِ چادر چھپے ہیں

جھلکتا ہے وہ رخ برقعے سے سارا
چھپائے کب پری پیکر چھپے ہیں

کیا تھا دفن ہم کو جس جگہ واں
انگارے زیرِ خاکستر چھپے ہیں

بہر سو مصحفی کا تذکرہ ہے
کوئی ایسے سخن پرور چھپے ہیں

۳۸۲

چقیں پلکوں کی جب اٹھا دی ہیں
اس نے آنکھیں ہمیں دکھا دی ہیں

ترِ پا آ گئے ہیں گر تیرے
ترِ دل سے تجھے دعا دی ہیں

میرے پیچھے بلائیں زلفوں کی
بیٹھے بیٹھے ابھی لگا دی ہیں

سرِ فرہاد پر نہیں موقوف
عشق نے گردنیں کٹا دی ہیں

اس نے کل دیکھتے ہی میری طرف
کیا ہی نظریں تلے جھکا دی ہیں

چل بے ناصح! کہ میں گریباں کی
پھاڑ کر دھجیاں اڑا دی ہیں

قصرِ دل کا خراب ہے، غم نے
اس کی سب صورتیں مٹا دی ہیں

یوں بھڑکتے ہیں استخواں میرے
تو کہے لکڑیاں جلا دی ہیں

شاہدِ گل سے آج نرگس نے
بے طرح انکھڑیاں ملا دی ہیں

کہہ نہ تو، مصحفی کے وصف میں یہ ق
"کیا ہی بیتیں مجھے لکھا دی ہیں!"

اس نے ایسی تو سیکڑوں غزلیں
موت کے ریلے میں بہا دی ہیں

۳۸۳

خورشیدِ اوجِ خوبی ماہِ سپہر احساں — شمشیر جنگ یعنی مرزا محمدی خاں

یورش میں تیغ جس کی ہے جیسے برقِ خاطف — بخشش میں ہاتھ جس کا ہے جیسے ابرِ نیساں

جوں گل، شگفتگی میں باغ و بہار ہے وہ — مجلس تمام اس کی ہے اس لیے گلستاں

اس کے جلوس سے ہے سب پالکی کی زینت — اس برجِ قوس کا ہے وہ آفتابِ تاباں

کیا زرق برق اس کی پوشاک کا بتاؤں — اک دن میں جا جو نکلا سوئے حریر دوزاں

زربفت و مہر و مہ کو مقراض کر رہے تھے — تا قطع کر سکیں وے اس کی سنجافِ داماں

کیونکر نہ ہر طرف سے تحسیں بلند ہووے — ہو مصحفی سا شاعر جس بزم میں غزل خواں

جب مدح کہہ چکا میں، دل نے مجھے کہا یوں — "کاے طوطیِ نوا سنج وے بلبلِ خوش الحاں!

اک مجھ کو اس زمیں میں اپنی غزل سنا دے — سنتے ہی جس کو ہوویں سب سامعین حیراں

تب دل سے یوں کہا میں "کیا چاہیے بہت خوب"

اتنے میں لب تک آیا یہ مطلعِ نمایاں

۳۸۴

گر اس روش سے ہو تو سوئے چمن خراماں — لے آنکھوں سے لگاوے گل تیرا طرفِ داماں

گردش میں چشم کی تھی، گردش فلک کی ساری — دل ہل گئے ہزاروں جوں ہی ہلے وہ مژگاں

خوں گشتہ دل کو میرے مت چشمِ کم سے دیکھو — یہ لعل بھی کسی کا تھا تکمۂ گریباں

شرمندہ ہو ستارے آنکھیں لگے چرانے — مکھڑے کو چاندنی میں آیا جو کر کے افشاں

یہ بھی کوئی روش ہے؟ اے جامہ زیب! ادھر دیکھ — ہاتھوں سے تیرے گل کا ٹکڑے ہوا گریباں

اب تک حواس میرے، یارو! ہوئے نہیں جمع — میں سر کے بال اس کے دیکھے تھے کل پریشاں

اس گل کی تنگ پوشی گر ہے یہی تو اک دن — کچھ گل کھلائے گا یہ اختلاطِ چسپاں

یہ شاعری نہیں کچھ بے شک کہ ساحری ہے

اے مصحفی وہ سمجھے اس کو جو ہو زباں داں

۳۸۵

ہم نہ وہ تاب و تواں رکھتے ہیں — کانپتے پانو وہاں رکھتے ہیں
یہ نہ جانو نہیں عاشق پیشہ — ہم بھی اک آفتِ جاں رکھتے ہیں
خوش قداں اور بھی خوش جلوہ ہیں لیک — پانو اس دھج سے کہاں رکھتے ہیں
مجھ میں اور اس میں ہے اک الفت صاف — بدگماں اور ہی گماں رکھتے ہیں
عشق ہے ہم کو، کہ اب تک تجھ سے — اپنی خواہش کو نہاں رکھتے ہیں
بولتے آپ نہیں ہم سے کبھی — مُنہ میں کہنے کو زباں رکھتے ہیں

مصحفیؔ گر وہ لگا دے کوئی تیر
ہم دل اپنے کا نشاں رکھتے ہیں

۳۸۶

ملا چاہو تم تو بہانے بہت ہیں — جگہ سیکڑوں ہیں، ٹھکانے بہت ہیں
حدیثِ سرِ زلف کیا کوئی سمجھے — کہ اس بات کے شاخسانے بہت ہیں
تہی دست جانے کا یاں سے نہ غم کھا — زمیں کے تلے تو خزانے بہت ہیں
بھڑکیو سمجھ کر ٹک اے آتشِ گل! — کہ اس باغ میں آشیانے بہت ہیں
کہوں غیرِ مجلس میں کیا تجھ سے دل کی! — کہ یاں لوگ اپنے بگانے بہت ہیں
کوئی میں نکلتا ہوں دریائے غم سے — ابھی اس میں جھکجھولے کھانے بہت ہیں
نہیں آدمیّت کا دلّی میں چرچا — جدھر دیکھو بھڑوے زنانے بہت ہیں
لگا تیر کوئی جسے چاہے پیارے! — کماں ہاتھ میں لے نشانے بہت ہیں
بتوں کے تجسّم کا کیا ذکر کیجے — خدائی کے یاں کارخانے بہت ہیں
تری زلف کس کس کے پانو پڑے گی — ہے زنجیر اک اور دوانے بہت ہیں
زمانے کا دیکھا ہے میں نے بہت کچھ — ق — مجھے یاد ایسے زمانے بہت ہیں
زمانے کا شکوہ نہ کر ہم سے، ہمدم! — سخن اور کہہ کچھ فسانے بہت ہیں

اٹھ اے مصحفی کیا یہی در ہے تجھ کو؟
پٹکنے کو سر آستانے بہت ہیں

۳۸۷

ہے بسا گل عذار آنکھوں میں
کیا سماوے بہار آنکھوں میں

جیسے شیشے میں مے، جھلکتا ہے
رنگِ رخسارِ یار آنکھوں میں

رات جاگا ہے تو کہاں، جو تری
اب تلک ہے خمار آنکھوں میں

دمِ شمشیر سا چمکتا ہے
سرمہ ان آبدار آنکھوں میں

کام کر جاتی ہیں تری آنکھیں
چپکے چپکے ہزار آنکھوں میں

اس نے اک جھانولی سے دکھلادی
گردشِ روزگار آنکھوں میں

لال ڈوروں سے اس پری رو کے
ہے قیامت بہار آنکھوں میں

تیرے ہاتھوں سے آرہی ہے جاں
اے دلِ بیقرار! آنکھوں میں

رات ازبس کہ کر رہا تھا، ہجوم
شوقِ دیدارِ یار آنکھوں میں

تارے گن گن کے مصحفی کاٹی
میں شبِ انتظار آنکھوں میں

۳۸۸

یار بن شغلِ مے و جام کے نزدیک نہیں
عمر گزری کہ میں اس کام کے نزدیک نہیں

اک طرف شمع کہ یاں تیرگیِ طالع سے
نورِ مہ اپنے در و بام کے نزدیک نہیں

تہمتِ بوسہ عاشق کے ہوں آلودہ دریغ!
وے لبِ سادہ کہ دشنام کے نزدیک نہیں

کیا مصیبت ہے کہ جی نکلے ہے اور اس ساعت
کوئی اس تیرہ سرانجام کے نزدیک نہیں

میوۂ پختہ کا طالب ہوں میں اس باغ کے بیچ
ہاتھ میرا ثمرِ خام کے نزدیک نہیں

کونسا طائرِ بگرفتہ اجل، اے صیاد!
اس گلستاں میں ترے دام کے نزدیک نہیں

درد دوری کی اذیت کو وہی سمجھے ہے — جو کوئی اپنے دل آرام کے نزدیک نہیں
نت دعا ہی میں رہا ہاتھ مرا یا قسمت! — اب تلک زلفِ سیہ فام کے نزدیک نہیں
جب سے، اے راحتِ جاں! مجھ سے ہوا ہے تو جدا — دل مرا راحت و آرام کے نزدیک نہیں

مصحفی خاص تو سمجھیں ہیں بھلا رتبۂ شعر
قدر اس چیز کی گو عام کے نزدیک نہیں

۳۸۹

میں جب اس کو خنجر بکف دیکھتا ہوں — ہزاروں کے جی کو تلف دیکھتا ہوں
فلک گر ہنساتا ہے مجھ پر کسی کو — میں ہنس کر فلک کی طرف دیکھتا ہوں
نہ یہ وے زمیں ہے، نہ وے آسماں ہے — کچھ الٹی ہوئی صف کی صف دیکھتا ہوں
ادھر کو ہے رخ کس کی مژگاں کا یارب — کئی دن سے سینہ ہدف دیکھتا ہوں
جب آتا ہے مژگاں پہ آنسو میں اپنے — تماشائے دُرِّ نجف دیکھتا ہوں
ترا مستِ نظارہ مارا پڑا ہے — جہاں، خون پر اس کے کف دیکھتا ہوں
اگرچہ میں ہمت بلندی سے اپنی — ق — گہر اپنے سارے خذف دیکھتا ہوں

وے مصحفی ہو ہے میری تسلّی
جو گاہے کلامِ سلف دیکھتا ہوں

۳۹۰

چہرہ اتر رہا ہے، نقشے بگڑ گئے ہیں — پھر ان دلوں تو تیرے پھبن سے جھڑ گئے ہیں
ہم جن کی دوستی پر دیتے تھے جان اپنا — قدرت خدا کی ہم سے وے رات لڑ گئے ہیں
تلوار سج کے جب وہ نکلا ہے گھر سے باہر — کشتوں کے ہر گلی میں ستھراو پڑ گئے ہیں
تیری صفائے دنداں کے آگے ہو کے عاجز — دانتوں میں اپنے موتی تنکے پکڑ گئے ہیں
جب شہرِ دل سے پیارے! تم نے سفر کیا ہے — بستے نگر ہزاروں پل میں اجڑ گئے ہیں

وے جو مریض تیرے جیتے تھے کل ذرا ایک — کہتے ہیں آج اُن کے بھی دم اکھڑ گئے ہیں
روتا پھروں ہوں تنہا میں قافلے میں یارو! — منزل پہ میرے ساتھی مجھ سے بچھڑ گئے ہیں
جب سے پھرا ہے اس کی پلکوں کا رخ ادھر کو — سینے میں آسماں کے سوراخ پڑ گئے ہیں
واں اس نے گر لیا ہے خمیازہ مُنہ بھرا کر — یاں میرے چاکِ دل کے ٹانکے ادھڑ گئے ہیں
اے مصحفی میں روؤں کیا پچھلی صحبتوں کو
بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

۳۹۱

دیکھا جو دستِ غیر میں اس کا سر آستیں — رویا بہت میں رکھ کے وہیں منہ پر آستیں
دستِ ستم کو تو نے جو کوتہ کیا تو پھر — خواہی دراز خواہ تو، کوتہ کر آستیں
کیا خوب دن تھے وے کہ جو گلشن سے ہر سحر — چن چن کے پھول لاتے تھے ہم بھر بھر آستیں
ساعد نہ جان تو کہ وہ شوخِ دوپٹہ باز — رکھتا ہے میرے قتل کو خنجر در آستیں
تا ہم نہ دیکھیں گوہرِ دنداں کی آب و تاب — ہنستے بھی ہیں جو آپ تو منہ پر دھر آستیں
اس تیری ساعدِ ورقِ نقرہ وش کو شوخ! — ایسا نہ ہو چینٹ سے کرے مسطر آستیں
جس طرح کہکشاں میں ستارے ہوں جلوہ گر — یاں اشکِ خوں سے رکھتی ہیں سو انگر آستیں
نکلا پڑے ہے کپڑوں سے وہ اس کا کیا عجب — ساعد سے مجھ پہ کھینچے اگر خنجر آستیں
اے مصحفی تو ایک غزل اور بھی تو ٹانک
تیرے قلم کی ہے ابھی پُر گوہر آستیں

۳۹۲

پہنے ہے بر میں جامہ وہ جب چن کر آستیں — اپنے ہمیں دکھاتی ہے تب جوہر آستیں
دل زخمی اُس کے رنگِ حنا کا ہے دیکھ تو — رکھتا ہوں اشکِ سرخ سے شاہد در آستیں
تکمے رکھا کر دکہ میاں تنگ پوشوں کی — تکموں سے اور ہوتی ہے زیب آور آستیں

آگے ہی تیرے ہاتھوں سے ہم مر رہے ہیں، جاں! تو دمبدم چڑھاتا ہے کس پر آستیں
کر ذبح مجھ کو، اے مرے قاتل! تو شوق سے پر بے شعور خوں میں نہ اپنی بھر آستیں
جب خاصہ کھانے بیٹھے ہے وہ، اس کے خوان پر آکر ملک ہلاتے ہیں اپنا سر آستیں
اے مصحفی! تو کس لیے رہتا ہے گریہ ناک؟
آنکھوں پہ دیکھتا ہوں تری اکثر آستیں

۳۹۳

بے وفایانِ جہاں کس سے وفا کرتے ہیں؟ ہم لگے جاتے جو ہیں ان سے، برا کرتے ہیں
اور تو شغل کچھ آتا نہیں ہم کو لاچار رات دن بیٹھے ہوئے گریہ کیا کرتے ہیں
تجھ سے ہم شاد بہت رہتے تھے اے کنجِ قفس! وقتِ رخصت ہے اب ہم تجھ کو دعا کرتے ہیں
منہ چھپایا جو کل اس نے تو میں ہنس کر بولا "آپ کیا مجھ سے بھی پردے میں چھپا کرتے ہیں؟"
دیکھیے صبح ہو کیا؟ شام بنے کیا جی پر؟ ہم اسی سوچ میں دن رات رہا کرتے ہیں
جس پہ کی اس نے نظر جھٹ اسے وہیں مارا قدر انداز کوئی تیر خطا کرتے ہیں
ماہ و خورشید کا پھرنا نہیں دن رات عبث آپ کو تجھ پہ، مری جان! فدا کرتے ہیں
جستجو میں تری ہم، اے گلِ تر! مدت سے جوں صبا ہر طرف آوارہ پھرا کرتے ہیں
مصحفی ایک غزل اور بھی کہہ، کیونکہ میاں
قافیے تجھ سے بہت خوب بندھا کرتے ہیں

۳۹۴

صبح اٹھ ہم جو درِ خانہ کو وا کرتے ہیں شام تک تیری ہی پھر راہ تکا کرتے ہیں
بعد مرنے کے بھی ہے دائر و سائر بلبل تب تو پر اس کے گلستاں میں اڑا کرتے ہیں
ان کو سمجھا کہ ترے کوچے کے رہنے والے ہم پہ دن رات نت آوازے کسا کرتے ہیں
کیا نصیب ان کے بھی اچھے ہیں جو خنجر کے تلے اپنے قاتل کی طرف دیکھ رہا کرتے ہیں

سببِ گریہ کہیں کیا یونہیں ہم پل پل میں
خود بخود آبلہ سے پھوٹ بہا کرتے ہیں

نو بہار آئی ہے اب گل کی طرح ہم بھی، نسیم!
دھجیاں کرکے گریباں کو ہوا کرتے ہیں

شوق تو دیکھ کہ جس وقت تو سو جاتا ہے
ہم یہ آنکھیں ترے تلووں سے ملا کرتے ہیں

طرفہ عزّت ہے ہماری بھی گلی میں تیری!
گالیاں جو کوئی دیتا ہے سنا کرتے ہیں

باغ میں آ، کہ ترے شوقِ ہم آغوشی میں
صبح اٹھ پھول بھی خمیازے لیا کرتے ہیں

رخصتِ جنبشِ لب تو نہیں دیتا ہے ادب
دُور سے ہم تجھے نظروں میں دعا کرتے ہیں

لے خبر اپنی ذرا جلد کہ یاں یاروں میں
تیغِ ابرو پہ تری خون ہوا کرتے ہیں

تھی جہاں مصحفیِ سوختہ جاں کی تربت
پھول لالے کے کئی واں سے اگا کرتے ہیں

۳۹۵

شب ہے اور آشنا کی باتیں ہیں
عشق کے ابتدا کی باتیں ہیں

حسن کی سرزمیں کا ہے مذکور
واں کی آب و ہوا کی باتیں ہیں

کیوں نہ ہر بات پر کوئی غش ہو
تیرے ناز و ادا کی باتیں ہیں

مجھ سے اور اتنا تلخ بولے تو!
یہ بھی پیارے! خدا کی باتیں ہیں

اس کی شرم و حیا کا نام نہ لو
کہ یہ شرم و حیا کی باتیں ہیں

ہم ہیں اور شب ہے اور وہی تا صبح
تیری زلفِ رسا کی باتیں ہیں

میرے نامے کو وہ نہیں پڑھتا
جس جگہ مدّعا کی باتیں ہیں

یار نے مصحفی کا خون کیا!
نہ غلط، یہ حنا کی باتیں ہیں

۳۹۶

اس زلف میں عرق کے قطرے لٹک رہے ہیں
یا رات اندھیری میں تارے چھٹک رہے ہیں

بیزاری اس چمن میں پھیلی ہے بس کہ ہر سوٗ — گُل دستِ باغباں سے دامن جھٹک رہے ہیں
ہم سے ملائیاں ہیں تک جس نے اپنی آنکھیں — ہم اک نگہ پہ اس کی برسوں اٹک رہے ہیں
آیا ہے آخرِ شب کون اس چمن میں یارب! — جیسے سپندِ مجمر غنچے چٹک رہے ہیں
اے مصحفی وہ کوئی آتا ہے گھر سے باہر
ہم آستاں سے اس کے کیوں سر پٹک رہے ہیں

۳۹۷

بال زلفوں کے جب سنوارے ہیں — جان سے لاکھوں اس نے مارے ہیں
دشمنِ جاں ہوئے ہیں عالم کے — وے جو اک مہرباں ہمارے ہیں
اس کے اعضا کی کیا کروں تعریف — جیسے سانچے میں ڈھال اتارے ہیں
کیوں نہ چھاتی سے میں لگا رکھوں — داغ چھاتی کے مجھ کو پیارے ہیں
وصل سے ان کے تو نہ ہو نومید ق یہ جو گئی شب نما شرارے ہیں
مصحفی کیوں نہ ہاتھ آویں گے
ایسے کیا آسماں کے تارے ہیں ؟

۳۹۸

کبھی جو یار کی پلکیں دوچار ہوتی ہیں — تو برچھیاں سی کلیجے کے پار ہوتی ہیں
وہ دام ہے تری زلفِ ہزار خم صیّاد — کہ جس کو دیکھ نگاہیں شکار ہوتی ہیں
دکھاتی ہیں ہمیں سیرِ شگوفۂ بادام — وے انکھڑیاں جو کبھو پُرخمار ہوتی ہیں
میں بس کہ کانپتا رہتا ہوں وصل کی شب بھی — تری ہی زلفیں تری ہم کنار ہوتی ہیں
کب ایک جان کی عاشق کے اس کو پروا ہے — ہزار جانیں جس اوپر نثار ہوتی ہیں
بہار آئی کہاں ہے؟ قفس میں اے صیّاد! — یہ بلبلیں تو عبث بیقرار ہوتی ہیں
خدا کرے کہ مرے اور ترے ہوں روزِ وصال — جو چہلیں باغ میں فصلِ بہار ہوتی ہیں

انھیں کو دیکھ کے دل مصحفی پھسلتا ہے
جو صورتیں کہ ذرا آبدار ہوتی ہیں

۳۹۹

بلبل کے چہچہوں سے آزار کھینچتے ہیں
دو چار نالے ہم بھی ناچار کھینچتے ہیں

شب باز کا تماشا یہ ہے جہاں جو دیکھو
پردے میں آپ بیٹھے وے تار کھینچتے ہیں

ابرو کو ان کی گر ہم کہتے ہیں راست خم ہے
اس بات سے وہ کٹ کر تلوار کھینچتے ہیں

دیتے ہیں دل میں میرے پیکاں اچوک خوباں
چٹکی سے تیر کا جب سوفار کھینچتے ہیں

جو وادیِ طلب میں دن رات قطرہ زن ہیں
پاے پر آبلہ سے کب خار کھینچتے ہیں؟

دشتِ جنوں سے جب میں ناگاہ اٹھ چلوں ہوں
دامن پکڑ کے میرا سب خار کھینچتے ہیں

ساقی بغیر جب ہم جاتے ہیں سیر کرنے
خمیازہ ہی چمن میں ہر بار کھینچتے ہیں

کیا نارسا ہیں طالع ان کے جو اس صنم کی
موے کمر سمجھ کر زنّار کھینچتے ہیں

میری اور آسماں کی ہے پیل کی لڑائی
گو لوگ درمیاں میں دیوار کھینچتے ہیں

وہ ہم سے گر خفا ہیں، تو ہم بھی مصحفی اب
لوہے کی درمیاں میں دیوار کھینچتے ہیں

۴۰۰

زبس کہ زلف کا تھا شب خیال میرے تئیں
تمام روز رہا ہے ملال میرے تئیں

حنا کی طرح کروں میں بھی اس کی پابوسی
خدا نے دی نہیں اتنی مجال میرے تئیں

ہوا وہ دشمنِ جاں مارے بدگمانی کے
کسی نے گر کبھی پایا بحال میرے تئیں

تنِ نزار سے ہوں ننگ اپنی ہستی کا
کیا ہے بخت نے چینی کا بال میرے تئیں

زبس کہ سوکھ کے کانٹا ہوا ہوں میں غم سے
کہیں ہیں لوگ زمیں کا ہلال میرے تئیں

بھلا تو ساتھ تو چلتا مرے جنازے کے
نہ آئی موت بھی روزِ وصال میرے تئیں

خدا ہی جانے یہ کیا رنگ ہے کہ صبح سے آج — وے انکھڑیاں نظر آتی ہیں لال میرے تئیں
کہے ہے کبک تری چال پر نظر کر کے — "ہزار حیف نہ آئی یہ چال میرے تئیں"
میں کیا سوال کروں اس سے سخت حیراں ہوں — کہ ہائے کر نہیں آتا سوال میرے تئیں
نگاہِ لطف جو اس کی کبھی ہوئی مجھ پر — تو دل میں گزرے ہزار احتمال میرے تئیں
زبس کہ مستِ مےِ ساغرِ تصوّف ہوں — نہیں خیالِ حرام و حلال میرے تئیں
قدم زمیں پہ نہ رکھّے مجھے یہ حیرت ہے — کہ اس نے کیونکہ کیا پائمال میرے تئیں
کبھی وہ ماہ بھی آوے گا، اب کے گزرا ہے — اسی خیال میں سارا یہ سال میرے تئیں
یہ کیا سبب ہے جو آج اتنا منھ تھتایا ہے! — بہت خفا ہے تو لے مار ڈال میرے تئیں

اگرچہ مصحفی میں خارِ خشک ہوں لیکن
کیا ہے سایۂ گل نے نہال میرے تئیں

۴۰۱

ہم جن بتوں کی خاطر زنّار باندھتے ہیں — وے قتل پر ہمارے تلوار باندھتے ہیں
مضمونِ زلف از بس پیچیدہ ہے، ہم اس کو — سو بار کھولتے ہیں سو بار باندھتے ہیں
ساون ہمارے آگے بے طرح منہ چڑھا ہے — رونے کا ہم بھی، یارو! اب تار باندھتے ہیں
کیا خود نما ہیں، یارو! یہ جامہ زیب لڑکے — آئینہ رکھ کے آگے دستار باندھتے ہیں
اب تک اکڑ وہی ہے ان نازنیں بتوں کی — پٹکا کمر سے اپنی بلدار باندھتے ہیں
دیکھا ہے کیا جو ہر دم رفتار کو تمھاری — کبک دری کی شاعر رفتار باندھتے ہیں
تلوار تیری چلتی غیروں پہ کیونکہ دیکھیں — آنکھوں پہ اپنی پٹّی ناچار باندھتے ہیں
تقلید سے نہ ہووے نامرد مرد ہرگز — دیکھا ہے ہیجڑے بھی ہتھیار باندھتے ہیں
آگاہ وے نہیں ہیں کیا فنِّ شاعری سے — مضمون چرا کے میرے جو یار باندھتے ہیں

جی کیوں چلا نہ جاوے ہر شعر کی ادا پر
اے مصحفی ہم اس کی رفتار باندھتے ہیں

۴۰۲

کس مست کی لوہو سی آنکھیں نظر آئی ہیں / جو، یارو! مری آنکھیں پھر جوش کر آئی ہیں

ہر لحظہ قدم رکھتے، پڑتی ہیں ترے پانْو / ان روزوں تری زلفیں کچھ راہ پر آئی ہیں

جب گھر سے تو نکلا ہے بن ٹھن کے کبھی باہر / سو منتظروں کی تب امیدیں بر آئی ہیں

کہنے کو تو چھوٹی ہیں زلفیں تری، پر تو نے / جب کھول دیا ہے تو وے تا کمر آئی ہیں

دل یار کے چنگل میں پاتا ہوں سدا اپنا / جس دن سے تری پلکیں سینے میں در آئی ہیں

جانے کی خبر میں نے جب تیرے سنی ہے تب / کچھ منہ سے نہیں نکلا پر آنکھیں بھر آئی ہیں

جب نام ترا منہ سے نکلا ہے مرے، وو ہیں / پلکوں سے کئی بوندیں منہ پر اتر آئی ہیں

اک وضع جو ہوتی تو ہم اس کا بیاں کرتے / دلی میں ہمیں لاکھوں وضعیں نظر آئی ہیں

اب مصحفی حجرے سے نکلے ہے جو کم باہر
ان روزوں کہیں اس کی آنکھیں مگر آئی ہیں

۴۰۳

مخلوق ہوں یا خالقِ مخلوق نما ہوں / معلوم نہیں مجھ کو کہ میں کون ہوں کیا ہوں

ہوں شاہدِ تنزیہہ کے رخسار کا پردہ / یا خود ہی مشاہد ہوں کہ پردے میں چھپا ہوں

ہے مجھ سے گریبانِ گلِ صبح معطّر / میں عطرِ نسیمِ چمن و بادِ صبا ہوں

گوشِ شنوا ہو تو مرے رمز کو سمجھے / حق یہ ہے کہ میں سازِ حقیقت کی نوا ہوں

ہستی کو مری ہستیِ عالم نہ سمجھنا / ہوں ہست تو پر ہستیِ عالم سے جدا ہوں

ہوں سینۂ عشاق میں سوزِ جگر و دل / اور دیدۂ معشوقاں میں کیا ناز و ادا ہوں

یہ کیا ہے کہ مجھ پر مرا عقدہ نہیں کھلتا / ہر چند کہ خود عقدہ و خود عقدہ کشا ہوں

اے مصحفی شانیں ہیں مری جلوہ گری میں
ہر رنگ میں میں مظہرِ آثارِ خدا ہوں

۴۰۴

از بس تری ادائیں مجھ کو کڑھاتیاں ہیں
جب دیکھتا ہوں تجھ کو آنکھیں بھر آتیاں ہیں

میں چونک چونک اٹھوں ہوں ناگن سی تری زلفیں
جب آ کے خواب میں بھی مجھ کو ڈراتیاں ہیں

تم واں پڑے پھرو ہو گلیوں میں بے خبر سے
رفتار پر تمھاری یاں جانیں جاتیاں ہیں

کیونکر کہ میں نہ باندھوں مضمونِ تازہ ہر دم
سو باتیں تیری آنکھیں مجھ کو سجھاتیاں ہیں

اے مصحفی تو اس کو مت دیکھ چوری چوری
کم بخت یہ نگاہیں تہمت لگاتیاں ہیں

۴۰۵

کوچے میں عافیت کے کہاں بیٹھتا ہوں میں
فتنہ اٹھے ہے ایک جہاں بیٹھتا ہوں میں

آتا ہے جو کوئی تری مجلس میں، تجھ سے، یار!
کہتا ہے یہ ادب سے "یہاں بیٹھتا ہوں میں"

کیا ہو گیا ہے مجھ کو، جو اس عقل و ہوش پر
تیرِ بلا کی جا ہے نشاں بیٹھتا ہوں میں

کہتا ہے تیرِ غمزہ یہی مجھ سے ہر گھڑی
"ہاں پہلوے شکستہ دلاں بیٹھتا ہوں میں"

صیدِ مراد کی ہی کمیں گاہ میں مدام
راتوں کو لے کے تیر و کماں بیٹھتا ہوں میں

مضمونِ بے دماغیِ عالم پہ کر نظر
پردے میں بوے گل کے نہاں بیٹھتا ہوں میں

دل رک گیا ہے سب سے مرا اب تو مصحفی
دروازہ بند کر کے میاں بیٹھتا ہوں میں

۴۰۶

ہم ترے کوچے سے ناچار چلے جاتے ہیں
جی تو کرتا نہیں جانے کو ولے جاتے ہیں

چال چلتا ہے مری جان! تو اٹھکھیلی سے
دل ترے پانو تلے مفت ملے جاتے ہیں

انسوؤں کا مجھے اپنے ہے نہایت افسوس
خاک کے بیچ یہ موتی سے رلے جاتے ہیں

دیکھ زخمی مجھے اس تیغ کا ڈر کے مارے
سامنے سے مرے احباب ٹلے جاتے ہیں

جی میں کیا ان کے دمِ نزع گزرتی ہوگی؟ یاں سے جاتے ہوئے جو حسرتیں لے جاتے ہیں
کیا تماشا نظر آتا ہے انھیں حیراں ہوں یار کیوں خاک کے پردے میں چلے جاتے ہیں
میں ہی منہ ڈھانپ کے روتا نہیں کچھ میرے لئے آنسو واں اس کے بھی برقعے میں ڈھلے جاتے ہیں
ایک عالم کا گزرگاہ ہے دروازۂ مرگ جس میں ہو کر کے برے اور بھلے جاتے ہیں

کیونکہ اس آتشِ سوزاں کے مقابل رہیے
مصحفی اپنے تو تیور ہی جلے جاتے ہیں

۴۰۷

غیر کے گھر تو نہ رہ رات کو مہمان کہیں تا نہ اس بات کا چرچا ہو، مری جان! کہیں
اب تلک غنچے کی گردن ہے جھکی خجلت سے اس نے دیکھے تھے ترے گوے گریبان کہیں
رازِ دل اس سے کہا ہیں تو ولے یہ ڈر ہے کہ مرے راز کو کہہ دے نہ وہ نادان کہیں
اے پریشانیِ زلفِ صنمِ کافر کیش! کیجیو تو نہ مرے دل کو پریشان کہیں
دل کی بے چینی سے میں سخت بتنگ آیا ہوں چین پڑتا ہی نہیں ہے اسے اک آن کہیں
دھانی جوڑے نے ترے کھیت رکھا ہے مجھ کو سبز رنگ اتنے تو دیکھے نہیں میں دھان کہیں
منع کس واسطے کرتا ہے؟ میں تیرے صدقے عید کے دن تو مجھے ہونے دے قربان کہیں
دردِ دل جا کے میں کہہ لوں ابھی در کے نزدیک ایک ساعت کو ہی اٹھ جاوے جو دربان کہیں

مصحفی ایک غزل اور بھی میں لکھتا ہوں
یہ تو بیتیں کئی میں نے بہت آسان کہیں

۴۰۸

بال بکھرے ہیں کہیں، زلف پریشان کہیں یارو! از بہرِ خدا دیکھی ہے یہ آن کہیں؟
قتلِ عاشق پہ کمر باندھ نہ آ، جانے دے بانکپن خوب نہیں اتنا، کہا مان کہیں
ایسا دیوانہ رکھے جائے کا اپنے کیا ہوش جس کا دامن ہو کہیں اور گریبان کہیں

کیا فسوں پڑھ کے خدا جانے کھلا دے مجھ کو
غیر کے ہاتھ سے تو کھائیو مت پان کہیں

تو تو اس شہر سے جاتا ہے و لے یہ ڈر ہے
ہووے جانے سے ترے شہر نہ ویران کہیں

خلشِ دل کے ہیں آثار برے، ڈرتا ہوں
رہ گیا ہو نہ ترے تیر کا پیکان کہیں

کب تلک کوہ و بیاباں میں پھروں میں؟ اے کاش!
جستجو ہی میں نکل جاوے مرا جان کہیں

خط لکھا آپ نے میرے تئیں بے سرنامہ
خط کے لکھنے کا بھلا ہوے ہے یہ عنوان کہیں؟

کیا کروں دردِ محبت کا دوا حیراں ہوں
مجھ کو ملتا نہیں اس درد کا درمان کہیں

آئینے میں تو بہت اپنی طرف دیکھے ہے
دل کو اپنے نہ گنوا بیٹھیو نادان، کہیں!

ابر کی طرح سے آتے ہیں بھرے دیدۂ تر
مجھ کو یہ ڈر ہے کہ لاویں نہ یہ طوفان کہیں

اک ذرا خاکِ شہیداں سے سنبھل کر چلنا
دیکھیو خوں میں نہ ڈوبے زہِ داماں کہیں

مصحفی کے تئیں تم قتل عبث کرتے ہو
پیدا ہوتے ہیں بھلا ایسے بھی انسان کہیں!

۳۰۹

گر ہو طمنچہ بند وہ رشکِ فرنگیاں
بانکے مغل بچے نہ کریں خانہ جنگیاں

شوخی مزاج اس کے سے اب تک گئی نہیں
ویسے ہی بانکپن ہیں، وہی غولہ دنگیاں

بلبل کے اشکِ سرخ نے یہ کیا غضب کیا
جو تیلیاں قفس کی سبھی خوں میں رنگیاں

گردوں اگرچہ دن کو غزالِ سیاہ ہے
پر شب کو میرے ساتھ کرے ہے پلنگیاں

دیکھا نہ ہوگا وہ کبھی بیژن نے چاہ میں
جو دن مجھے دکھاتی ہیں قسمت کی تنگیاں

عارض پہ تیرے جوششِ خطِ سیاہ ہے
یا روم پر چڑھ آئی ہیں یہ فوج زنگیاں

کیا جانے کس سے بگڑی ہے دریا میں مصحفی
لہروں کے ہاتھوں میں ہیں جو تلواریں ننگیاں

و

۴۱۰

اس گفتگو کا اور ہی انداز ہے، سنو!
پردے میں نہ فلک کے یہ آواز ہے، سنو!

بسم اللہِ کتابِ دو عالم ہے حرفِ عشق
اس قصّے کا یہیں سے تو آغاز ہے، سنو!

تنہا نہ حق کو سولی پہ منصور کہہ گیا
ہر ذرّے کی زباں پہ یہی راز ہے، سنو!

کنجِ قفس میں دیکھ کے کہتی ہے مجھ کو خلق
اس مرغ کو بھی حسرتِ پرواز ہے، سنو!

بے اعتنائی خوب نہیں اتنی، میری جاں!
نالے کو ٹک مرے بھی، یہ کیا ناز ہے؟ سنو!

مرغِ چمن تو بولے ہی ہے اس بہار میں
مرغِ قفس بھی زمزمہ پرداز ہے، سنو

دیکھو نہ مصحفی کی غزل کو بچشمِ کم
اے یارو! یہ تو سحر ہے، اعجاز ہے، سنو!

۴۱۱

دل ہے لبریزِ تمنّا، دیکھیو!
مے سی چھلکے ہے، یہ مینا دیکھیو

چشم و ابرو عالمِ تصویر ہے
اُس بتِ کافر کا نقشا دیکھیو

سانچے میں ڈھالے ہوئے ہیں تو کہے
ان خوش اندا موں کے اعضا دیکھیو

اٹھ گیا گر اس کے مکھڑے سے نقاب
تم مرا اس دم تماشا دیکھیو

مصحفی، رو پاتے ہی اس شوخ کا
لگ چلا ہے اس سے کیسا، دیکھیو

۴۱۲

آتا ہے کس انداز سے، ٹک ناز تو دیکھو!
کس دھج سے قدم پڑتا ہے، انداز تو دیکھو!

طاؤسِ پری جلوہ کو ٹھکرا کے چلے ہے — انداز خرامِ بتِ طنّاز تو دیکھو!
یک جنبشِ لب اس کی نے لاکھوں کو جلایا — عیسیٰ کو یہ قدرت تھی؟ تم اعجاز تو دیکھو!
کرتا ہوں میں دزدیدہ نظر گر کبھی اس پر — نظروں میں پرکھ لے ہے، نظرباز تو دیکھو!
میں کنگرۂ عرش سے پر مار کے گزرا — اللہ رے رسائی، مری پرواز تو دیکھو!
اے وائے کہ اس سعی پر اپنی، کبھی اس سے — سازش نہ ہوئی، طالعِ ناساز تو دیکھو!
کیا بولنے میں اس بتِ کافر کے ادا ہے — شیریں سخنی اک طرف، آواز تو دیکھو!

ابتر ہے یہ دیواں تو، میاں مصحفی، سارا
انجام کی کیا کہتے ہو؟ آغاز تو دیکھو

۲۱۳

بہارِ گل کی خوبی ہم دل افگاروں سے مت پوچھو — مزہ گلگشت کا گلشن کے بیماروں سے مت پوچھو
ہزاروں طرح دل دینے کے تئیں آغازِ الفت میں — جو آفت ہم پر آئی ان طرحداروں سے مت پوچھو
رہائی نام ہے کس چیز کا اور کس کو کہتے ہیں؟ — یہ بات، اے دوستاں! ہم سے گرفتاروں سے مت پوچھو
تجلی نام شعلہ رات اس گلشن میں دائر تھا — پڑی پھولوں پہ بجلی کس کے رخساروں سے مت پوچھو
مرا جی جانتا ہے یا میں جانوں ہوں، وہ کیا جانیں؟ — جو غم گزرے ہے مجھ پر میرے غم خواروں سے مت پوچھو
کہا اک بار میں نے حالِ دل اپنا میاں! تم سے — یہ کیا خو ہے تمھاری؟ اتنی تکراروں سے مت پوچھو
جو کچھ ہم پر گزرتی ہے وہ پوچھو ہم سے، کہہ دیں گے — خدا کے واسطے ان کبک رفتاروں سے مت پوچھو
حسن کا شعر ہے، میاں مصحفی، کیا حسبِ حال اپنے — سنو تم ہم سے، اس کو خانماں داروں سے مت پوچھو

"گئے وے دن جو رہتے تھے جہاں آباد میں ہم بھی
خرابِ شہر کی صحرا کے آواروں سے مت پوچھو"

۲۱۴

گر اپنا حال غم سے ترے تنگ ہے تو ہو — آنکھوں کا اشکِ سرخ سے یہ رنگ ہے تو ہو

اپنے تو گھر میں نالہ و زاری ہے روز و شب — مجلس میں اس کی شغلِ نے و چنگ ہے تو ہو
تیغِ جمال کو نہ لگے تیری مورچہ — گر دل کے آئنے پہ مرے زنگ ہے تو ہو
ہم بت کے پوجنے کو سمجھتے ہیں اپنا فخر — اس سے خدا پرستوں کو گر ننگ ہے تو ہو

کعبے کا جانا فرض نہیں ہم کو مصحفی
کعبہ جو ہم سے سیکڑوں فرسنگ ہے تو ہو

۲۱۵

بس کہ سرتا بہ قدم مائلِ بیداد ہے سرو — غم میں اس قد کے اک آہِ دلِ ناشاد ہے سرو
قد کشاں باغ میں جس روز کہ وہ آیا تھا — ہائے وہ روز قیامت کا تجھے یاد ہے سرو!
بند ہے خاکِ چمن سے رگ و ریشہ اس کا — پر غلط ہے یہ جو کہتے ہیں کہ آزاد ہے سرو
حق تعالیٰ تجھے اس باغ میں سرسبز رکھے — تیرے قدموں ہی کی دولت چمن آباد ہے سرو
جوشِ خوں کا مرے ہوتا نہیں اس پر بھی علاج — گرچہ ہر برگ ترا نشترِ فصّاد ہے سرو
رو دیا میں نے جو قمری نے کہا وقتِ سحر — بھر کے اک آہ ترے ہاتھوں سے فریاد ہے سرو
گرچہ ہر نخل جدا باغ میں سر کھینچے ہے — پر جو دیکھا تو قیامت تری استاد ہے، سرو!
ہے غلط قد کو ترے سرو سے نسبت دینا — سایہ قد کا ترے، اے شوخِ پری زاد! ہے سرو
کیجو آزردہ نہ قمری کو، ترے سر پر سے — اڑ گئی وہ تو یہ خوبی تری برباد ہے سرو

قدِ نوخیز کو اس سرو کے کب پہنچے ہے
گرچہ رعنائی میں، اے مصحفی! استاد ہے سرو

۲۱۶

آج جو صبح سے تم چیں بہ جبیں بیٹھے ہو — بے جگہ رات مگر جا کے کہیں بیٹھے ہو
ہو جفا جوئیِ گردوں سے جو اتنے غافل — ایسی کس فکر میں، اے اہلِ زمیں، بیٹھے ہو؟
کہیں دیکھا ہے یہ غم؟ تم بھی تو آخر، یارو! — سالہا با غم و اندوہ قریں بیٹھے ہو

مرگیا کونسا دل سوز تمھارا عاشق ؟
کس کے ماتم میں، مری جان! حزیں بیٹھے ہو

تم گرفتاریِ خاطر کو، میاں، کیا سمجھو؟
ابھی روزِ بدِ عاشق ہیں نہیں بیٹھے ہو

حلقۂ بزم کی نت زیب رہی ہے تم سے
تم جہاں بیٹھے ہو واں مثلِ نگیں بیٹھے ہو

کوچۂ یار میں کل چھوڑ گیا تھا تم کو
آج دیکھا تو اُسی طرح غمیں بیٹھے ہو

میں یہ جانا تھا کہیں گھر کو سدھارے ہوگے
کیا، میاں مصحفی، تم تب کے یہیں بیٹھے ہو ؟

۴۱۷

اپنی پیشانی پہ تم مالشِ صندل نہ کرو
دردِ سر مجھ کو نہ دو، جی مرا بیکل نہ کرو

کیا قیامت ہے کہ تم خون کرو عالم کا
اور نظر جانبِ رنگینیِ مقتل نہ کرو

تیرہ روزی کو مری سرمہ کفایت ہے، میاں!
ٹک خدا ہی سے ڈرو آنکھوں میں کاجل نہ کرو

حاکمِ شہر اگر میں ہوں تو اتنا کہہ دوں
کہ کوئی شہر میں آئینے کو صیقل نہ کرو

میں بھی موجود ہوں اور تم بھی ہو، یہ تیغ، یہ طشت
قہر ہے اب بھی جو جھگڑا مرا فیصل نہ کرو

یا علی! مصحفی پھر جائے بھلا کس کے پاس ؟
اس کی مشکل کے تئیں تم ہی اگر حل نہ کرو

۴۱۸

رہنے دو مرے سینے میں، پیکاں کو نہ چھیڑو
از بہرِ خدا ناوکِ جاناں کو نہ چھیڑو

ٹک رحم کرو چاکِ گریبان پہ مرے
یارو! کوئی اس شوخ کے داماں کو نہ چھیڑو

اس دھوم سے آئی ہے بہار اب کے کہ ہر سو
تدغن ہے کہ برگِ گل و ریحاں کو نہ چھیڑو

یہ وہ نہیں ناسور کہ ہو بند کسی سے
رہنے دو مرے دیدۂ گریاں کو نہ چھیڑو

خاطر کو پریشاں نہ کرو اور بھی میری
ہر لحظہ، میاں! زلفِ پریشاں کو نہ چھیڑو

روٹھا ہوں جو میں اس سے تو من لوں گا پھر آپھی
جاؤ، کوئی مجھ تازہ پشیماں کو نہ چھیڑو

وہ فتنہ نہیں ہے وہ کہ تہمت نہ لگاوے — ہر چند کہ اس فتنۂ دوراں کو نہ چھیڑو
اے ناصحو! کچھ فکر کرو چاکِ جگر کا — بیہودہ مرے چاکِ گریباں کو نہ چھیڑو
زلفیں تری زاہد سے الجھتی ہیں، تو آنکھیں — کہتی ہیں کہ اس مردِ مسلماں کو نہ چھیڑو
دکھتا ہے یہ دل اور بھی فریاد کرے ہے — مت ہاتھ لگاؤ دلِ نالاں کو نہ چھیڑو

رہنے دو پڑا مصحفیِ خاک بہ سر کو
اس غمزدۂ بے سر و ساماں کو نہ چھیڑو

۴۱۹

زلفوں کو کیوں کیا ہے پریشان؟ یہ کہو — کیا مدّعا ہے اس سے، مری جان! یہ کہو
باراں سے میرے اشک کو نسبت نہ دو کوئی — نازل ہوا ہے عرش سے طوفان یہ کہو
اب تک ہے انکھڑیوں میں تمھاری خمار سا — کس کے رہے تھے رات کو مہمان؟ یہ کہو
دیر و حرم کی راہ میں حیراں ہے میری عقل — جاؤں کدھر کو؟ گبر و مسلمان! یہ کہو
کس پر سجی ہے تم نے میاں تیغ خوش غلاف؟ — ہے ایسا کس کے قتل کا سامان؟ یہ کہو
اس خستہ دل کو دکھتے ہو تم جو، دوستو! — دیکھی ہے اس کی جنبشِ مژگان؟ یہ کہو
جاؤں چمن میں اب کے تو پوچھوں گلوں سے میں — "کس پر ہوئے ہو چاک گریبان؟ یہ کہو"
نکلے ہو آج آئنہ خانے سے بے حواس! — نظروں میں کھب گئی ہے کوئی آن؟ یہ کہو
نرگس کی طرح نکلے ہے اک تم سے رفتگی — اے دیدہ! اتنے کس کے ہو حیران؟ یہ کہو

آخر تمھارے، ناز کا کشتہ ہے مصحفی
کیوں ہو گئے ہو جان کے انجان؟ یہ کہو

۴۲۰

ہمارے حال پر اس کی نگاہ کیونکر ہو — الٰہی دیکھیے عفوِ گناہ کیونکر ہو
خدا نے تجھ کو بنایا ہے سنگ دل، اے بت! — بھلا کسو کی ترے دل میں راہ کیونکر ہو

نہ در سے جھانکے کبھی وہ نہ بام پر آوے ہماری اس کی ملاقات آہ کیونکر ہو

جہاں کہ ہو دمِ شمشیرِ تیغِ تیز بلند زباں بریدہ کوئی داد خواہ کیونکر ہو

تھیں تو غیروں سے الفت ہے تم ہو ہرجائی تمھارے ساتھ ہمارا نباہ کیونکر ہو

ہنوز ملنے کی صورت نظر نہیں آتی اس آرزو میں بسر سال و ماہ کیونکر ہو

یہ کیا سبب ہے؟ میاں مصحفی، بتاؤ تو
تم اس گلی میں بحالِ تباہ کیونکر ہو

۴۲۱

تو کہے سو بار اگر اپنی زباں سے "دور ہو" یہ نہیں ممکن فقیر اس آستاں سے دور ہو

ہجر میں اس بے وفا کے مجھ پہ جو گزرے ہے ہائے! یہ وہی جانے جو اپنے دل ستاں سے دور ہو

گو کہ دن ہووے بڑا پر ایسی منزل کے تئیں کس طرح پہنچے جو کوسوں کارواں سے دور ہو

قصۂ دردِ غریبی اس سے پوچھا چاہیے موسمِ گل میں جو اپنے آشیاں سے دور ہو

کل گیا تھا اس کے کوچے میں، وہ مجھ کو دیکھ کر غصے ہو کہنے لگا یوں "چل بے یاں سے دور ہو"

گو نہ اٹھے تو نہ اٹھے اس کے چہرے سے نقاب یہ حجابِ چشم یارب درمیاں سے دور ہو

مصحفی تو مر بھی نئیں جاتا کہ تا اے ننگِ عشق!
نامِ بدنامی کہیں اس دودماں سے دور ہو

۴۲۲

آ بھی اکتا کے جو تیرے آستاں سے دور ہو تو نہ کہہ، پیارے! اسے اپنی زباں سے "دور ہو"

کس طرح وہم و گماں میں آدمی کے آسکے وہ منزّہ ذات جو وہم و گماں سے دور ہو

یاس کو اس بلبلِ بے پر کی دیکھا چاہیے آتشِ گل جس کے کچھ اک آشیاں سے دور ہو

کیوں نہ راتوں کے تئیں، اے ماہ تیرا منہ تکے جو کوئی اپنے مہ رو نامہرباں سے دور ہو

ہے مرے سینے میں آتش دل کے ہاتھوں سے بھری چین سے سوؤں جو یہ دل درمیاں سے دور ہو

ایک تنکا بھی نہ ڈھونڈا پائیے، افسوس ہے! — آشیاں بلبل کا یوں اس گلستاں سے دُور ہو

مصحفی روئے زمیں پر یوں نہیں رہنے کا لطف
آسماں کو دور کر یا آسماں سے دور ہو

۴۲۳

نے وہ آپ آوے، نہ قاصد درمیاں سے دُور ہو — دل کی بیتابی مری یارب، کہاں سے دُور ہو
اس بیاباں میں الٰہی قیس کا ہووے گزار — جس بیاباں میں کہ ناقہ سارباں سے دور ہو
کب روا ہے یہ کہ ایسی فصلِ گل میں، باغباں! — بلبل بیچارہ اپنے آشیاں سے دور ہو
میں جو کھینچوں ہوں بغل میں اس کو یوں بھاگے ہے وہ — جیسے کھینچ کر تیر آغوشِ کماں سے دور ہو
جس نشاں پر تیر پھینکے تک کے وہ ابرو کماں — کیا عجب داغِ سیاہی اس نشاں سے دور ہو
پان کھا کر وہ بتِ رنگیں ادا، اے مصحفی! — مجھ سے کل کہتا گیا "یوں تو بھی یاں سے دور ہو"

اب کے گر آیا تو میں بھی منہ سے اس کے منہ لگا
ایسے بوسے لوں کہ سرخیِ رنگِ پاں سے دور ہو

۴۲۴

ہم جی سے خفا بیٹھے ہیں، آؤ نہ ادھر کو! — تلوار لیے ہاتھ میں جاتے ہو کدھر کو!
ڈرتا ہوں کہ گرد آپ کے دامن پہ نہ بیٹھے — ٹھکرائے ہوئے چلتے ہو اس خاک بسر کو
تختہ ہو چمن کا مرا ہر تختۂ دامن — دامن میں اگر جمع کروں لختِ جگر کو
کاکل کی ترے یاد میں رویا ہی کروں ہوں — کھل جاتی ہے جب آنکھ مری پچھلے پہر کو
محبوبوں کا ازبس کہ تو محبوب ہوا ہے — لپٹے ہے تری زلف بھی اب تیری کمر کو
جب مل گیا منہ پھیر لیا اس کی طرف سے — نالے سے مرے ننگ رہا بس کہ اثر کو
یوں لختِ دل اور اشک ہیں مژگاں پہ مری جمع — اک تاگے میں جوں دیوے گرہ لعل و گہر کو
گھایل کا ترے داغ نگہباں ہے، جس طرح — زخمی کے گلے باندھیں ہیں طاؤس کے پر کو

گھر جائے کا مت نام لے، جی دھڑکے ہے میرا
میں خاک رہوں گا تو گر جائے گا گھر کو؟

تیرے لب و دنداں کی مزے داریاں، پیارے!
ڈرتا ہوں کہ رسوا نہ کریں شیر و شکر کو

اے مصحفی میں آہ کی سوزن سے شبِ وصل
کرتا ہوں رفو چاکِ گریبانِ سحر کو

۴۲۵

نامِ عشق اب تو لیا اس میں بھلا ہو یا نہ ہو
خود وفا کرنی ہمیں، اُس میں وفا ہو یا نہ ہو

خوب رو لڑکے کا ہم کو ٹک نظر آنا ہے شرط
پھر تو دو دو باتیں کرنی، آشنا ہو یا نہ ہو

وے نہیں کچھ ہم کہ بھاگیں دیکھ کر انبوہ خلق
ہم کو بھی جا بیٹھنا مجلس میں جا ہو یا نہ ہو

ہائے رے زلفیں تری اور ہائے رے وہ لمبے بال
دیکھ کوئی ان کو گرفتارِ بلا ہو یا نہ ہو

جب کہ تو گالی سوا پیارے کرے ہرگز نہ بات
تو ہی کہہ باتوں سے تیری جی برا ہو یا نہ ہو

ڈھب کڈھب اس کو لگائی تیغ ہر دم مصحفی
اس میں سر مقتول کا تن سے جدا ہو یا نہ ہو

۴۲۶

مجھے کر قتل، ناحق آپ کو بدنام کرتے ہو
میاں کیوں کھینچتے ہو تیغ کو کیا کام کرتے ہو

دکھاتے ہو اگر گاہے سرِ دیوار سے مکھڑا
تو پھر وہیں نہاں جوں آفتابِ بام کرتے ہو

ستم کرتے ہو اور بیداد یہ، ہم روسیاہوں پر
کہ زلفوں کو نقابِ عارضِ گلفام کرتے ہو

نگاہیں تو بہم لڑتیاں ہیں پر کچھ شرم کے مارے
نہ ہم پیغام کرتے ہیں، نہ تم پیغام کرتے ہو

تمھیں، اے دیدہ و دل! آفریں! اپنی تو کیا کہیے
خیال اک ایسے ہی وحشی کا ہر شب رام کرتے ہو

جو ملنا ہے تو اک شب مصحفی سے آ کے مل جاؤ
میاں! جھوٹی یہ کیا ہر روز صبح و شام کرتے ہو

۴۲۷

زبس آنکھوں پہ پھر گھیرے ہی رہتی ہے حیا تجھ کو / نہیں پاتا میں اپنے ساتھ ہرگز آشنا تجھ کو

حرم میں جا مرے، اے محرم! تو اتنا اس سے کہہ دیجو / پسِ دیوار بیٹھا کوئی دیتا ہے دعا تجھ کو

ترا کشتہ ہوں میں، اے نونہالِ باغِ رعنائی! / کہ اس بوٹے سے قد پر کتنی پھبتی ہے قبا تجھ کو

مرے دل کی پریشانی کو سمجھے اپنی زلفوں سے / نہیں اتنا بھی ہوش، اے دشمنِ جاں! کیا بھلا تجھ کو

رہا ویسا ہی بیگانہ تو نامِ آشنائی سے / نہ لائی آہ میری بر سرِ مہر و وفا تجھ کو

بایں بے پردگی ہے گر یہ تیرا بام پر آنا / تو رسوا کر رہا ہے ایک دن یا مجھ کو یا تجھ کو

ہمارے دل کی آسائش نہ چاہی، ہائے کیا ہوتا! / جو ساتھ اس حسن کے ٹک رحم بھی دیتا خدا تجھ کو

دیا ہاتھوں پر اس کے عاشقانہ تو نے جا بوسہ / نہ آئی شرم خونِ دل سے میرے، اے حنا! تجھ کو

کہیں اے مصحفی، سودا نہ ہو تو مجھ کو یہ ڈر ہے
پڑا ہے بے طرح سے دیدہ بازی کا مزا تجھ کو

۴۲۸

جاتا تھا سرِ رہ سے چلا صبح کہیں کو / سر پیٹ لیا دیکھ کے میں اس کی جبیں کو

آنکھوں سے مری حسرتِ نظارہ نے تیری / کر آب بہایا نگہِ باز پسیں کو

اے دیدہ! تجھے قدر ہے کیا لختِ جگر کی / کیوں ہاتھ سے کھوتا ہے سلیماں کے نگیں کو

ہر چند میں سو پردے میں تقریرِ سخن کی / پر کوئی نہ سمجھا مری آوازِ حزیں کو

اے وائے! کہ آ رہتا ہے اک ٹکڑا جگر کا / جب پونچھوں ہوں دامن سے میں اس چشمِ نمیں کو

کچھ جذبِ محبت سے نہیں دور جو رقصاں / لاوے بہ حرم راہبِ بت خانہ نشیں کو

اے مصحفی رشحِ قلمِ نادرِ فن سے
ٹک اور بھی سرسبز کر اس تازہ زمیں کو

۴۲۹

گو مجھ پہ فلک تیز کرے خنجرِ کیں کو
جیتے تو نہ چھوڑوں گا میں اس مہر جبیں کو

یہ حسن وہ شعلہ ہے کہ گر سر کو اٹھاوے
پروانہ بناوے پرِ جبریلِ امیں کو

کیا دُور ہے کچھ اس سے؟ تری چشم کی گردش
اک پل میں جو چاہے تو الٹ دیوے زمیں کو

پیار آتا ہے جب دل میں تو سوچوں ہوں یہی میں
بوسہ ترے رخسار کو دیجے کہ جبیں کو

اے شوقِ سفر اس کی خبر ہم کو بھی کیجو
گر، یاں سے کوئی قافلہ جاتا ہو کہیں کو

باندھا ہے، مری جاں ایدِ قدرت نے خدا کی
ہر چین میں کاکل کی ترے ناقہ چیں کو

زیبندہ ہے یوں لختِ جگر اشک کے پیچھے
جیسے کہ جلا ڈانک سے ہوتی ہے نگیں کو

اے مصحفی! دلی میں بہ اعجازِ مسیحا
خامے نے ترے پھر کے جلایا ہے حزیں کو

۴۳۰

کیا حسن ہے اس کے ہو خبر اہلِ زمیں کو؟
سورج نے کبھی دیکھا نہیں جس پردہ نشیں کو

حکاک نے جب یاد دیا نام ہمارا
آزردہ کیا بر سرِ ہر حرف نگیں کو

کیا تاب کبوتر جو مرے نامے کو لیجاوے
واں طاقتِ پرواز نہیں روح الامیں کو

گھبراتا ہے جب جی تو یہی آئے ہے دل میں
سر پیٹ نکل جائیے بستی سے کہیں کو

میں دم بخود اس کوچے سے گزرا کہ مبادا
پہچان لے دشمن مری آواز حزیں کو

یہ اس سے نکو تر ہے تو وہ اس سے نکو تر
رخسار کو ہم اس کے سراہیں کہ جبیں کو؟

اے مصحفی ہے خوف مجھے آہ کا تیری
لاوے نہ تزلزل میں کہیں عرشِ بریں کو

۴۳۱

ٹک مرے حال پر نظر تو کرو
کوئی جاؤ اسے خبر تو کرو

اور ہی انداز کا ہے یہ رونا — ابر اس طرح چشمِ تر تو کرو
صفِ مژگاں کے سامنے، یارو! — ہونا ہووے سو ہو جگر تو کرو
بات کہتا ہوں تم سے، سنتے ہو! — ٹک، میاں جان! منہ اِدھر تو کرو

سوچنے کیا ہو؟ خوب ہووے گا
مصحفی یاں سے تم سفر تو کرو

۴۳۲

اے دل! اک روز ہم اپنا بھی جگر دیکھیں تو — تیرِ مژگاں کا ہدف سینے کو کر دیکھیں تو
ابر سے آج مجھے دعویِ خونباری ہے — رنگ کیا لاتے ہو، اے دیدۂ تر! دیکھیں تو
میں اِدھر یار کا خواہاں ہوں، اُدھر تو، اے دل! — کون لیجاوے اسے کھینچ کے گھر دیکھیں تو؟
کب کے مشتاق ہیں، کیسی ہے؟ کدھر ہے؟ کیا ہے؟ — ٹک ادھر آ تو، تری ہم بھی کمر دیکھیں تو

مصحفی طبعِ رواں بر سرِ دُر ریزی ہے
اور بھی فکر ٹک اس بحر میں کر دیکھیں تو

۴۳۳

شام تک کرتی ہے تو کیونکہ اثر! دیکھیں تو — ہم بھی شیخی تری، اے دیدۂ تر! دیکھیں تو
ڈھب میں آجائے تو آجائے وہ شب چوری سے — اس کے پانو پہ ذرا ہاتھ کو دھر دیکھیں تو
لالہ ہے شعبدہ بازی پہ چمن میں، ہم آج — گل کھلانا ترا، اے داغِ جگر! دیکھیں تو
تیرِ مژگاں ترے سورج سے یہی کہتے ہیں — ہم ذرا آج یہ تیری بھی سپر دیکھیں تو
کرتے ہیں دعویِ اعجازِ مسیحا لبِ یار — کیا تعجب ہے جلادیں، کبھی مر دیکھیں تو
ہم بھی موجود ہیں اور اتنے اسیر، اے قاتل! — کون رکھتا ہے تلے تیغ کے سر دیکھیں تو؟

دشت میں بھی نہ ملا مصحفیِ آوارہ
کبھی آیا ہو بھلا پھر اُسے گھر دیکھیں تو

۴۳۴

اوروں پہ نہ نیمچہ نکالو — یوں چاہو تو ہم کو مار ڈالو

تیار ہوا ہے قافلہ سب — پھر دیر یہ کیا ہے؟ چلنے والو!

یہ طرفہ کہ ہم کو ہی کرو قتل — اور الٹا ہمیں سے خونبہا لو

یوں گزریں ہیں خاکِ کشتگان سے! — دامن کو تو اپنے ٹک سنبھالو

کیا اپنی کہو ہو، ٹک سنو تو — باتوں میں نہ میری بات ٹالو

تم وے ہو کہ جس کے دل کو چاہو — نظروں میں میاں! اوہیں چرالو

لازم ہے کہ سب کے روبرو ہو؟ — اور پردے میں ہم سے منہ چھپالو

اے مصحفی! دوستدار آخر
روٹھا ہے تو اس کو جا منالو

۴۳۵

اک تو بیٹھے ہو دل کو مرے کھو اور سنو! — تس پہ کہتے ہو "دیا ہے تجھے" لو اور سنو!

نے پیو آپ، جو دیویں مجھے تلچھٹ احباب — ان سے کہتے ہو "اسے خاک نہ دو" اور سنو!

قصہ اپنا تو میں سب تم سے کہا، اے یارو! — چپکے کیوں بیٹھے ہو؟ کچھ تم بھی کہو اور سنو!

چٹکیاں لیتے ہو جب پاس مرے بیٹھو ہو — آپ نے زور نکالی ہے یہ خو، اور سنو!

ستم طرفہ تو یہ ہے کہ مجھے روتا دیکھ — ہنس کے کہتے ہو "ذرا اور بھی رو" اور سنو!

ابھی دفتر ہیں بغل میں مری، اے ہم نفسو! — ایک ہی بات میں اتنا نہ رکو، اور سنو

مصحفی ڈر نہیں میرے تئیں رسوائی سے
بات اپنی مجھے کہنی ہی کو اور سنو

۴۳۶

بزم ہو، یار ہو اور شغلِ مے و جام بھی ہو — پھر تو خطرے ہیں جو ایسے میں یہ ناکام بھی ہو

ہاے! کیا صبر کروں، میں تو موا جاتا ہوں
دلِ بیتاب کو یارب کہیں آرام بھی ہو

کیا قیامت ہے کہ آنکھ اک تو لڑے غرفے سے
تس پہ پھر محوِ تماشاے لبِ بام بھی ہو

فرقتِ یار میں یہ دن تو مجھے دکھلایا
بارے، اے صبحِ فراق! اب تو کہیں شام بھی ہو

ہے ارادہ ترے کوچے سے سفر کا ہم کو
ابھی اٹھ جاویں جو تھوڑا سا سرانجام بھی ہو

ذبح کر ایسے سلیقے سے تو مجھ کو کہ میاں!
خونِ خنجر پیے اور اس میں مرا نام بھی ہو

ایک بوسے کے لیے کیا ہمیں ترساتے ہو
جان جاتی ہے جو دینا ہے تو انعام بھی ہو

اس نے کیوں نامہ مرا چاک کیا؟ اے قاصد!
ہے قسم مجھ کو اگر اس میں مرا نام بھی ہو

تُو تُو کیا بات ہے خط کی ترے، سبحان اللہ!
اگر ایسا ہی اس آغاز کا انجام بھی ہو

حیف ہے اس پہ بھی گر اس کے نہ پہنچے در تک
جب کہ عاشق میں طلب ہووے اور ابرام بھی ہو

مصحفی ہر گھڑی جایا نہ کرو تم صاحب
اک تو عاشق ہو اور اس کوچے میں بدنام بھی ہو

۴۳۷

دور سے مجھ کو نہ منہ اپنا دکھاؤ، جاؤ
بس جی بس دیکھ لیا میں تمھیں جاؤ جاؤ

اس قدر آمد و شد تم کو ضرر رکھتی ہے
دوستاں! ہر گھڑی اس کوے میں نہ آؤ جاؤ

"جاؤں جاؤں" ہی جو کرتے ہو تو مانع ہے کون
جاؤ، مت جاؤ، جو جاتے ہو تو جاؤ، جاؤ

آپ کی آنکھوں سے میرے تئیں ڈر لگتا ہے
مجھ ستم کشتہ سے آنکھیں نہ ملاؤ، جاؤ

تم جہاں جاتے ہو، مجھ کو بھی خبر ہے صاحب!
اپنے جانے کو نہ ہمارے سے چھپاؤ، جاؤ

سیرِ گلشن کو اگر جاتے ہو ہمراہِ رقیب!
بخشو میرے تئیں، مجھ کو نہ بلاؤ، جاؤ

ہم سے کیا منہ کو چھپاتے ہوئے جاتے ہو تم!
ہم نے پہچان لیا، منہ نہ چھپاؤ، جاؤ

آپ کی میری کسی طرح نہ ہووے گی صلح
فائدہ کچھ نہیں، باتیں نہ بناؤ، جاؤ

کیا میاں مصحفی یاں جی کے تئیں کھووگے
اس کے کوچے سے کہیں رخت اٹھاؤ، جاؤ

۴۳۸

چھیڑا ہے کس نے تجھ کو جو چیں بر جبیں ہے تو؟ — وہ کون ہے کہ جس پہ میاں، خشمگیں ہے تو

تابِ جفائے عشق نہ لاوے گا، جانِ من! — جانے دے، نامِ عشق نہ لے، نازنیں ہے تو

ہاتھوں سے تیرے مجھ پہ جو عرصہ ہوا ہے تنگ — اس کا سبب یہی ہے کہ تنگ آستیں ہے تو

کیا جانے خال و خط کو بنا لے تو کیا کرے — اس حسن پر تو فتنۂ روئے زمیں ہے تو

گر روزِ حشر ہو تو ترے منہ پہ یوں کہوں — «آ محکمے میں، کیوں مرا قاتل نہیں ہے تو؟»

اے دوزخِ فراق! میں سارا ہی جل گیا — کس دردمند کا نفسِ آتشیں ہے تو؟

کل آسماں تلک نہ قدم رکھ سکا، چہ خوش! — اے نالہ! آج عازمِ عرشِ بریں ہے تو

عرشِ بریں کے در پہ جو میں حلقہ زن ہوا — آئی صدا یہ واں سے کہ "عرشِ بریں ہے تو"

اے لختِ دل! نہ رکھیو قدم پیشتر کہیں — خاتم پہ میری چشم کے جیسے نگیں ہے تو

میری خبر نہ تجھ کو، نہ تیری خبر مجھے — مدت سے میں کہیں ہوں، میاں، اور کہیں ہے تو

اے مصحفی بتا تو ترا کس نے دل لیا
دل کے لیے جو اس قدر اندوہگیں ہے تو

۴۳۹

جانِ ستم رسیدہ آئی ہے لب تلک تو — آنا ہے تجھ کو تو آ جیتا ہوں اب تلک تو

کرتا بلند نالہ کیا اور شیشۂ دل — بانگِ شکست اس کی پہنچی حلب تلک تو

جوں شمع پھر سحر گہ پیالے اٹھا ہی دیجو — محفل میں تیری ہم بھی بیٹھے ہیں شب تلک تو

ہاتھوں سے میرے، اے غم! مت چھین جامِ عشرت — لیجانے دے یہ ساغر تو مجھ کو لب تلک تو

مت مصحفی سے پیارے! کر کل کا وعدۂ وصل
رہنے کی نئیں ہے باقی کچھ اس میں جب تلک تو

۴۴۰

جو غیر سے ملا ہو، وہ ہم سے یار کب ہو — اور ہووے بھی تو اس سے صحبت برار کب ہو

شعلے سے اس کے گر وہ تیری سی خو نہ دیکھے — پروانہ شمع اوپر پیارے نثار کب ہو

ہم رو کے کوچہ دل بیٹھے ہیں آرزو میں — دیکھیں پھر اس طرف سے اس کا گزار کب ہو

کھل کھل کے آئنے میں وہ گل جو منہ نہ دیکھے — آئینہ اس طرح سے باغ و بہار کب ہو

پھندے میں اس کے میں ہی اک پھنس گیا وگرنہ — جو ہووے مرغِ زیرک وہ یوں شکار کب ہو

جو آئنے میں اپنی صورت کو دیکھ جھجکے — یارانِ صاف دل سے پھر وہ دوچار کب ہو

اے مصحفی مجھے تو اس نے بہت ستایا
اس بے قرار دل کو دیکھیں قرار کب ہو

۴۴۱

بیچ دنیا کے کچھ آئے نہیں گھر کرنے کو — مستعد بیٹھے ہیں ہم یاں سے سفر کرنے کو

گو شبِ ہجر نہ ہو صبح ہمیں کیا پروا — شعلۂ آہ کفایت ہے سحر کرنے کو

ہم کہاں اور تماشائے رخِ یار کہاں! — حوصلہ چاہیے ہے اُس پہ نظر کرنے کو

کیا قیامت ہے کہ تو کچھ نہ کہے اور لے جائیں — تیرے کوچے سے ہمیں شہر بدر کرنے کو

ہم تو گلدستہ ہی باندھا کریں بیٹھے لیکن — چاہیے دل بھی بہم لختِ جگر کرنے کو

ظلم سے ہاتھ اٹھایا نہ کبھی قاتل نے — توڑے گر تیغ تو رکھّے وہ تبر کرنے کو

مصحفی گوش ادھر رکھ کہ انھیں قافیوں میں
طبع ہے فکر بہ اندازِ دگر کرنے کو

۴۴۲

اک تو آگو ہی ترستے تھے نظر کرنے کو — تس پہ پھر حکم ہوا شہر بدر کرنے کو

قاصد آتا ہے کچھ اس کوُ سے بہت آزردہ — دیکھیے آیا ہے کس کس کی خبر کرنے کو

کون مدفون ہے ایسا جو ترے کوچے میں — روز آتی ہے صبا خاک بہ سر کرنے کو
سخت مشکل ہے کہ اس ناوکِ مژگاں کے حضور — چاہیے روز نیا سینہ، سپر کرنے کو
راہ سورج کی شبِ ہجر کہاں تک تکیے — آ جھمک تو ہی ٹک اس شب کی سحر کرنے کو
روز اے نالہ! کہے ہے تو کروں گا اب اثر — آگ لگ جائے کہیں تیرے اثر کرنے کو

مصحفی دل کی تسلّی نہ ہوئی اس سے، تو لکھ
اک غزل اور بھی اظہارِ ہنر کرنے کو

۴۴۳

آیا اس کو میں جو میں خاک بہ سر کرنے کو — دل گیا وو ہیں اسے میری خبر کرنے کو
شبِ غم میں نہ کہو کوئی جز افسانۂ زلف — یہی افسانہ کفایت ہے سحر کرنے کو
نالہ یا آہ بن اس کی تو گزرتی ہی نہیں — چاہیے کچھ بھی تو اوقات بسر کرنے کو
یا تو ان آنکھوں سے دریا سے پڑے بہتے تھے — یا اب اک قطرہ نہیں ہے مژہ تر کرنے کو
آئینے نے ترے مکھڑے کی بہاریں لوٹیں — ہم ترستے ہی رہے ایک نظر کرنے کو
صفِ مژگاں کے رہا خوب مقابل، اے دل! — آفریں تجھ کو اور اس تیرے جگر کرنے کو
جس نے اس کوچے میں دیکھا مجھے اتنا ہی کہا — "جا بھی، کیوں آیا ہے یاں جی کا ضرر کرنے کو؟"
وے اولی العزم کدھر رہ گئے جو قافلے میں — ساتھ تھے محملِ لیلیٰ کے سفر کرنے کو

مصحفی حقِّ نزاکت نہ ادا ہو، جب تک
ہووے مو سی نہ زباں وصفِ کمر کرنے کو

۴۴۴

آپ آئے ہیں ہمیں رخصت اگر کرنے کو — آئیے، ہم بھی ہیں دنیا سے سفر کرنے کو
کربلا ہے یہ گلی کیا جو نہیں ملتا یہاں — ایک قطرہ بھی لبِ خشک کے تر کرنے کو
ہیں کھلے چاکِ قفس، لیک گلستاں میں ہمیں — حکمِ صیّاد نہیں گل پہ نظر کرنے کو

یہ چمن جاے اقامت نہیں جب تو شب سے — غنچے گٹھری لیے بیٹھے ہیں سفر کرنے کو
زہر کا جام پلانے سے ہمیں کیا حاصل؟ — اک نگہ کافی ہے سو ٹکڑے جگر کرنے کو
اے فلک! کس نے کہا تھا تجھے یہ تو بتلا — اس شتابی سے شبِ وصل سحر کرنے کو؟
اِن دنوں بس کہ زمانے میں نہیں قدرِ ہنر — ہم سمجھتے ہیں ہنر، ترکِ ہنر کرنے کو
وے جو مارے تھے کبوتر مرے اس نے، ان کے — جمع کر رکھے ہیں پر بالشِ پر کرنے کو

مصحفی یوں تو سبھی شعر و سخن کہتے ہیں
چاہیے لطفِ سخن دل میں اثر کرنے کو

۴۴۵

بعد از سالے و ماہے گر کبھو آیا کرو — تم ہمارے پاس تو اک شب کو رہ جایا کرو
میں تو سمجھوں گا جو سمجھاتے ہو مجھ کو ہر گھڑی — لیکن ان دزدیدہ نظروں کو بھی سمجھایا کرو
گو کوئی میری طرف سے کچھ کہے تم کو، میاں! — تم کسی کی بات کو خاطر میں مت لایا کرو
سیکڑوں کا خوں کیا ہے اس تمھاری تیغ نے — چپ رہو، جھوٹی نہ قبضے کی قسم کھایا کرو
دل الجھتا ہے ہمارا دیکھ کر اس وضع کو — بال زلفوں کے بہت بھی تم نہ سلجھایا کرو
موکشاں میرے تئیں، اے محرمانِ بزمِ یار! — بر سرِ بازارِ رسوائی نہ لیجایا کرو
ایسے ہاتھوں پر کسی کا خون ہووے گا، میاں! — یہ حنائی ہاتھ ہر اک کو نہ دکھلایا کرو
جی کا ترسانا برا ہوتا ہے مانو بات کو — او میاں صاحب! کسی کا جی نہ ترسایا کرو

جب وہ سو جایا کرے تو بیٹھ کر میاں مصحفی
اپنی آنکھوں سے تم اس کے تلوے سہلایا کرو

۴۴۶

مستی میں اس کے پانو کی افتاد دیکھیو — دل پس گئے ہیں سیکڑوں بیداد دیکھیو
آتا نہ ہووے وہ بھی کہیں، میرے قتل میں — جلدی بہت نہ کیجیو جلاد دیکھیو

صیاد! ناتواں ہوں نہ پہنچوں گا باغ تک
گیجو مجھے قفس سے نہ آزاد دیکھیو

پھرتا ہے کب کا دامنِ صحرا میں گرد باد
یہ کس کی خاک ہوتی ہے برباد دیکھیو

گویا اسے خبر ہے کہ آئی بہارِ گل
ٹک اضطرابِ مرغِ قفس زاد دیکھیو

شیریں! جو بیستوں کی طرف ہو ترا گزار
تو جا کے کارِ تیشۂ فرہاد دیکھیو

میں مرغِ نو اسیر ہوں، مر جاؤں گا، مجھے
جھک کر درِ قفس سے نہ، صیاد! دیکھیو

ہے اس کی رگ کے نیچے رگِ جاں مری نہاں
نشتر لگے زیادہ نہ، فصاد! دیکھیو

مجھ سخت جاں پہ اس کو لگاتے تو ہو ولے
جاوے نہ ٹوٹ خنجرِ فولاد دیکھیو

رکھیو قدم سمجھ کے ذرا کوئے یار میں
یہ کربلا ہے، اے دلِ ناشاد! دیکھیو

لکھی ہے خونِ دل سے میں تصویرِ روئے یار
تم بھی تو اس کو مانی و بہزاد دیکھیو

اے مصحفی نہ جائیو گلشن میں اب کے سال
سرگرمِ عشوہ ہیں گل و شمشاد دیکھیو

۷۴۴

کوچے میں ترے گو کہ نہ جا اپنے تئیں ہو
مرنا ہی جب آیا تو، مری جان! کہیں ہو

رکھ دیکھ تو تو اس کو ذرا دانتوں کے نیچے
شاید کہ کبابِ دلِ عاشق نمکیں ہو

کہتا ہے یہی تجھ سے ترا حسن ہمیشہ
اے برقِ جہاں سوز! کہیں پردہ نشیں ہو

کب پہنچے ہے رتبے کو مرے مجھ سے فرو تر
کیا قدر ہے کرسی کی جہاں عرشِ بریں ہو

سورج کی سی سرعت جو خدا ہم کو بھی دیتا
آ رہتے فلک پر وہیں پھر زیرِ زمیں ہو

اندوہ یہ کس کا مرے سینے میں بھرا تھا؟
نکلا نفسِ سرد بھی جو آہِ حزیں ہو

معلوم کروں میں بھی تو، کیا میری خطا ہے
بتلاؤ تو کس بات پہ تم چیں بہ جبیں ہو؟

فتراک سے باندھو تو ہو سر میرا ولے میں
ڈرتا ہوں نہ آلودہ بخوں دامنِ زیں ہو

ہے ناخنِ غم کی جو خراش اپنے جگر میں
گرتے ہیں سدا لختِ جگر کندہ نگیں ہو

گہ دیر میں جاتا ہوں گہ آتا ہوں حرم میں
تسکینِ دلِ اپنی نہ یہیں ہو نہ وہیں ہو

اے مصحفی، کچھ کام نہیں مجھ کو کسی سے
گو صاحبِ دنیا کوئی یا صاحبِ دیں ہو

۴۴۸

ہوا ہے عشق کا اظہار، دیکھیے کیا ہو
سجی ہے اس نے بھی تلوار دیکھیے کیا ہو

اب اس کا چلنے میں پڑتا ہے کچھ قدم ترچھا
نکالی ہے نئی رفتار دیکھیے کیا ہو

ملے تو ہیں پہ یہی دل میں سوچ رہتا ہے
ٹلا ہے اس کے اب اقرار دیکھیے کیا ہو

بچے تھے مر کے جس آزار سے ہم الفت میں
ہوا ہے پھر وہی آزار دیکھیے کیا ہو

کشیدہ تیغ ہے وہ قاتل اور اس کے حضور
کھڑے ہیں سارے گنہگار دیکھیے کیا ہو

بہا کریں ہیں شب و روز صورتِ ناسور
ہمارے دیدۂ خونبار دیکھیے کیا ہو

تغافلوں نے ترے، ہم سے روزِ محشر پر
رکھا ہے وعدۂ دیدار دیکھیے کیا ہو

اٹھائے صدمے بہت ابتدائے الفت میں
الٰہی عاقبتِ کار دیکھیے کیا ہو

کھنچی ہے اس کی مری چاہ پھر بہ رسوائی
چھپے ہیں رخنۂ دیوار دیکھیے کیا ہو

الجھ رہا ہے مرا جی خیالِ گیسو میں
کھنچا ہے طول یہ آزار دیکھیے کیا ہو

ہمارے ساتھ، مری جان! دوستی میں تری
ہوئے ہیں دشمنِ جاں یار، دیکھیے کیا ہو

شبِ فراق ہیں دیکھا جو کچھ کہ میں دیکھا
سحر ہوئے پہ نمودار، دیکھیے کیا ہو

ملیں ہم اس مۂ نامہرباں سے یا نہ ملیں
فلک ہے درپئے آزار، دیکھیے کیا ہو

ہماری بزم سے اے مصحفی سحر ہوتے
گیا ہے ہو کے وہ بیزار، دیکھیے کیا ہو

۴۴۹

یارب مری اس بت سے ملاقات کہیں ہو
جس بات کو جی چاہے ہے وہ بات کہیں ہو

گر قربِ سخن اس سے نہیں، دور سے، اے کاش!
نظروں ہی میں ٹک حرف و حکایات کہیں ہو

پڑتا ہے حسینوں سے بہت آنکھیں لڑانا
ڈرتا ہوں نہ دل مصدرِ آفات کہیں ہو

ہوتے ہوئے دشمن کے کہوں کیونکہ میں کچھ بات
مجلس سے تری دفع یہ بدذات کہیں ہو

کاغذ پہ شب و روز تری کھینچوں ہوں تصویر
یعنی اسی صورت بسر اوقات کہیں ہو

ہے آج کی شب وعدۂ وصل اس کا مرے ساتھ
یارب کہ شتابی سے یہ دن رات کہیں ہو

دے ڈالو دل اے مصحفی تم ورنہ مری جاں
رسوائی ہے وہ تم پہ گر اثبات کہیں ہو

ہ

۴۵۰

ہم نے چاہا تھا کریں گے رخِ جاناں پہ نگاہ
رہ گئی ضعف سے آ کر سرِ مژگاں پہ نگاہ

اس کی رفتار پہ کچھ! دورۂ داماں پہ بلا!
کیجے رفتار پہ یا دورۂ داماں پہ نگاہ

ہم سے کب آنکھ لڑے اس کی کہ واں رہتی ہے
گاہ سینے پہ گہے چاکِ گریباں پہ نگاہ

حلقۂ در حلقۂ زنجیر چلے جاتے ہیں
کون کرتا ہے اب احوالِ اسیراں پہ نگاہ؟

عزم ہو تجھ کو گر، اے برق! ادھر آنے کا
پہلے کر لیجیو میرے سر و ساماں پہ نگاہ

مل گئے خاک میں ایسے کہ نشاں بھی نہ رہا
کیا کوئی خاک کرے گورِ غریباں پہ نگاہ!

دیدہ بازی کا مزہ شیخ جی کیا جانتے ہیں
ان کی تو آٹھ پہر رہتی ہے قرآں پہ نگاہ

ہم تو مدت سے ہیں محبوسِ قفس کیا جانیں
کہ کبھی کرتے ہیں کیونکر گل و ریحاں پہ نگاہ

یعنی یہ لختِ جگر قابلِ دیدن ہی نہیں
کیا کرے کوئی ان اوراقِ پریشاں پہ نگاہ

ڈر ہے اس چشم سے، یارو! کہ دمِ خوں ریزی
نہ وہ کافر پہ کرے ہے نہ مسلماں پہ نگاہ

مصحفی سلک گہر ایسی کہاں چمکے ہے
کیجیو یار کی شفافیِ دنداں پہ نگاہ

۴۵۱

ہم بھی ہیں ترے حسن کے حیران ادھر دیکھ / کیا آئنہ دیکھے ہے، مری جان! ادھر دیکھ

آنکھیں نہ چرا مجھ سے، مری جان! ادھر دیکھ / اے میں تری اس چشم کے قربان، ادھر دیکھ

ترسوں ہوں تری یک نگہِ لطف کو پیارے / اتنا بھی تو مجھ کو نہ کڑھا مان ادھر دیکھ

عاشق تو ہزاروں ہی غرض گزرے ہیں لیکن / یوں چاک ہوا کس کا گریبان ادھر دیکھ

آنکھیں نہ چرا مصحفیِ ریختہ گو سے
اک عمر سے تیرا ہے ثنا خوان ادھر دیکھ

۴۵۲

جس جا کہ نہ ہووے پرِ و پیکان کا صرفہ / عاشق نہیں پھر وہ جو کرے جان کا صرفہ

نت گل کی طرح دھجیاں کر کر کے اڑایا / ہرگز نہ کیا ہم نے گریبان کا صرفہ

ہر تار سے الجھے ہے یہاں خارِ مغیلاں / اس راہ میں ممکن نہیں دامان کا صرفہ

عاشق کی تسلّی کو بھلا ہنسیے کبھو تو / اتنا بھی نہ کیجے لب و دندان کا صرفہ

وقتیکہ صبا لے گئی بُو اس کی اڑا کر / کیا لطف ہے پھر زلفِ پریشان کا صرفہ

رونا تو بڑا یہ ہے کہ اس عشق بتاں میں / ہم سے نہ ہوا دیدۂ گریان کا صرفہ

اے مصحفی سنتا ہے، نہ لے نام محبت
اس بات میں ناداں نہیں انسان کا صرفہ

۴۵۳

کیا کھینچے ہے خود کو دُور، اللہ / اللہ رے ترا غرور، اللہ

حسن ایسا کہاں ہے مہر و مہ میں / کچھ اور ہی ہے یہ نور، اللہ

ہم نے تو بچشمِ خویش دیکھا / ہر شے میں ترا ظہور، اللہ

ہم ہیں ترے بندے، میرے صاحب! / گو شیخ کو دیوے حور، اللہ

پہلو سے مرے نکل گیا بت کیا مجھ سے ہوا قصور، اللہ
جس دم میں کروں ہوں نالہ دل سے اٹھتا ہے کتنا ہی شور، اللہ
اے مصحفی حق نہیں سمجھتا
کتنا ہوں میں بے شعور، اللہ

۴۵۴

کیا نظر پڑ گئیں وہ چشم خمار آلودہ؟ شفقِ صبح تو، ہے زورِ بہار آلودہ
قتل اپنے کا تو کچھ ڈر نہیں، یہ ڈر ہے مجھے کہ مرے خوں سے نہ ہو دامنِ یار آلودہ
دور ہے سوختہ جانوں سے خیالِ تزئیں نہ کرے رنگِ حنا دستِ چنار آلودہ
ایک دن رو کے نکالی تھی میں واں کلفتِ دل اب تلک دامنِ صحرا ہے غبار آلودہ
پھول کیا چاہیے تربت پہ شہیدوں کی ترے جوششِ خوں سے ہے خود خاکِ مزار آلودہ
مشتعل بسکہ ہے سینے میں مرے آتشِ عشق آہ جو نکلے ہے دل سے وہ شرار آلودہ
مصحفی گلشنِ ہستی میں تو ہم کو ہرگز
نظر آیا نہ کہیں جز گلِ خار آلودہ

۴۵۵

ہر چند بہار و باغ ہے یہ پر کس کو دل و دماغ ہے یہ؟
ہے بوندِ عرق کی زلف کے بیچ یا گوہرِ شب چراغ ہے یہ
کیا لالے کو نسبت اپنے دل سے یعنی کہ تمام داغ ہے یہ
درگزرے ہم ایسی زندگی سے دنیا میں اگر فراغ ہے یہ
پھر اتنی درنگ کیا ہے، ساقی! مے ہے یہ اور ایاغ ہے یہ
ایسا گیا مصحفی جہاں سے یارو! مرے دل پہ داغ ہے یہ
جو پھر نہ کہا کسو نے اتنا
اُس گم شدہ کا سراغ ہے یہ

۴۵۶

دل کہ جوں شیشۂ مے دیدۂ گریان ہے یہ
ایک اک دم میں دراندازِ صد افغان ہے یہ

زلف میں یار کی، بوندیں ہیں عرق کی، یا رب
یا شبِ تار میں اک جوششِ چراغان ہے یہ؟

سرمہ آنکھوں میں جو ہر وقت دیا جاتا ہے
چشمِ بد دُور مرے قتل کا سامان ہے یہ

کوفت سے غم کی کبھی منہ تو نہ موڑا اس نے
مجھ کو حیرت ہے یہی، دل ہے کہ سندان ہے یہ

تار سے تار کو پیوند کہاں تک کیجے
جی کا جنجال ہے اک، کوئی گریبان ہے یہ

روبروِ یار کے لیجا کے مجھے از رہِ لطف
کوئی اتنا ہی کہے "آپ کا خواہان ہے یہ"

کیا نہیں دیکھی ہے صورت تری آئینے نے؟
اپنے چہرے کی صفائی پہ جو نازان ہے یہ

مصحفی ایک غزل اب کے تُو، تو اور بھی پڑھ
کیونکہ نت تیرے سخن کہنے کا عنوان ہے یہ

۴۵۷

جس کو چاہے اُسے اپنا کرے، انسان ہے یہ
پر ہو تو رام کسی کا کوئی امکان ہے یہ؟

نہ شریعت، نہ حقیقت، نہ طریقت، نہ مجاز
کون کافر مجھے کہتا ہے؟ مسلمان ہے یہ

عالم اک دیکھ کے تکتا تجھے رہ جاتا ہے
کس کو کہیے کہ تری شکل کا حیران ہے یہ؟

زخمِ دل پر مرے مرہم نہ لگاؤ کوئی
اس پہ ٹک چھڑکو نمک، اس کا تو درمان ہے یہ

اس کے پیکاں کو مرے سینے ہی میں رہنے دو
کہ ٹک اک موجبِ تسکینِ دل و جان ہے یہ

چُھپ گیا چاند سا مکھڑا ترا اس میں، سارا
کوئی گھٹا امڈی ہے یا زلفِ پریشان ہے یہ

خونِ عاشق ہے، میاں جان! نہ انکار کرو
تیغ کو دھوئی گئی، آپ کا دامان ہے یہ

وصل کے بعد بھی بیتابیِ دل کم نہ ہوئی
آہ کیا چاہیے؟ کس چیز کا خواہان ہے یہ؟

ایک تو چشمے سے آنکھوں سے اُبلتے ہیں مدام
تس پہ پھر دل بھی بھر آتا ہے طوفان ہے یہ

ہیں نہ خود رفتہ ہم اتنے کہ نہیں کچھ معلوم
ہے ترے وصل کی شب یا شبِ ہجران ہے یہ

مصحفی شہر نہیں شرم ہے اب یاں کس سے
خوب سا کھول کے دل رو کہ بیابان ہے یہ

۴۵۸

گر ہوئی ہم سے مکدّر تک دو چارِ آئنہ
خاک میں مل جائے گی ساری بہارِ آئنہ

اس دلِ پُر داغ کو جا کر کسے دکھلایئے
کیونکہ ہوتا ہے صفا سے اعتبارِ آئنہ

کیا کسی کے صاف دل پر اب گئی اس کی نگاہ؟
سادہ روئی میں نہ تھا جو شرمسارِ آئنہ

مر گئے گر ہم سے روشنگر تو اپنی خاک میں
یا ہوئے خاکسترِ گل یا غبارِ آئنہ

بزم میں اس کی ہوا ہے جب سے اپنا بند و بست
تب سے وصلِ شانہ ہے واں اور نہ بارِ آئنہ

کیا قیامت ہے کہ دی آئینے کو اس کی شکست
دل کو عاشق کے دیا ہے اضطرارِ آئنہ

روبرو اس کے کوئی کیا خاک دم مارے کہ، ہائے!
ہے دمِ روح القدس بھی واں غبارِ آئنہ

جب سے اس کی زلفِ درہم کا پڑا ہے اس میں عکس
ہو گیا ہے تب سے برہم کاروبارِ آئنہ

جلوہ گر ہوتا ہے اس میں جب وہ روئے پُر عرق
عقدِ پروین کو کرے ہے شرمسارِ آئنہ

سکتہ رہ جانے پہ اس کے مجھ کو اک آتا ہے رشک
کھو دیا کس کی نگہ نے اضطرارِ آئنہ

دیکھنا اس کا میسّر ہو چکا، اے مصحفیؔ!
گر رہا یک چند یوں ہی اختیارِ آئنہ

۴۵۹

دیکھتا ہوں اس کو میں ہر دم دو چارِ آئنہ
اپنے پردے میں ہوا ہے وہ شکارِ آئنہ

بہ چلے ہیں شوق میں تیرے، چمن ہو کر کے آب
اک نظر ادھر بھی اے باغ و بہارِ آئنہ

کشتۂ پرہیز میں اس سرو قد کا ہوں کہ وہ
عکس کو اپنے نہ چاہے ہمکنارِ آئنہ

جائے گل تکیوں کے آئینے رہیں تھے راست چپ
جن دنوں تھا حسن اس کا بیقرارِ آئنہ

اس کے چہرے سے روا ہے دیجیے نسبت اسے
جس کے تلووں سے صفا مانگے عذارِ آئنہ

دورِ خط میں اک ذرا عارض کو اس کے دیکھیو
ہو گیا ہے تیرہ کتنا روزگارِ آئنہ

سادہ رو ہیں اور بھی لیکن کوئی کرتا نہیں
اس قدر آرایشِ نقش و نگارِ آئنہ

گر یہ صورت ہے تری تو ایک دن اے رشکِ حور!
تجھ کو رنگ اپنا دکھاوے گی بہارِ آئنہ

داد کو میری وہ اب پہنچے تو پہنچے مصحفی
شوق نے اس کو کیا ہے شرمسارِ آئنہ

۴۶۰

کل سوئے غیر اس نے کبھی بار کی نگاہ
لاکھوں کے بیچ چھپتی نہیں پیار کی نگاہ

پوچھا میں دل سے نزع میں، قاتل ہے مرا کون؟
بولا کہ "اس سپاہیِ خونخوار کی نگاہ"

کیا قہر ہے کہ مکھڑے سے کھولے تو جب نقاب
طاقت نہ لا سکے ترے دیدار کی نگاہ

اتنا ہوا ضعیف کہ باہر نہ جا سکی
چاکِ قفس سے مرغِ گرفتار کی نگاہ

قسمت کہاں ہے ایسی کہ گاہے بہ زعمِ خویش
ہو آشنا نگہ سے مری، یار کی نگاہ

ابرو کو اس کی دیکھ کے حیران رہ گئے
تھی جن مبصّروں کو کہ تلوار کی نگاہ

اب مجھ سے منہ نہ ڈھانپ کہ ہوتی ہے عینِ اشک
وقتِ اخیر مردمِ بیمار کی نگاہ

گو حور یا پری ہو یہ کیا اس کو دیکھیے؟
جس پر پڑی ہو مصحفی دو چار کی نگاہ

۴۶۱

غیروں ہی کی مجلس میں تو اے بت! نہ سدا بیٹھ
اک دم تو مرے پاس کبھی از بہرِ خدا بیٹھ

اب کیوں ہے کھڑا آگے مرے، دور ہو جا، بیٹھ
کچھ ہو نہ سکا تجھ سے تو اے آہِ رسا بیٹھ

خورشید کو غرّہ ہے نپٹ حسن پہ اپنے
اک صبح تو ٹک تو کبھی میاں! غرفے میں آ بیٹھ

آنے دے ٹک آغوش میں اس راحتِ جاں کو
اے دل! مرے پہلو سے شبِ وصل جدا بیٹھ

میں مجلسِ خوباں میں رہا رات کھڑا ہی
جوں شمع، پہ مجھ کو تو کسی نے نہ کہا بیٹھ

در سے ترے تجھ تک یہ گنہگار نہ پہنچا
آیا کبھی جو گاہے تو سرِ کوچہ رہا بیٹھ

پھر اس نے کبھی تا بہ ابد سر نہ اٹھایا
جس کشتے پہ قاتل کا مرے ہاتھ گیا بیٹھ

اس چال سے پامال کیا تو نے اک عالم
کوئی یہ کبھی میاں چال ہے! کہیں اب تو ذرا بیٹھ

دیدار سے مطلب تھا، سو وہ دیکھ لیا ایں　　اب خواہ مرے روبرو خواہ بہ قفا بیٹھ

اے مصحفی گر چاہے ہے روز اس کو تو دیکھے
جا کر کہیں اُس کوچے میں دھونی سی رما بیٹھ

۴۶۲

اٹھنے سے ترے شورِ قیامت بھی گیا بیٹھ　　اے فتنۂ برخاستہ از بہرِ خدا بیٹھ

پردہ نہ رکھ اس روئے دل افروز کے آگے　　یوں چاہے تو سب اپنا بدن مجھ سے چھپا بیٹھ

اب ہم بھی کوئی دم کو میاں یاں سے اٹھیں گے　　کیا اتنی شتابی ہے، کہاں جاہے؟ ذرا بیٹھ

پاتا ہی نہیں دل کا نشاں اپنے میں، ہے ہے!　　کیا جانے وہ آوارہ کدھر جا کے رہا بیٹھ؟

گر اُس کے تماشے کا تجھے شوق ہے، اے دل!　　سینے سے نکل کر تو مری آنکھوں میں آ بیٹھ

شمشیر سے کچھ کم نہیں محرابِ در اس کے　　اس در پہ جو بیٹھے ہے تو گردن کو جھکا بیٹھ

اُس یوسفِ ثانی کی سواری کی خبر ہے　　مانندِ زلیخا تو سرِ راہ میں جا بیٹھ

کیا ہم نہیں پہچانتے یہ ساختہ صورت　　غصّے سے ٹک، اک اور بھی تو منہ کو بنا بیٹھ

کہتے ہیں صبا یار کے کوچے سے چلی ہے　　اے غنچۂ نشگفتہ نہ اتنا بھی خفا بیٹھ

گھر اس کے گیا ملنے، تو جا بزم میں وہ شوخ　　مشغول ہوا غیر سے اور مجھ سے کہا بیٹھ

اے مصحفی کیا دیکھے ہے، ہے مجلسِ خوباں
ایک آدھ سے تو بھی کہیں یاں آنکھ لڑا بیٹھ

۴۶۳

شیریں لب اس صنم کے ہیں جوں نبات تحفہ　　پھر ترس پہ اتنی تلخی ہے یہ بھی بات تحفہ

زلفوں کا تار اس کے میں حرزِ جاں بنایا　　ہاتھ اپنے لگ گیا تھا یہ کل کی رات تحفہ

کیونکر نہ خوں میں ڈوبے کوئی دیکھ اس کے بن کو　　رنگِ حنا عجائب، پھر ترس پہ ہات تحفہ

آخر کو دخترِ رز دل لے گئی ہمارا　　از بسکہ جوں چتر نی تھی اس کی ذات تحفہ

اب سبز خط سے ان پر کاہی سی جم گئی ہے — وے لب، کہ تھے بہ رنگِ آبِ حیات تحفہ
دریا میں کل نہاتے دیکھا جو میں نے اس کو — سب بات میں بر بتوں میں تھی اس کی گات تحفہ

دلّی کے کیا کروں وصف، اے مصحفی میں دیکھا
ہر ایک کوچہ اس کا جوں سومنات تحفہ

۴۶۴

مجھ کو یاروں نے بد و نیک کہا، کیا کیا کچھ — دیکھ تو اک تری خاطر میں سنا کیا کیا کچھ
ساغرِ بادہ و دامانِ گل و دستِ نگار — ہاتھ سے میرے بہ یک بار گیا کیا کیا کچھ
نشّے کے بیچ تھے ہم، یہ ہمیں معلوم نہیں — رات ہم سے تری خدمت میں ہوا کیا کیا کچھ
میکشی، سیرِ چمن، بزمِ طرب کا جانا — عشق میں میں نے ترے ترک کیا کیا کیا کچھ
رلتا پھرتا ہے مرا کاسۂ سر خاک کے بیچ — دیکھیے ہے ابھی طالع میں لکھا کیا کیا کچھ
دیدۂ فرق سے ٹک دیکھ کہ ایک اک پل میں — رنگ بدلے ہے زمانے کی ہوا کیا کیا کچھ
سفرِ عشق سے غارت زدہ آیا ہوں، نہ پوچھ — راہ میں میرا ابھی اسباب لٹا کیا کیا کچھ
ہائے میں کس سے کہوں، ابرِ سیہ میں مجھ کو — کوندِ بجلی کی دکھاتی ہے ادا کیا کیا کچھ
یاں جو کچھ ہم پہ ہوا سو تو سبھوں نے دیکھا — دیکھیے اور بھی ہو روزِ جزا کیا کیا کچھ
ذکرِ دشنام سقط کیا ہے کہ اس بد خو نے — نہ کہا میرے تئیں اِس کے سوا کیا کیا کچھ
کون جانے ہے کہ نظّارہ کشِ شوق کو یاں — رنگ دکھلائے ہے وہ رنگِ حنا کیا کیا کچھ
بلبل اک نالے پہ مت بھول کہ اس گلشن میں — دیکھ تو اور بھی ہیں نغمہ سرا کیا کیا کچھ
ہم نے ہی قدر نہ کی دولتِ دنیا کی دریغ — ورنہ ہم کو بھی فلک نے تھا دیا کیا کیا کچھ
پیل و اسپ و شتر و پالکی و نقّارہ — قور میں اپنی بھی اک عمر چلا کیا کیا کچھ

کان دھر کر تو ذرا مصحفی اک بار تو سن
آئے ہے دل کے دھڑکنے کی صدا کیا کیا کچھ

۴۶۵

عید کا روز ہے، کیوں آج نہاں ہے شیشہ؟
میکشو! لاؤ کبھی کیدھر ہے کہاں ہے شیشہ

مے نہ دو، گریہ سرشار ہی کافی ہے مجھے
کہ مری چشم میں ہر اشکِ رواں ہے شیشہ

شغل گریے کا بہم دیدۂ و دل کرتے ہیں
ہے وہاں جام بھی موجود جہاں ہے شیشہ

پنبۂ مے اسے مت سمجھیو، اے بادہ کشاں!
جوشِ مستی کے سبب کف بہ دہاں ہے شیشہ

مےِ گلگوں سے ہے ٹک اس میں بہار، اے ساقی!
ورنہ بے برگ تر از نخلِ خزاں ہے شیشہ

شیشہ بازی تو مری دیکھ کہ زاہد کے حضور
آستیں میں مری جوں اشک نہاں ہے شیشہ

اپنی آنکھوں میں سدا ہند کے سبزوں کی ہے جا
شیشہ والوں کی اگر زیبِ دکاں ہے شیشہ

جب تلک مے نہ پییں کچھ ہمیں آوے نہ نظر
عینکِ چشم ہماری تو میاں ہے شیشہ

کیا بلا مے تھی جو ساقی نے بھری کیا جانے
دمبدم آج در اندازِ فغاں ہے شیشہ

وائے اس بزم میں گر عمر خوشی سے گزرے
خندۂ جام پہ نت گریہ کناں ہے شیشہ

شیشہ خانے میں تمھارے، مجھے سچ کہہ دیجو
کوئی اس دل سا بھی اے شیشہ گراں ہے شیشہ؟

عکسِ گل بادۂ رنگیں سے گرو لیتا ہے
ساقی اس باغ میں خود آبِ رواں ہے شیشہ

مے کے کم پینے سے کچھ زور بنا ہے کافر
بے تکلّف بتِ زنّار میاں ہے شیشہ

محتسب کیا ہے کہ لاوے وہ اسے خاطر میں
آج اس بزم میں خود پیرِ مغاں ہے شیشہ

نہ اٹھا اس کو اگر جام بھی مے ہو اس میں
تیرے ہاتھوں کی نزاکت پہ گراں ہے شیشہ

عازمِ میکدہ ہو، یار! کہ تیری رہ میں
دہنِ باز سے چشمِ نگراں ہے شیشہ

مصحفی دیکھ کے دل کیوں نہ لبھاوے اس کو
چشمِ بد دور، عجب سج کا جواں ہے شیشہ

۴۶۶

نت رہا سوے چمن مرغِ گرفتار کا منہ
اس تمنّا میں کہ دیکھے گل و گلزار کا منہ

بگڑو مت، آپنے دیکھا نہیں تلوار کا منہ
لال ہو جائے گا ورنہ ابھی دو چار کا منہ

عقدۂ زلف کے کھلنے میں جہاں یوں مہکا — تو نے کھول دیا نافہ تاتار کا منہ

کیوں نہ خوں ٹپکے ہر اک گام پہ اس کی رہ میں — پان سے لال ہے اس قاتلِ میخوار کا منہ

باغ میں چاروں طرف گل کھلے کلیاں چٹکیں — نہ کھلا میرے ہی اک غنچۂ منقار کا منہ

عَلمِ نالہ پہ پرچم تھے ظفر کے گویا — پھر گیا دیکھ جسے ہر مژۂ یار کا منہ

اب کوئی دم میں یہ دنیا سے گزر جاتا ہے — کرو قبلے کی طرف اس دلِ بیمار کا منہ

ابھی آئینے کو پتھر پہ پٹک دیتا ہیں
مصحفی کیا کروں ہے میرے تئیں یار کا منہ

۴۶۷

دل بستگی ہے مجھ کو گل و گلستاں کے ساتھ — گو تلخ بولے، کام ہے کیا باغباں کے ساتھ؟

الفت بھی کیا بلا ہے کہ شب آگ جو لگی — مرغانِ بیضہ دار جلے آشیاں کے ساتھ

برقِ گل اس طرح سے گری شب کہ عندلیب — خاکِ سیاہ جل کے ہوئے آشیاں کے ساتھ

مر کر اٹھیں گے یاں سے، یقین کیجیو، میاں! — اپنا تو سر لگا ہے ترے آستاں کے ساتھ

یاں تک ہے لخت لخت مرا دل کہ دمبدم — ٹکڑے جگر کے جھڑتے ہیں آہ و فغاں کے ساتھ

رکھتا ہے مجھ سے دور مرے رشکِ ماہ کو — خصمی اسی سبب ہے مجھے آسماں کے ساتھ

البتہ کارِ سہل نہیں تیری دوستی — دشمن کوئی ہو کیونکہ بھلا اک جہاں کے ساتھ

وہ کشتہ اپنے حال کی تقریر کیا کرے — مرحب کا مثلِ شمع کٹا ہو زباں کے ساتھ

تو رفتگی تو دیکھ کہ مژگاں کے شوق میں — لپٹا ہی جا ہے دل مرا نوکِ سناں کے ساتھ

اے خارِ خارِ عشق کہیں اب تو درگزر
یہ کیا خلش ہے مصحفی نیم جاں کے ساتھ

۴۶۸

دمبدم لب پہ مرے نالۂ وا درد ہے آہ — سر اٹھانے نہیں دیتا ہے یہ کیا درد ہے آہ

دن گئے وے کہ کبھی دل کی جگہ تھا یہ مکاں
جلے دل اب مرے پہلو میں ، ترا درد ہے آہ

عشق کا درد نہ ہووے کسی دشمن کے نصیب
جان جاتی ہے چلی یہ تو برا درد ہے آہ

ٹکڑے ٹکڑے ہی ہوا جاتا ہے دل اور جگر
آج تو کچھ مرے پہلو میں بلا درد ہے آہ

ہے پڑی آنکھ پھر اک آفتِ جاں پر میری
اس کی دارو میں کروں کیا کہ نیا درد ہے آہ

زائچہ اپنا منجم سے جو میں کھچوایا
رو کے بولا "تری قسمت میں لکھا درد ہے آہ"

جلد تدبیر کرو جا کے الم کی میرے
کم نہ جانو اسے یارو! یہ بڑا درد ہے آہ

مصحفی، ہاتھ نہ پہلو پہ مرے رکھ، بے درد!
اس گھڑی کچھ مرے سینے میں ذرا درد ہے آہ

۴۶۹

زمانے کا چلن یکساں نہیں کچھ
کہیں کچھ ہے، کہیں کچھ ہے، کہیں کچھ

زمیں سرپوشِ خونِ کشتگاں ہے
بغیر از خوں نہیں زیرِ زمیں کچھ

مرا جی تو بھلا بہلے کوئی دم
اسی کا ذکر کر، اے ہم نشیں! کچھ

خدا جانے رہا ہے شب تو کس پاس ؟
پریشاں ہیں ترے موئے جبیں کچھ

یہ سرگوشی نہ تھی بے وجہ اس کی
کہے تھی چشمِ تر سے آستیں کچھ

عبث انکارِ قتلِ عاشقاں ہے
بھرا تو خوں سے ہے دامانِ زیں کچھ

غرض دونوں جہاں سے ہم ہیں آزاد
غمِ دنیا ہے یاں، نے فکرِ دیں کچھ

مرا ہر شعر موتی کی لڑی ہے
کہیں گو دیکھ اس کو عیب بیں کچھ

اگر اے مصحفی ہو قصد تیرا
تو دور اتنا نہیں عرشِ بریں کچھ

۴۷۰

اس کی مژگانِ رخنہ گر کو دیکھ
بعد ازاں آ مرے جگر کو دیکھ

اب تو سینہ سپر کیا میں نے
تیغ کو کھینچ اور سپر کو دیکھ

یار کو مجھ سے کر دیا بیزار
میرے طالع کے ٹک ہنر کو دیکھ

دسترس ہی نہیں جنھیں اس پر
ہاتھ ملتے ہیں اس کمر کو دیکھ

کیا ہی مژگاں کے زخم جھیلے ہیں
اپنے عاشق کے بھی جگر کو دیکھ

بس کہ وہ طفل سادہ تھا پُرکار
چھپ گیا میرے نامہ بر کو دیکھ

گو کہ وہ جھانکتا نہیں لیکن
دل تو خوش ہو ہے چاکِ در کو دیکھ

شعلۂ شمع کا حریف نہ ہو
نفع تو اک طرف ضرر کو دیکھ

اس قدر ہے بلند پروازی
اے پتنگ! اپنے بال و پر کو دیکھ

دیکھ تو کیا پڑھوں ہوں ایک غزل
مصحفی تو ذرا ادھر کو دیکھ

۱۷۴

اپنے عاشق کی چشمِ تر کو دیکھ
صدقے تیرے میں، ٹک ادھر کو دیکھ

تیرِ مژگاں ترا دو سار ہوا
دل کو کیا دیکھے ہے، جگر کو دیکھ

دیکھتا کیا ہے عقدِ پرویں کو
اپنے آویزۂ گہر کو دیکھ

جب کہ تو گھر سے اٹھ گیا میرے
خوب رویا میں اپنے گھر کو دیکھ

میرے آگے نہ دیکھ آئینہ
میری حسرت بھری نظر کو دیکھ

زلف کا بوجھ دے کمر پہ نہ جاں
زلف کو دیکھ اور کمر کو دیکھ

تھی شبِ وصل کھل گئی جو نہیں آنکھ
رنگ فق ہو گیا سحر کو دیکھ

کیسی فرفر زبان چلتی ہے
اس کی گفتارِ بے خطر کو دیکھ

مصحفی پر ستم نہ کر ناداں
خط نہ دے اپنا نامہ بر کو، دیکھ

۴۷۲

چمن آرائے نو بہار تو دیکھ
اک ذرا جوشِ لالہ زار تو دیکھ

آرسی لے کے ہاتھ میں اپنے
اپنی آنکھوں کا تو خمار تو دیکھ

مجھ کو کیا دیکھتا ہے کر کے قتل
اپنی شمشیرِ آبدار تو دیکھ

اتنا موئے کمر پہ غرّہ نہ ہو
ٹک ہمارا بھی جسمِ زار تو دیکھ

مر گئے پر بھی ہیں کھلی آنکھیں
اپنے عاشق کا انتظار تو دیکھ

سینے آیا ہے کس کو، اے ناصح!
ٹک مرا جیبِ تار تار تو دیکھ

مصحفی بول اٹھے عجب بھی نہیں
اس کی تربت پہ تو پکار تو دیکھ



۴۷۳

زمزمے ہم سے سنو بلبلِ خوش الحاں کے
کہ سدا نغمہ سرا تھے چمن دبستاں کے

آنکھیں دکھلائیں کیا تو نے اسے سچ کہیو
آج اوسان سے گم ہیں جو ترے درباں کے

کونسی بچنے کی صورت ہے مری، حیراں ہوں
لوگ کس واسطے درپے ہیں مرے درماں کے

پھر نہ جاوے تری مژگان کا رخ ان سے میاں
تیری آنکھیں یہی کہتی ہیں تری مژگاں کے

دیدۂ شیر سے لگتے ہیں مری آنکھوں میں
ہولناک ایسے ہیں تارے یہ شبِ ہجراں کے

ہم سیہ بخت رہے بوسے سے محروم دریغ
لوٹے مسّی نے مزے تیرے لب و دنداں کے

اشکِ خونیں کو مرے دیکھے ہے جو، کہتا ہے
چنیاں لعل کی یا دانے ہیں یہ مرجاں کے

خارِ صحرائے جنوں دست درازی سے تری
چاک جاتے ہیں گریباں کو مرے داماں کے

ہم اسیروں پہ بڑا قہر ہوا، یا قسمت!
عید کے دن بھی نہ دروازے کھلے زنداں کے

حوصلہ دیکھیے میرا کہ بغل میں میری
ایک دل جس پہ ہیں سو زخم ترے پیکاں کے

قافلہ جاتا ہے یاروں کا چلا بس کہ شتاب — میں بھی نالش میں ہوں پیچھے جرسِ نالاں کے

مسّی و پان کے کشتوں کے ترے مدفن سے — پھول اُگتے ہیں بہم لالہ و نافرماں کے

دیدۂ کم سے نہ دیکھو یہ مرے طفلِ سرشک — گو کہ طوفاں نہیں، ہمنام تو ہیں طوفاں کے

چاندنی رات میں تالے سے پڑے چمکیں ہیں — یہ جو ذرّات ہیں مکھڑے پہ ترے افشاں کے

کسی بے درد نے دامن کو ترے کھینچا ہے — چین کے اُدھڑے نظر آتے ہیں سارے ٹانکے

مصحفی سے تجھے کیا لاگ ہے چل جانے دے
اتنا درپے نہیں ہوتا ہے کوئی انساں کے

۴۷۴

تم گھر میں اپنے ہم سے جب منہ چھپا کے بیٹھے — ہم پھاڑ کر گریباں صحرا میں جا کے بیٹھے

نکلی نیام سے جب شمشیرِ ناز اس کی — کیا کیا نیاز پیشہ سر کو جھکا کے بیٹھے

بدلی سی آگئی اک کر موئے سر پریشاں — جب آفتاب میں تم پیارے نہا کے بیٹھے

آنے کی گر ہمارے تم نے خبر سنی تو — آنے سے پیشتر ہی تیوری چڑھا کے بیٹھے

رستے کے جانے والے بھیچک ہو رہ گئے سب — جس دم تم اپنے در پر مونڈھا بچھا کے بیٹھے

تم پاس گر میں آکر بیٹھا تو اٹھ گئے تم — یعنی اسی بہانے مجھ کو اٹھا کے بیٹھے

پیارے ابھی تو مجھ سے تم روٹھ کر گئے تھے — پھر کیا غضب ہوا ہے جو منہ پھرا کے بیٹھے

ہم اٹھ نہ جاویں کیونکر در سے تمھارے، تم تو — پانو کو اپنے گھر میں مہندی لگا کے بیٹھے

گل چاک کر گریباں رسوا ہوئے چمن میں — جب تم روش پہ اپنا سینہ اٹھا کے بیٹھے

اے مصحفی! شب اس کے میں سامنے کھڑا تھا — ق — اتنے میں جوں ہی دشمن مجلس میں آکے بیٹھے

تب دیکھ دیکھ مجھ کو بولا یہ اس سے کہہ دو
"کیوں چور سا کھڑا ہے گھر اپنے جا کے بیٹھے"

۴۷۵

غم میں تیرے راحت و آرام سے جاتے رہے
گھل گئے ایسے کہ ہم سب کام سے جاتے رہے

دیکھ کر کتنے نصاریٰ تجھ کو مومن ہو گئے
بلکہ مومن بھی کئی اسلام سے جاتے رہے

دربدر روتا پھرا میں جن کی خاطر سوئے شب
چاند سا مکھڑا دکھا کر بام سے جاتے رہے

اس نے شب باشی کا وعدہ غیر سے جس دن کیا
ہم چھپا کر منہ کو اپنے شام سے جاتے رہے

ہائے کیسے کیسے گل اس گلستاں کے ایک بار
خاک میں مل گردشِ ایام سے جاتے رہے

دورِ خط وہ دیکھ کر زلف اپنی یوں بولا کہ "ہائے!
چھوٹ کر کیا کیا اسیر اس دام سے جاتے رہے"

کل جو میں ان سے کہا "دیکھا ہے تم نے مصحفیؔ؟"
کچھ خفا ہو مصحفیؔ کے نام سے جاتے رہے

۴۷۶

چتون سے اک تو دل پر آگے ہی بیکلی ہے
پھر تس پہ یہ غضب ہے چشمک ہے جھانولی ہے

فندق ان انگلیوں کی دیتی ہے یاد مجھ کو
ہر شاخِ گل کے اوپر سر کھینچے جو کلی ہے

مرجھا رہے ہیں غنچے، گل ہو گئے ہیں پت جھڑ
اب کے برس چمن میں یہ کیا ہوا چلی ہے؟

خوں نابِ دل سے میرے کر کے خضاب اوّل
ہاتھوں پر اپنے اس نے پھر کچھ حنا ملی ہے

دلّی میں روئے خوش کی ہر گز کمی نہیں کچھ
یاں جنسِ حسن ارزاں ہر کوچہ و گلی ہے

شب طبعِ مصحفیؔ سے مانندِ سلکِ گوہر
انصاف کیجو یارو! کیا ہی غزل ڈھلی ہے!

۴۷۷

ہم کیا کریں چمن میں گر پھر ہوا چلی ہے
اپنا دلِ فسردہ تصویر کی کلی ہے

ابرو کا ٹک اشارہ، جس دم کیا ہے اس نے
پھر عاشقوں میں باہم تلوار ہی چلی ہے

محبوبِ شرمگیں کا نقشا ہے اس چمن میں
سر کو جھکائے اپنے لالے کی جو کلی ہے

ہر چند چشمِ کافر پُر دل بہت ہے لیکن
تیکھی نگاہ اس کی اس سے کبھی منچلی ہے

آدھی مُم اگل کر اس کی تلوار رہ گئی کل
کیا مصحفی کے سر سے آئی بلا ٹلی ہے!

۴۷۸

جمنا میں کل نہا کر جب اُس نے بال باندھے
ہم نے بھی اپنے دل میں کیا کیا خیال باندھے

ایسا شکوہ اس کی صورت میں ہے کہ تا گہ
آوے جو سامنے سے دستِ مجال باندھے

آنکھوں سے گر کرے وہ زلفوں کو ٹک اشارہ
آویں چلے ہزاروں وحشی غزال باندھے

عیسیٰ و خضر تک بھی پہنچے اجل کا مژدہ
تو تیغ اگر کمر پر بہرِ قتال باندھے

لاوے کی شاخ ہرگز لہکے نہ پھر چمن میں
گر سر پہ سرخ چیرا وہ نونہال باندھے

لت عاشقی کی کوئی جاتی ہے عاشقوں سے!
گو بادشاہ ڈانڈے گو کوتوال باندھے

ہم کس طرح سے دیکھیں جب دے دے پیچ لڑکے!
چیرے کے پیچوں میں تو زلفوں کے بال باندھے

بندہ ہوں میں تو اس کی آنکھوں کی ساحری کا
تارِ نظر سے جس نے صاحب کمال باندھے

ہم ایک بوسے کے بھی ممنوں نہیں کسی کے
چاہے سو کوئی تہمت روزِ وصال باندھے

سوزِ دل اپنا اس کو کیا مصحفی سناویں
آگو ہی وہ پھرے ہے کانوں سے شال باندھے

۴۷۹

برقع ہے یہ یا کوئی بلا ہے
جس میں ترا سب بدن چھپا ہے

کیا جاتا ہے اس میں منہ لپیٹے
ٹک پیچھے تو دیکھ آشنا ہے

ہر نقشِ قدم پہ تیرے اے بت
سایہ ترا سجدے کر رہا ہے

اس طرزِ خرام سے قیامت
گر آج نہیں تو کل بپا ہے

تو دیکھ ڈھٹائیاں تو اس کی
پھر مصحفی تجھ سے لگ چلا ہے

۴۸۰

دل مرا تیرے غم میں مرتا ہے
دیکھ اب کوئی دم میں مرتا ہے

تیرے رونے کے روبرو، اے ابر!
پانی کب چشمِ نم میں مرتا ہے

دیکھ اس کو بہت میں روتا ہوں
جو کوئی عمرِ کم میں مرتا ہے

سفرِ کعبہ کر کہ ہے ناجی
جو کہ راہِ حرم میں مرتا ہے

مصحفی کو بڑا الم ہے ترا
آج کل اس الم میں مرتا ہے

۴۸۱

کدھر جائیے اور کہاں بیٹھیے؟
پر چپتا نہیں دل جہاں بیٹھیے

میں دیکھا تمھیں خوب، پردے میں، اب
ذرا اور ہو کر نہاں بیٹھیے

کھڑے دیکھتے کیا ہو، پھر آئیے
کرم کیجیے مہرباں بیٹھیے

ابھی سے کہاں اٹھ چلے، کوئی دم
غنیمت ہے صحبت میاں بیٹھیے

ترے ہاتھوں سے اے جفائے فلک!
بتا تو ہی چھپ کر کہاں بیٹھیے

بٹھایا مجھے تم نے زنداں میں خوب
میں بیٹھا بس اب دوستاں بیٹھیے

تم آنکھوں میں کیا بیٹھتے ہو مری
بہ پہلوے دل مثلِ جاں بیٹھیے

نہیں بیٹھنے کی تمھارے وہ جا
ادھر آئیے اب یہاں بیٹھیے

نہ پہنچوگے منزل کو تم مصحفی
گیا دور اب کارواں بیٹھیے

۴۸۲

انداز کے صدقے ہیں نہ ہم ناز کے صدقے
گر ہیں بھی تو اس نرمیِ آواز کے صدقے

دامن کو ترے پانو کی جب لگتی ہے ٹھوکر
کہتے ہیں یہ مرتے کہ اس انداز کے صدقے

کر ذبح مجھے تو نے نئے سر سے جِلایا
اے خنجرِ قاتل! ترے اعجاز کے صدقے

اک بار اڑا ہوں میں تو مرغانِ گلستاں
سو بار ہوئے ہیں مری پرواز کے صدقے

مت دیکھ تو اوروں کی طرف میری طرف دیکھ — کافر ہیں تری چشم فسوں ساز کے صدقے
کرتا ہوں میں نالہ تو نکلتی ہے یہ آواز — اس نالے کے، اس سوز کے، اس ساز کے صدقے
اے مصحفی کیا تیرا ابھی اندازِ سخن ہے
باللہ کہ ہیں ہم تو اس انداز کے صدقے

۴۸۳

اس طفل کو دیکھو تو یہ رنگ کسو کا ہے — شعلہ ہے، شرارہ ہے، آتش ہے، بھبوکا ہے
اس آئنہ خانے میں، اے روشنیِ دیدہ — جیدھر کو نظر کیجے جلوہ ترے رو کا ہے
یا اس کا کبھی حلقہ وہ ساعدِ سیمیں تھا — یا حلقۂ آہن اب طوق اپنے گلو کا ہے
مت زخمِ جگر میرا جراح سے سلواؤ — لاؤ کسی بینا کو کام اس میں رفو کا ہے
تزئیں سے نہیں خالی یہ جامۂ عریانی — جو زخمِ محرّف ہے خط اس پہ الو کا ہے
اس دستِ حنائی کو رکھا تھا کہیں اس نے — اب تک مری تربت پر چھاپا سا لہو کا ہے
اب مصحفیِ خستہ اس در سے کدھر جاوے؟
مارا ترے رُو کا ہے، کشتہ ترے مو کا ہے

۴۸۴

سب اٹھّے بزم سے اور اپنے اپنے گھر کو چلے — ولیک یہ نہیں معلوم ہم کدھر کو چلے
کمر ہوئی تری یاں تک تو شہرۂ آفاق — کہ سر کے بال ترے دیکھنے کمر کو چلے
کہے ہے یہ طپشِ دل کہ اب وہ آتا ہے — ہوئی ہے دیر بہت واں سے نامہ بر کو چلے
جگر میں میرے کئی قطرے خوں کے باقی تھے — سو آج وہ بھی تماشائے چشمِ تر کو چلے
یہ کیا شتابی ہے، اے قاصدانِ اشک! کہو — مگر مرے دلِ گم گشتہ کی خبر کو چلے
جنوں کی لہر میں آ، شب میں یاں تلک رویا — کہ سیلِ خوں مری آنکھوں سے بحر و بر کو چلے
یہ راہ وہ ہے کہ اس رہ میں جو مسافر ہو — نہ پہنچے شام کبھی منزل اگر سحر کو چلے

کوئی دن اور بھی دنیا میں تم کو رہنا ہے
ابھی سے تم تو میاں مصحفی سفر کو چلے

۴۸۵

یاں ضعف سے یہ گردن زنہار نہیں اٹھتی — واں مارے نزاکت کے تلوار نہیں اٹھتی
کب دردِ جگر مجھ کو بیتاب نہیں کرتا — کب ہوک کلیجے سے یکبار نہیں اٹھتی
کہنے ہی کو رنگینی ہے ابرِ بہاراں میں — ان آنکھوں سے کوئی بدلی خونبار نہیں اٹھتی
غم خانۂ دل میرا مدت سے ہے افتادہ — یارب کبھی اس گھر کی دیوار نہیں اٹھتی
کب سلکِ گہر پیارے بازی ترے دانتوں سے — رکھتی ہے کہ آخر کو وہ ہار نہیں اٹھتی
شب وہ بتِ بے پروا تھا سب سے الگ بیٹھا — یہ بات سمجھ یاں کچھ تکرار نہیں اٹھتی
میں نے جو کہا اس سے "چل بیٹھیے مجلس میں — بن آپ کے واں لذت زنہار نہیں اٹھتی" ق
تب منہ کو پھرا اپنے اک ناز سے وہ کافر — بولا کہ "مری اب تو بیزار نہیں اٹھتی"

اے مصحفی میں کیونکر اس غم کو بھلا ڈالوں
چھاتی پہ مری سل ہے سو یار نہیں اٹھتی

۴۸۶

ہر چند خالِ کنجِ دہن دل کا چور ہے — پر ہاتھ کا بھی دزدِ حنا اس کا زور ہے
اے عندلیب! آگاہ ہے تو ہم کو بھی کچھ سنا — آخر چمن چمن ترے نالے کا شور ہے
کیا جانے خط کو پڑھ کے کسی کے وہ طفلِ شوخ — نت ہاتھ میں پتنگ ہے واں یا کہ ڈور ہے
آتی ہے شب وہاں سے اک آوازِ دل خراش — تیری گلی میں کیا کسی عاشق کی گور ہے؟
سچ کہیو کس کے خون کا ساماں کیا ہے آج؟ — فندق بندھی ہوئی جو تری پور پور ہے
پیارے بڑا مزہ ہو جو شب آؤں تیرے پاس — سوتے سے چونک اٹھ کے تو بولے کہ "چور ہے"

زخموں میں کس کے چوڑ تو آتا ہے مصحفی
جامہ تمام خوں میں ترا شور بور ہے

۴۸۷

جس وقت کہ کوٹھے پر وہ ماہِ تمام آوے
کیا دُور ہے گر اس کو سورج کا سلام آوے

کہتے ہیں کہ عاشق کو آتی ہے اجل جلدی
کس طرح کا آنا ہے، نے صبح نہ شام آوے

پاس اپنے ہی رہنے دو تم دل کو مرے صاحب
پھر اس سے کیا بہتر گر آپ کے کام آوے

پانو کو لگا مہندی دل خون کیا میرا
کیا جانیے کیا آفت تا وقتِ خرام آوے

ہم آپ ہی خط لکھ کر بھیجیں ہیں اسے ورنہ
مدّت ہوئی اُودھر سے نامہ نہ پیام آوے

کرواتے نہیں صاحب تم غیر سے گر چمپی
ہو حکم تو کرنے کو یہ کام غلام آوے

اے مصحفی میں کیونکر مے پینے سے منہ موڑوں؟
جب یار ہو خود ساقی با شیشہ و جام آوے

۴۸۸

زلفوں نے تری دیکھ تو کیا کام کیا ہے
کر آپ تطاول مجھے بدنام کیا ہے

اے دل قدم آہستہ کہ اس فرشِ زمیں پر
محنت زدہ چند نے آرام کیا ہے

غازے میں یہ خونابِ جگر اپنا ملاکر
ہم نے ہی ترے چہرے کو گلفام کیا ہے

وہ خرقہ کہ آلودۂ صد داغ رہا تھا
زاہد نے اسے جامۂ احرام کیا ہے

صاحب نظراں مژدہ کہ خورشید کے مانند
اس شوخ نے دیدار کو پھر عام کیا ہے

رخسار کو دل دیکھیے یا زلف کو یارب
اس کو کئی معشوقوں نے پیغام کیا ہے

اے مصحفی کل قافلہ یاروں کا ہے راہی
کچھ تو نے بھی چلنے کا سرانجام کیا ہے؟

۴۸۹

اک ایسے ہی وحشی کو مرا رام کیا ہے
بے طاقتیِ دل نے غرض کام کیا ہے

میں ہوں وہ قدح کش کہ جسے پیرِ مغاں نے
سرحلقۂ رندانِ مے آشام کیا ہے

آیا سو پھنسا وہیں، مگر رشتۂ الفت
صیّاد نے صرف قفس و دام کیا ہے

اے وعدہ فراموش! کہیں اب تو خبر لے
مر مر کے میں اس دن کے تئیں شام کیا ہے

ساقی سے گلہ کیا ہے کہ قسّامِ ازل نے
قسمت میں مری دردِ تہِ جام کیا ہے

اس رات ستاروں کی جھکی پڑتی ہیں آنکھیں
اس مہ نے مگر جلوہ سرِ بام کیا ہے

عارض پہ نہیں خال، کسی سوختہ جاں نے
سایے میں تری زلف کے آرام کیا ہے

ہر حلقے میں رکھ رکھ گلِ نسرین و شقایق
اُس زلف کو میں روشِ گلدام کیا ہے

اک حرفِ تمنّا تھا مرے دل میں سو میں نے
وہ بھی گروِ نامہ و پیغام کیا ہے

بدنامی سے میری اسے کچھ شرم نہ آئی
بے فائدہ میں آپ کو بدنام کیا ہے

ہر چند ہوں آوارہ و لے مصحفی میں نے
کس دن گلۂ گردشِ ایّام کیا ہے

۴۹۰

دیوار و در اپنے سے اجل آن نہ نکلی
ہے ہے شبِ فرقت میں مری جان نہ نکلی

عالم کے مرقعے کو کیا سیر میں، لیکن
اس میں بھی کوئی صورتِ انسان نہ نکلی

کب تو نے نظر کی کسی عاشق پہ کہ سو بار
ہو کر وہ تری چشم کے قربان نہ نکلی

ہر چند کہ شانے نے کیا اس کو بہت صاف
لیکن گرہِ زلفِ پریشان نہ نکلی

کیا کھینچے گا تیغا تو مرے قتل کی خاطر
تلوار بھی تجھ سے تو مری جان نہ نکلی

ہر چند سفر ہی میں رہے تو بھی، ہمارے
دل سے ہوسِ سیرِ بیابان نہ نکلی

اے مصحفی آیا وہ ترے سامنے لیکن
اک بات بھی منھ سے ترے حیران، نہ نکلی

۴۹۱

غبغب کی موج جلوہ ذقن میں چرا گئی
گرتے ہی کچھ کنوئیں پہ یہ بجلی سما گئی

اب بھی ہزار غنچے شگفتن کے ہیں قریب گو بادِ صبح پھولوں کی ڈالی ہلا گئی
اک شاخِ گل پہ صبح مری جا پڑی تھی آنکھ قامت کو کھینچ مجھ کو قیامت دکھا گئی
تم دیکھتے ہو اس کا رخِ گل پہ بولنا بلبل بھی طرز نالے کی میرے اُڑا گئی
بازار سے عرب کے جو گزرا وہ خود فروش لیلیٰ دکانِ ناز کو اپنی اٹھا گئی
ہم دیکھ لیں گے دانۂ یاقوتِ سرخ کو لوہو کی بوند گر کوئی مژگاں پہ آ گئی
افغاں! کہ سرسری سی کسی کی نگاہِ لطف بیٹھے بٹھائے اک ہمیں تہمت لگا گئی
کیا وہ خرام موج تھی آبِ حیات کی؟ جو اس روش سے خاک کے مردے جِلا گئی

کنجِ قفس میں ہم تو رہے مصحفیؔ اسیر
فصلِ بہار باغ میں دھومیں مچا گئی

۴۹۲

اس رشکِ مہ کو یاد دلاتی ہے چاندنی ہر رات مجھ کو آ کے ستاتی ہے چاندنی
آبِ رواں میں حسن ملاتی ہے چاندنی ہر موج میں گتھی نظر آتی ہے چاندنی
جا بیٹھتے ہیں ہم لبِ دریا پہ جب کبھو کیا جھمکے اپنے ہم کو دکھاتی ہے چاندنی
سامانِ بزمِ بادہ میں کرتا ہوں جس گھڑی آ چاندنی کا فرش بچھاتی ہے چاندنی
صحرا میں جا کے دیکھ کہ ہر رودِ خشک کو ہم رنگِ جوئے شیر بناتی ہے چاندنی
جب دیکھتی ہے دودھ سا پنڈا ترا میاں خجلت سے آب ہی ہوئی جاتی ہے چاندنی
پیارے! اندھیری راتیں ہیں ایسے میں مل لے تو پھر ورنہ چاند چڑھتے ہی آتی ہے چاندنی
گر وہ بھی قدرداں ہو تو بے جذبۂ طلب روٹھے ہوئے صنم کو ملاتی ہے چاندنی

کیونکر نہ میں جلوں شبِ ہجراں میں مصحفیؔ
بن یار میرے جی کو جلاتی ہے چاندنی

۴۹۳

حضور عشق سے الفت کا کام کیوں لیجے؟ جو کام ہو نہ سکے اس کا نام کیوں لیجے؟

جو تو نہ دے ہمیں گالی تو وقت بوسے کے
ترے لبوں سے میاں انتقام کیوں لیجے

جو غور اس کی نہ منظور ہو مرا صاحب
تو بندگی میں کسی کو غلام کیوں لیجے

مرا سلام وہ لیتا نہیں، مگر سمجھا
کہ یہ غریب ہے اس کا سلام کیوں لیجے

جو شاخِ گل ہے سو حورِ پیالہ بر کف ہے
چمن میں ہاتھ سے ساقی کے جام کیوں لیجے

ترے ہی نام سے تسکین دل ہے یا اللہ
وگرنہ نام ترا صبح و شام کیوں لیجے

جو مرغ ہووے قفس کا کبھی تنگ، اے صیّاد
تو فصلِ گل میں اسے زیرِ دام کیوں لیجے

جو دل گرا نہ پڑے مارے بیقراری کے
بغل میں اس کو بھلا تھام تھام کیوں لیجے

خدا جو دیوے سو اس پر ہی رہیے بس قانع
کسی سے مصحفی کچھ قرض و دام کیوں لیجے

۴۹۴

ہم آپھی گر نہ کوچہ جاناں تلک گئے
نالے ہمارے ضعف سے کب واں تلک گئے؟

کل بندھ گیا جو گریۂ رنگیں کا تار سا
آنکھوں سے ڈورے خون کے داماں تلک گئے

ہم گل کو چاکِ جیب دکھا دیں گے، اے نسیم!
اب کی بہار میں جو گلستاں تلک گئے

ان قیدیوں پہ تہمتِ نظّارہ ظلم ہے
زنداں سے اٹھ نہ جو درِ زنداں تلک گئے

کیوں آنکھ جھپکے گل سے مری اس بہار میں
اپنے بھی چاکِ جیب تو داماں تلک گئے

چھاتی پہ چڑھ کے مجھ کو لگا کرنے جب وہ ذبح
فوّارے خوں کے اس کے گریباں تلک گئے

پامالِ ناز کر کے انھیں مارے شرم کے
پھر وے کبھی نہ گورِ غریباں تلک گئے

پانو تلک نہ ہم کو رسائی ہوئی دریغ!
اوروں کے ہاتھ زلفِ پریشاں تلک گئے

اک رفتگی سی ہم میں کبھی کل کر گئی اثر
ہم اٹھ کے شہر سے جو بیاباں تلک گئے

زنداں کا جن کو حکم کیا تو نے، اے میاں!
کیا کہیے کس خرابی سے زنداں تلک گئے

نرگس تو اک طرف رہی اب کی بہار میں
شہرے ان انکھڑیوں کے غزالاں تلک گئے

کوچے میں اس کے شورِ قیامت ہوا بلند
ہم شب کو جی چلا کے جو درباں تلک گئے

اے مصحفی دوانے ہیں ہم ان کی بوجھ کے
جو درد مول لے کے نہ درماں تلک گئے

۴۹۵

کون عہدِ وفا اس بتِ سفّاک سے باندھے
سرکاٹ کے عاشق کا جو فتراک سے باندھے

دریائے سرشک اپنا جو طغیان پر آوے
دامن کو وہیں دامنِ افلاک سے باندھے

جاؤں جو حرم میں تو مری آہ کا شعلہ
قندیل ستونِ حرمِ پاک سے باندھے

مژگاں نہ کبھی سدِّ رہِ اشکِ رواں ہوں
دریا کو نہ کوئی خس و خاشاک سے باندھے

چسپیدگیِ دل سے عجب کیا ہے جو عاشق
تیرا دمِ خنجر جگرِ چاک سے باندھے

گر دیدۂ بینا ہو تو صنّاعِ جہاں نے
کیا کیا نہ طلسم ایک کفِ خاک سے باندھے

کشمیر بھی جاؤں تو عجب کیا ہے جو یہ چشم
رونے میں گرہ چشمۂ ورناک سے باندھے

اے مصحفی شاعر وہی جو ایسی زمیں میں
مضمون نئے قوتِ ادراک سے باندھے

۴۹۶

گلدستہ جو لختِ دل صد چاک سے باندھے
گر تارِ جگر ہو نہ تو کیا خاک سے باندھے

قاتل سے یہ کہیو کہ بھلا ٹک دمِ بسمل
پٹی تو نہ اس دیدۂ نمناک سے باندھے

میں مے سے کروں توبہ تو پھر ابرِ بہاری
اس سال تو خوشہ نہ رگِ تاک سے باندھے

کل میں شبِ ہجراں میں ترے غصّے کے مارے
الماس کے ٹکڑے جگرِ چاک سے باندھے

ہم سجدہ ادا کر چکے، اب سر کو ہمارے
نیزے پہ رکھے خواہ وہ فتراک سے باندھے

آہوں کے شراروں کو اڑا کل شبِ ہجراں
میں اور بھی تارے کئی افلاک سے باندھے

کیا کیا نہ غزالِ ختنی مصحفی میں نے
اس دشت میں تارِ نظرِ پاک سے باندھے

۴۹۷

جو بندِ قبا یار کے ناپاک سے باندھے
دھجّی تو وہ میرے بھی دلِ چاک سے باندھے

کیا لطف ہو ساقی تو، اگر ایسی ہوا میں
گردن کو صراحی کی رگِ تاک سے باندھے

وہ صیدِ رسن بستہ نہ جیتے تو رہا ہو
جو عشق کی ڈوری ترے فتراک سے باندھے

عاشق! شبِ ہجراں میں ان آہوں کی طنابیں
ہے خوب تو گر خیمۂ افلاک سے باندھے

دامن کے ترے گھیر سے کیا دُور ہے پیارے
گر اپنی ہوا میری کفِ خاک سے باندھے

وہ سروِ رواں آوے اگر جلوہ گری میں
فتنے کے قدم قامتِ چالاک سے باندھے

ہم بیٹھے ہیں کھول اپنی کمر، مصحفی ہاں اب
جو چاہے سو دل اس بتِ بے باک سے باندھے

۴۹۸

جب اس بت نے منہدی بھرے ہاتھ دھوئے
ہم آنکھوں سے یک لخت خونناب روئے

نہ رونا مرا سرسری جانو یارو!
کہ رونے نے میرے بہت گھر ڈبوئے

کریں جستجو کس کی؟ دیکھ اس کو یارب
گئے ہیں کئی دن سے ہم آپ کھوئے

جنھیں تیری ٹھوکر کا تھا دل میں کھٹکا
لحد میں بھی آرام سے وے نہ سوئے

نہ فرہادِ بےچارہ مقصد کو پہنچا
سدا عشق میں اس نے پتّھر ہی ڈھوئے

زبس شوق تھا اس کو رنگِ حنا سے
مری خاک پر بیج منہدی کے بوئے

شماری کے دانوں کے مانند آخر
سناں نے تری متّصل دل پروئے

مگر مصحفی خون رویا ہے چھُپ چھُپ
ہیں سرخ اب تلک اس کی آنکھوں کے کوئے

۴۹۹

جب تک کہ میرے دل میں تری آرزو رہے
یہ آرزو ہے مجھ کو کہ تو خوب رو رہے

جس صید کا گزر ہو کبھی صید گاہ سے
یوں چاہیے کہ اس کی نظر چار سو رہے

جب ٹانکے توڑ ڈالے ہوں خمیازے کھینچ کھینچ
عاشق کے زخمِ دل پہ کہاں سے رفو رہے

اے دیدہ! شرطِ گریہ ہے ابرِ بہار سے
اتنا تو کیجیو کہ مری آبرو رہے

جو طفل خوب رو کہ ہو آواز اس کی خوب
کیا خوب ہے ہمیشہ اگر خوش گلو رہے

کیا کیا نہ اپنے دل کی نکالوں میں حسرتیں
ظالم گر ایک شب بھی مرے پاس تو رہے

عاشق وہ چاہیے کہ اگر خاک میں ملے
تو بھی ہمیشہ درصددِ جستجو رہے

میں نے کہا جو اس سے کہ "آ او نہ جانِ من"
بولا کہ "میرے ساتھ نہ یہ گفتگو رہے"

بوسہ لیا ہو جس نے کبھی تیری زلف کا
مر جاوے وہ تو اس کا دہن مشکبو رہے

ہم نذرِ تیغِ یار کریں اس کو مصحفی
گریے کے ہاتھ سے جو بدن میں لہو رہے

۵۰۰

رحمت تری اے ناقہ کشِ محملِ حاجی
چاہے تو کرے راہبِ بت خانہ کو ناجی

کس دن نہ اٹھا دل سے مرے شورِ پرستش؟
کس رات یہاں کعبے میں ناقوس نہ باجی؟

میں آپ کمر بستہ ہوں اب قتل پہ اپنے
بن یار ہے جینے سے مرا بس کہ خفا جی

اک سینے میں دل رکھتے ہیں ہم سو بھی وہ کیا دل
جو روز رہے لشکرِ سلطاں کا خراجی

تم شب مجھے دیتے ہوئے گالی تو گئے ہو
میں بھی کسی دن تم سے سمجھ لوں گا بھلا جی

شیشہ مے گلگوں کا ہے یا رنگِ شفق سے
رنگ اپنے دکھاتا ہے مجھے چرخِ زجاجی

اے مصحفی میں افصحِ شیریں سخناں ہوں
کب مجھ سے طرف ہو سکے ہے ہر کوئی پاجی

۵۰۱

نہیں کرتی اثر فریاد میری — کوئی کس طرح دیوے داد میری
فغانِ جاں گسل رکھتا ہوں لیکن — نہیں سنتا مرا صیّاد میری
تو اے پیغامبر! جھوٹی ہی کچھ کہہ — کہ خوش ہو خاطرِ ناشاد میری
میں تجھ کو یاد کرتا ہوں، الٰہی — ترے بھی دل میں ہوگی یاد میری
نہیں ہوتا مقیّد میں کسی کا — طبیعت ہے بہت آزاد میری

اُدھر اے مصحفی کیا دیکھتا ہے
غزل سن آ مرے استاد، میری

۵۰۲

اس نزاکت پر پھریں ہم کیوں نہ گل کھائے ہوئے؟ — پھرتے ہو شبنم کا جامہ بر میں بھڑکائے ہوئے
خفتگانِ خاک کی مجھ کو فراغت پر ہے رشک — سوتے ہیں کیا چین سے یہ پانو پھیلائے ہوئے
لگ رہی ہے خانۂ دل کو ہمارے آگ ہائے — اور ہم چاروں طرف پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے
سن کے ہمسایے مرے نالوں کو کہتے ہیں کہ وائے — کس عذابِ جان کے ہم آکے ہمسائے ہوئے
ہم موئے جاتے ہیں مارے انفعالِ عشق کے — دیکھتے ہیں جوں جوں نیچے آپ شرمائے ہوئے
پیچ میں لائے ہیں کیا کیا ٹیڑھے بانکوں کو میاں — پیچ پگڑی کے تری ہیں یہ جو بل کھائے ہوئے
گل گریباں چاک ہیں تم پر، خبر لو ان کی ٹک — ہر طرف پھرتے ہو کیا چولی کو مسکائے ہوئے
ٹک تو ٹھہرو، او میاں صاحب! خدا کے واسطے — اب پھرے جاتے ہو کیدھر سامنے آئے ہوئے؟

کچھ یہ دل ناداں نہیں اس دل کو ہم اے مصحفی
کب تلک باتوں میں رکھیں یوں ہی بہلائے ہوئے

۵۰۳

شانے کی عمر گرچہ جدائی میں کٹ گئی — پر زلف بھی فراق میں شانے کے لٹ گئی

نرگس کی وے ہیں آنکھیں، نہ گل کا وہ رنگ ہے
کچھ ان دنوں چمن کی ہوا ہی پلٹ گئی
چھوڑا نہ ایک لحظہ ترا زلف نے خیال
رخ سے جدا ہوئی تو گلے سے لپٹ گئی
معشوق کو بھلا نہیں عاشق سے اختلاط
بلبل کی ایک چونچ میں غنچے کی ...... گئی
جورِ فلک سے ہم نہ کبھی سر اٹھا سکے
جوں شمع زیرِ تیغ ہی یاں عمر کٹ گئی
بازار میں لیے میں دُرِ اشک کو بہ کف
اتنا پھرا کہ قیمتِ اوّل بھی گھٹ گئی
کہتے ہیں ٹکڑے ٹکڑے ہوا رات مصحفی
سنتے ہیں اس کی اپنی طبیعت تو بٹ گئی

۵۰۴

گردن سے میری تیغِ حیا گر پلٹ گئی
گو پلٹی، اس میں کچھ مری قیمت نہ گھٹ گئی
ساعد کے حسن سے یدِ بیضا ہوا خجل
جب اس کی آستین کی مہری الٹ گئی
تو میرے آگے غیر سے باتیں کرے دریغ
اپنی طبیعت ایسی ہی باتوں سے ہٹ گئی
یاں ہم کمر پہ ہاتھ دھرے رہ گئے، وہاں
پٹکے کے ساتھ زلف کمر سے لپٹ گئی
اس چاکِ آستیں کا ذرا دیکھیو پھبن
اس بانکپن سے غنچے کی کہنی نہ پھٹ گئی
انداز میں نگاہ کے مارا پڑا کوئی
گردن کسی کی تیغِ تغافل سے کٹ گئی
دن رات اس گلی میں یہی ماجرا رہا
کب عاشقوں کی، در سے ترے بھیڑ چھٹ گئی
لگنے چلی تھی آنکھ کہ اتنے میں مصحفی
بولا جو مرغِ صبح تو پھر نیند اچٹ گئی

۵۰۵

قدغن ہے کہ در تک کوئی یاں آنے نہ پاوے
اور بے خبر آوے بھی تو پھر جانے نہ پاوے
واں روزنِ دیوار بھی اب بند ہوئے ہیں
تا سینے کے روزن کوئی دکھلانے نہ پاوے
یوں صاحبِ بستاں کا ہے اب حکم کہ صیاد
اس باغ میں بلبل کا قفس لانے نہ پاوے

تو آگے ہی جا بیٹھ، دلا! بزم میں اس کی
تا آ کے کوئی کچھ اسے سکھلانے نہ پاوے

کیا خاک کرے سحر، ترے نقشِ قدم کی
جو خاک بھی اس کوچے سے لے جانے نہ پاوے

تو شوق سے لچکا قدِ جوں شاخِ گل اپنا
پر موے کمر دیکھیو بل کھانے نہ پاوے

کعبے میں تو ہم کو نہ ملا مصحفی، یارو!
بھیجو کوئی قاصد اسے بت خانے نہ پاوے

۵۰۶

اک پل میں بھلائے سب دکھ درد زمانے کے
صدقے میں گیا تیرے اس آنکھ لڑانے کے

ہم نے نہ لگایا دل، ہر چند کہ عالم میں
اسباب مہیا تھے سب دل کے لگانے کے

از بس کہ سوا اپنے پاتے نہیں یاں کوئی
ہم اس لیے حیراں ہیں اس آئنہ خانے کے

اس آنے و جانے میں کیا راز نکلتا ہے
صدقے ترے آنے کے، قرباں ترے جانے کے

رفتار تری ہم پر لائی تھی قیامت کل
انداز تھے سب اس میں مُردوں کے جلانے کے

گو تو نہ بُرا مانے ہم سے تو نہ ہوگا یہ
دیکھیں گے تری زلفیں ہم ہاتھ میں شانے کے

میاں مصحفی اتنا تو رویا نہ کرو صاحب
خوںناب سے سب تر ہیں تکیے بھی سرہانے کے

۵۰۷

جوں تیغِ خوش غلاف کل اس کی اگل پڑی
گاوِ زمیں، زمین کے نیچے اچھل پڑی

یہ چھپے ہیں اس کے تو دیکھو گے باغ میں
بلبل کے آشیاں پہ برق آج کل پڑی

بادِ صبا نے اس کے یہ کیا کان میں کہا
گُل کی کلی جو کپڑوں سے باہر نکل پڑی

شیشے کا کچھ گناہ نہیں اس میں دخترِ رز
اس کی صفائی دیکھ کے تو ہی پھسل پڑی

دشمن تھا میرا یہ دلِ بیتاب مصحفی
مجھ کو ملا یا خاک میں تب اس کو کل پڑی

۵۰۸

ترا شوقِ دیدار پیدا ہوا ہے — پھر اس دل کو آزار پیدا ہوا ہے

سدا پان کھا کھا کے نکلے ہے باہر — زمانے میں خونخوار پیدا ہوا ہے

یہ مدفن ہے کس کا جو ہر لالہ یاں سے ؟ — جگر خوں، دل افگار پیدا ہوا ہے

اڑائے ہیں لختِ جگر آہ نے جب — ہوا میں بھی گلزار پیدا ہوا ہے

میں کیونکر نہ رکھوں عزیز اپنے دل کو، — کہیں دل سا بھی یار پیدا ہوا ہے ؟

کہے تھی یہ طفلی میں دیکھ اس کو دایہ — یہ لڑکا طرحدار پیدا ہوا ہے

میں آیا ہوں مدت میں کوئی اسے کہدو — ”تمھارا گنہگار پیدا ہوا ہے“

یہ دل مجھ سے لڑتا ہے تیری طرف سے — کہاں کا طرفدار پیدا ہوا ہے

میاں مصحفی بیچتے ہو جو دل کو
تو لاؤ خریدار پیدا ہوا ہے

۵۰۹

ہم نہ فرہاد ہیں جو تیشے سے سر چیریں گے — ہاتھ آجائے گا خنجر تو جگر چیریں گے

بستہ بالی نے نپٹ تنگ کیا ہے یارب — وقتِ پرواز کے ہم بھی کبھی پر چیریں گے

تو نہ ہووے گا کبھی خانہ نشیں گر عشّاق — چوبِ صندل سے ترے تختۂ در چیریں گے

تیغِ ابرو سے تری میں نہ پھروں گا ہرگز — مجھ کو آرے کے تلے رکھ کے اگر چیریں گے

مر گئے ہم تو گریبانِ کفن کی جاگہ — قدسیاں آکے گریبانِ سحر چیریں گے

عقدۂ دل نہ کھلا ناخنِ ابرو سے ترے — اس معمّے کو ہم اب لے کے تبر چیریں گے

ہم وہ ہتھ چھٹ ہیں کہ گر ہووے گا دشمن جوں کوہ — ایک ضربت میں اسے تا بہ کمر چیریں گے

مصحفی کشتۂ شمشاد قداں ہے ہم تو
اس کے تختوں کو کوئی تازہ شجر چیریں گے

۵۱۰

اس کے ہاتھوں سے ہیں سب آئنہ گر فریادی — آرسی کس نے یہ لے جا کے اسے دکھلا دی ؟

آنکھیں چندھیا گئیں دامن کی کناری سے تری — جنبشِ پا نے تری بجلی سی جب چمکا دی

کل جو کھینچا میں اسے تنگ بغل میں تو کہا — "چھوڑ بے تو نے تو چولی مری سب مسکا دی"

ہم اسیروں کی بھی کچھ یاد ہے ان کو یارب — دے جو لوٹیں ہیں بہارِ چمن آزادی

ذبح کرتا ہے وہ بت نظروں میں مجھ کو اور لوگ — یہی کہتے ہیں کہ اللہ رے تری جلّادی

ہو کے چنگا جو میں آیا تو مرے قاتل نے — مجھ پہ اک وار کی پھر نامِ خدا ٹھیرا دی

مصحفی میں تو نہ لکھتا تھا و لے کیا کیجے
مجھ سے خامے نے غزل اور بھی اک لکھوا دی

۵۱۱

چلتے چلتے جو کمر اس نے ذرا لچکا دی — مجھ کو اک آن میں بجلی کی ادا دکھلا دی

کثرتِ گریہ سے دل ڈھے کے ہوا خاک کا ڈھیر — اب کے بارش نے عمارت ہی یہ سب بٹھلا دی

تھی بھری ہاتھ میں ساقی کے گلابی مے کی — ہنستے ہنستے ابھی دکھلا کے مجھے چھلکا دی

سیکڑوں خوں کیے اس نے عجب کیا اس کا — عشق نے گردنِ فرہاد اگر کٹوا دی

تنگ پوشی میں مزہ اس نے جو پایا تو وہیں — چولی انگڑائیاں لے لے کے سبھی مسکا دی

راہ جاتے مجھے کل پھر کے جو دیکھا اس نے — آہ لاکر کے لبوں پر میں وہیں ٹھہرا دی

حکمِ سلطاں ہے کہ اس محکمۂ عدل کے بیچ — دستِ فریاد کو اونچا نہ کرے فریادی

میں نہ بھولا اسے تا زیست، تری آنکھوں نے — وہ جو اک بات اشاروں میں مجھے سمجھا دی

مصحفی جل کے میں گر خاک ہوا اس کو میں
میرے دشمن نے مری خاک بھی لے اڑوا دی

۵۱۲

نظر آتے ہیں پردے تیری آنکھوں کے گلابی سے — کہیں مے پی ہے تو نے یا اٹھا ہے نیم خوابی سے

ہوا میں ہے وہ کیفیت کہ نخل اس باغ کے سارے — گلے میں بانہیں ڈالے ہیں کھڑے باہم شرابی سے

نمودِ رنگِ گل یوں غنچہ، سوسن کی تہ میں ہے
شراب سرخ دلوے جلوہ جوں اودی گلابی سے

بھلا سچ کہیو، پیارے! اِس کا ان سے خوں ٹپکتا ہے
حنا آلودہ یہ جو ہاتھ ہیں تیرے شہابی سے

نزاکت پر نظر کیجو کہ کل اس نے شبِ مہ میں
چھپایا چاند سے مکھڑے کو اپنے آفتابی سے

کج و واکج پڑے تھا بس کہ مستی میں قدم اس کا
گھر اپنے تو میں لایا اس کو شب پر سو خرابی سے

خدا کے واسطے مکھڑا چھپا ورنہ قیامت ہے
پڑا ہے شور اک عالم میں تیری بے نقابی سے

جو میرا دل نہیں جلتا تو پیارے! میرے پہلو پر
اٹھا لیتا ہے تو کیوں ہاتھ کو رکھ کر شتابی سے ؟

سوالِ بوسہ پر سو سو سنائیں گالیاں مجھ کو
کوئی عہدہ بر آ ہو کیونکہ اس حاضر جوابی سے ؟

مکانِ مصحفی اس کو نہ سمجھو آپ کا گھر ہے
تکلّف کچھ نہیں کھل بیٹھیے یاں بے حجابی سے

۵۱۳

دل چیز کیا ہے ؟ چاہیے تو جان لیجیے
پر بات کو بھی میری ذرا مان لیجیے

مرتے تڑپ تڑپ کے، دلا! کیا ضرور ہے
سر پر کسی کی تیغ کا احسان لیجیے

آتا ہے جی میں چادرِ ابرِ بہار کو
ایسی ہوا میں سر پہ ذرا تان لیجیے

میں بھی تو دوستدار تمھارا ہوں، میری جاں!
میرے بھی ہاتھ سے تو کبھو پان لیجیے

کیجیے شریک ہم کو بھی، اے دل! روا نہیں
یوں آپ ہی آپ لذّتِ پیکان لیجیے

اس اپنی تنگ چولی پہ ٹک رحم کیجیے، جاں!
خمیازہ اس طرح سے نہ ہر آن لیجیے

گر قبرِ کشتگاں پہ تم آئے ہو تو، میاں!
اپنے شہیدِ ناز کو پہچان لیجیے

بوسے کا جو تمھارے گنہگار ہو میاں!
لازم ہے اس سے بوسہ ہی تاوان لیجیے

وحشت کے دن پھر آئے ہیں اس نو بہار میں
اے چاکِ جیب! پھر رہِ دامان لیجیے

مشکل نہیں ہے یار کا پھر ملنا مصحفی
مرنے کی اپنے جی میں اگر ٹھان لیجیے

۵۱۴

پان کھا کر گھر سے باہر یوں نہ آیا کیجیے
آرسی میں منہ کو اپنے منہ دکھایا کیجیے

چاند سا منہ کھول دینا تم کو یوں لازم نہیں
دیکھ کر ایدھر ادُھر برقع اٹھایا کیجیے

میں نہ مانوں گا کہ تم بھی چاہتے ہو مجھ کو، ہاے
جھوٹی باتوں سے نہ میرا جی جلایا کیجیے

گر خوشی ہے آپ کی میرے ستانے میں تو خیر
میں بھی اب مانع نہیں، اچھا ستایا کیجیے

دیکھتے ہی مجھ کو تم آنکھیں چرا لیتے ہو کیا
اک ذرا چتون سے چتون تو ملایا کیجیے

نیک و بد سب جانتے ہیں تم کو با شرم و حیا
شوخ چشموں سے نہ یوں آنکھیں لڑایا کیجیے

یار نے گالی بھی دی تو کیا ہوا میاں مصحفی
ہر گھڑی اس بات کو منہ پر نہ لایا کیجیے

۵۱۵

سیاہی کیا بیاں کیجے تری زلفوں کے بالوں کی
کہ دیکھے سے جنھوں کے جان لہراتی ہے کالوں کی

کوئی زنّاریوں سے سر فرو لاتا ہے وہ کافر
جو بگڑی چھین لے دھولیں لگا تسبیح والوں کی

کمر کی فکر میں تیری سدا حیران رہتے ہیں
نہیں کچھ کام کرتی عقل یاں نازک خیالوں کی

ہنسو ہو، جانِ من! تم اس لیے آشفتہ حالوں پر
کہ صورت آپ نے دیکھی نہیں آشفتہ حالوں کی

برنگِ آئنہ میں سامنے حیراں کھڑا دیکھوں
تو اے حجام! یوں لیوے صفائی اس کے گالوں کی

جگر کس کا ہے ایسا جو اب ان کے سامنے آوے
دکن تک دھوم پہنچی ہے تری مژگاں کے بھالوں کی

اگر خورشید سے روشن ہوں تو بھی خوار پھرتے ہیں
غرض اس دور میں یہ قدر ہے صاحب کمالوں کی

دیارِ عشق میں ہر اک کے منہ پر خاک اڑتی تھی
عجب صورت میں دیکھی اس نگر کے رہنے والوں کی

ہمارے دام میں اے مصحفی وے کس طرح آویں
کمندِ زلف میں گردن ہے جن رعنا غزالوں کی

۵۱۶

رسائی عرش تک کیونکر نہ ہووے اس کے نالوں کی
لگی ہو چوٹ جس کے دل پہ ان چھریوں سے بالوں کی

اگر دیکھیں ترے قد کی لٹک اے شاخِ گل اک دن
لٹک مل جائے ساری خاک میں نازک خیالوں کی

گلابی پھینٹے ڈالے اپنی نظروں سے تو سب گزرے
بہار اب دیکھنی ہے، زعفرانی چیرے والوں کی

کبھی ابرِ سیہ میں جیسے بجلی کوند جاتی ہے
چمک زلفوں میں یوں دیکھی ترے کانوں کے بالوں کی

تری نازک کمر کو مو بھی کہتے دے تو ڈرتے ہیں
طبیعت بس کہ نازک ہوتی ہے نازک خیالوں کی

مرکّب کی جگہ نوکِ قلم سے خوں ٹپکتا ہے
تماشاگاہ ہے تحریر ہم رنگیں مقالوں کی

چبھیں ہیں دل میں یہ بوٹے سے قد اے مصحفیؔ میرے
بلائے جان ہو ہے دوستی ان خورد سالوں کی

۵۱۷

جب زہ اس کی کمان پر آئی
آفت ہر اک نشان پر آئی

کانپ اٹھا میں تو، رات بلبل کے
برق جب آشیان پر آئی

ہیں تری تیغ میں جو دندانے
کیا کسی استخوان پر آئی؟

گردشِ چشم سے تری، اے شوخ
اک مصیبت جہان پر آئی

مصحفیؔ دردِ دل کہے ہی بنے
بات اب تو زبان پر آئی

۵۱۸

جی کی دشمن اس کی زلفوں کی پریشانی ہوئی
ہم نے کیوں چھیڑا انھیں، کیا ہم سے نادانی ہوئی

غم بڑا یہ ہے کہ آخر باچنیں سعیِ بلیغ
ہم کو کسبِ عشق سے حاصل پشیمانی ہوئی

بس کہ سر رگڑا کیا میں آستانِ یار پر
ماہِ نو کی طرح صرفِ سجدہ پیشانی ہوئی

یاد کر کس ناوکِ مژگاں کو خوں رویا کہ رات
اشک کی ہر بوند جیسے لعل پیکانی ہوئی

کیونکہ ہم ضامن ہوں یارب اچپلاہٹ کے تری
برق کے شعلے کی خس سے کب نگہبانی ہوئی؟

گریۂ شب سے یہ سوز اپنا گھٹا کچھ، بلکہ اور
آتشِ دل پر ہماری روغن افشانی ہوئی

اے زلیخا! اس قدر بے صبری، اب کیا فائدہ؟
ساتھ ہی یوسف کے تو بھی کیوں نہ زندانی ہوئی
بس کہ شانِ حسن میں یوسف سے تو کچھ کم نہ تھا
صفحے پر تصویر تیری یوسفِ ثانی ہوئی
شب تری مجلس وہاں دورِ قدح چلتا رہا
تا سحر یاں آنسوؤں کی سبحہ گردانی ہوئی
اک نگاہِ آشنا پر تھا مدار اپنا، دریغ
اس سمیں کو دیکھ وہ بھی ہم سے بیگانی ہوئی
شب دلِ بیمار میرا دیر سے تھا محتضر
بارے ٹک آتے ہی تیرے اس کی آسانی ہوئی
ایک دم پاسِ سخن سے میرے تئیں فرصت نہیں
شعر بانی بھی کہے تو، اک جہانبانی ہوئی

بس کہ کیشِ کفر میں کامل تھے ہم، اے مصحفی
دیر ترسا کے مفوّض ہم کو رہبانی ہوئی

۵۱۹

آئے ہے دل میں خس و خار سے اک ہیبت سی
آشیاں سے مجھے کچھ ہو گئی ہے وحشت سی
سرِ بالیں ہی علیلا نہ پڑا رہتا ہوں
ان دِلوں جاتی رہی ہے مری کچھ طاقت سی
شکر قاتل کا کروں کیا کہ بہ زیرِ دمِ تیغ
جوں جوں تڑپوں ہوں مجھے آوے ہے اک لذّت سی
برقِ شمشیرِ تغافل کا کہوں کیا انداز
ناگہاں سر پہ مرے آ پڑی اک آفت سی
جب سے دیکھی ہے میں اوضاعِ فلک رہتی ہے
مثلِ آئینہ شب و روز مجھے حیرت سی
تیری تصویر ہی دن رات پڑا دیکھوں ہوں
بس کہ کچھ اس سے مجھے ہو گئی ہے الفت سی
اے شبِ مرگ میں بس تیرا بھی شہرہ دیکھا
تیرہ و تار کہاں ہے تو شبِ فرقت سی

مصحفی کی جو تو بالیں پہ دمِ نزع نہ تھا
اس کی آنکھوں سے عیاں ہوتی تھی اک حیرت سی

۵۲۰

مجھ سے نسیمِ قدس بھی پیچھے کہیں رہی
مقدورِ ہر کسی کا نہیں میری ہمرہی
افسوس یہ رہا کہ بہ ہنگامِ ذبح بھی
قاتل سے میں نے آرزوئے دل نہ کچھ کہی

نظروں میں ہر کسی کی سبک تو میں ہو چکا — کیا جانے کیا دکھاوے گی اب آگے بے تہی

کندن سے رنگ کو ترے کب پہنچے ہے میاں — جلوے میں گرچہ ہے زرِ خورشید دہ دہی

جو ہیرے کی کنی کہ نہاں میرے دل میں تھی — آخر لباسِ اشک میں وہ آب ہو بہی

رکھتے وہ کس طرح سے خبر میرے عشق کی؟ — جب اپنے حسن سے بھی نہ ہو اس کو آگہی

اب کے جو تو نے نامہ لکھا مجھ کو مصحفی
میں اس کو رکھ دوں شعلۂ آتش پہ تو سہی

۵۲۱

کیا لچک نتھ کی ہے اور کیا ہی ڈھلک موتی کی ہے — کوند بجلی کی کہوں یا یہ پھڑک موتی کی ہے

اس جھمکنے سے ترے دیکھا تو کچھ کم بھی نہیں — یہ جو عارض پر ترے، کافر! جھمک موتی کی ہے

ایک تو رخسار کی تیرے جھلک کرتی ہے قہر — آبداری میں بلا تس پر جھمک موتی کی ہے

اشک آنکھوں سے مری جتنے بھی گرتے ہیں صنم — بس کہ ان آنکھوں میں سرخی آتلک موتی کی ہے

ٹک ڈھلاوٹ کو ذرا تم اس غزل کی دیکھیو
پاک بیناں وصف اس میں منسلک موتی کی ہے

۵۲۲

یہ تیروں کا کس کے نشانا ہوا ہے — جو دل میرا زنبور خانا ہوا ہے

کہیں راہ بھولے ہو شاید، تمھارا — ہماری طرف کو جو آنا ہوا ہے

میں پھڑکا ہوں یاں تک کہ کنجِ قفس میں — پروں کا مرے آشیانا ہوا ہے

کرے فارکشی کیوں نہ سرو چمن سے — وہ نامِ خدا اب تو سیانا ہوا ہے

شکنجے میں زلفوں کے کھینچ اس کو لڑکے — یہ مُلّا بہت چار شانا ہوا ہے

خبر لے شتاب ان کی صیّاد آ کر — قفس بلبلوں کا پرانا ہوا ہے

نہیں خوں کا اک قطرہ اب اس میں باقی — یہ دل تیری مژگاں کا چھانا ہوا ہے

جو بھیجا ہے اس پاس میں اپنے دل کو — تو پیچھے سے قاصد روانا ہوا ہے
کل آسودگاں کی جو تربت سے گزرا — ق — جنھیں خواب کرتے زمانا ہوا ہے
پڑا ایک مرقد پہ جوں پانو میرا — یہ آئی صدا، "کیا دوانا ہوا ہے؟"
ترے در پہ بیٹھا ہے گھٹنوں کو پکڑے
یہی مصحفی کو بہانا ہوا ہے

۵۲۳

مستی ہے کہ اک ابر دھواں دھار اٹھا ہے — اس مستی سے کتنوں کو ابھی مار اٹھا ہے
پیارے! جو موا خواہشِ دیدار میں تیری — وہ حشر کو بھی طالبِ دیدار اٹھا ہے
دیکھے ہے جو کوئی اس کو تو کہتا ہے کہ "اللہ — یہ طفل بھی کیا شوخ و جفاکار اٹھا ہے"
خوں کتنوں کا سرخی نے اُن آنکھوں کی کیا ہے — جب صبح کو سوتے سے وہ خونخوار اٹھا ہے
اس بزم میں آیا ہے مراد کر تو ناگاہ — وہ ہاتھ میں لے کر وہیں تلوار اٹھا ہے
چاند ابر میں جاتا ہے چھپا شرم کے مارے — شاید کہ ترا پردۂ رخسار اٹھا ہے
چکھا ہے مرے خوں کو گر انگشت سے اس نے — مانند عسل اس میں بھی اک تار اٹھا ہے
کیا خون میں رنگے تھے کہیں رات کو تو نے — بازی ترے ہاتھوں سے جو گلہار اٹھا ہے
کل ہاتھ پہ کرتا تھا ترے گل بھی گرانی — تو آج بہ ایں وضع مرے یار اٹھا ہے
میں ساعدِ نازک کے ترے صدقے ہوں تجھ سے — کیونکر قفسِ مرغِ گرفتار اٹھا ہے
اے مصحفی دل جس نے اٹھایا ہے جہاں سے
اٹھتے ہوئے وہ یاں سے سبکسار اٹھا ہے

۵۲۴

تری چپ تو ہے خصم جانی ہماری — تو بولے تو ہو زندگانی ہماری
جگہ سے نہ ہلنے دیا اس نے آخر — ہمیں لے رہی ناتوانی ہماری

جز الفت کے تیری نہ کچھ خاک پایا — فلک نے بہت خاک چھانی ہماری
یہ ممکن نہیں ہے کہ عشقِ بتاں میں — ہمیں چین دے بدگمانی ہماری
جوانی میں ہم سے ملو تا ہمیشہ — دعا دیوے تم کو جوانی ہماری
تری تیغِ ابرو کا ہم پر کرم تھا — کٹی خوب تب زندگانی ہماری
پڑے ہیں کئی استخواں اس گلی میں — یہی رہ گئی ہے نشانی ہماری
بہت سر کو خالی کیا ہم نے لیکن — نہ نبڑی نہ نبڑی کہانی ہماری

شب آخر ہوئی مصحفیؔ جا پڑی اب
بروزِ دگر قصہ خوانی ہماری

۵۲۵

عمر گزری ہے ہمیں نالہ و زاری کرتے — کاش! ہم اس بتِ کافر سے نہ یاری کرتے
برسرِ شکوہ بھی لائی نہ ہمیں اس کی نگاہ — تا اسی پردے میں ہم شکر گزاری کرتے
بار مجلس میں تری، آنکھوں کو نئیں ورنہ میاں! — مہر و مہ آکے ابھی آئینہ داری کرتے
تو کہاں کا تھا، بھلا یہ تو ہمیں بتلا دے؟ — ہم بھی ٹک گریہ اگر، ابرِ بہاری! کرتے
عشق میں چل نہ سکا پیش ہمارا ورنہ — ہم قبول اپنے اوپر ذلت و خواری کرتے؟
اپنے کہنے میں نہیں نشترِ مژگاں اس کے — ورنہ یوں خوں نہ مری چشم سے جاری کرتے
کوئی پرکالہ جگر کا نہ گرا آنکھوں سے — کہ ہم اس کو ترے دامن کی کناری کرتے

مصحفیؔ یار ہیں اس وقت کے سب مردہ پسند
بدنہ تھا ہم بھی تخلص جو مزاری کرتے

۵۲۶

نہ کہیں صبح ہی ہوتی ہے نہ خواب آتا ہے — رات کیا آتی ہے اک مجھ پہ عذاب آتا ہے
قاصد اس کوچے سے پھرنے کا نہیں، اے ہمدم! — جھوٹ کہتا ہے کہ نامے کا جواب آتا ہے

کیا کروں اس لبِ شیریں سے سوالِ بوسہ — مجھ کو اس بات کے کہنے سے حجاب آتا ہے

جان قالب میں نہیں رہتی مری جب کہ رقیب — ساتھ گھوڑے کے ترے، پکڑے رکاب آتا ہے

میں ترے واسطے سر پٹکوں ہوں دیواروں سے — چین کس طرح تجھے خانہ خراب آتا ہے؟

ہستیِ پوچ سے اپنی مجھے دیتا ہے خبر — سامنے میرے جو دریا سے حباب آتا ہے

ہو گیا ہے مرا گریے سے زبس دل خالی — اشک آنکھوں میں مری جیسے حباب آتا ہے

فرصتِ وقت غنیمت ہے کہ اے دل! وہ شوخ — آج اس راہ سے پھر مستِ شراب آتا ہے

مصحفی کے بھی کچھ احوال سے ہے تجھ کو خبر؟
روز اس کوچے میں با چشمِ پُر آب آتا ہے

۵۲۷

نہ گل کے، نہ یاسمن کے صدقے — چمپا سے ترے بدن کے صدقے

ہر حلقۂ زلف میں مرا دل — ہوتا ہے شکن شکن کے صدقے

بیٹھا ہو جس انجمن میں وہ شوخ — میں ساری اس انجمن کے صدقے

حسرت یہ رہی کہ فصلِ گل میں — ہم کیوں نہ گئے چمن کے صدقے

پروانے کے شوق کو تو دیکھو — ہوتا ہے پڑا لگن کے صدقے

نکلا ہے تو آج زور سج سے — ہوں کیوں نہ میں اس پھبن کے صدقے

تیشے سے قلم کا کام کرنا! — تردستیِ کوہکن کے صدقے

تلوار تو زور ہی سجی ہے! — صدقے ترے بانکپن کے صدقے

وہ تشنہ ہوں میں کہ دن میں سو بار — ہوتا ہوں چہِ ذقن کے صدقے

نکلے نام اس کا جس دہن سے — ہو جائیے اس دہن کے صدقے

جامہ تو پھبے ہی ہے پر اس کی — زیبائیِ پیرہن کے صدقے

اے مصحفی کیا غزل لکھی ہے!
تیری روشِ سخن کے صدقے

۵۲۸

یہ آنکھیں ہیں تو سر کٹا کر رہیں گی
کسو سے ہمیں یاں لڑا کر رہیں گی

اگر یہ نگاہیں ہیں کم بخت اپنی
تو کچھ ہم کو تہمت لگا کر رہیں گی

یہ سفّاکیاں ہیں تو جوں مرغِ بسمل
ہمیں خاک و خوں میں مِلا کر رہیں گی

کیا ہم نے معلوم نظروں سے تیری
کہ نظریں تری ہم کو کھا کر رہیں گی

یہ آہیں ہیں تو ایک دن آسماں کو
جلا کر، کھپا کر، اُڑا کر رہیں گی

اگر گردشیں آسماں کی یہی ہیں
تو ہم کو بھی گردش میں لا کر رہیں گی

یہ آنکھیں ہیں تو ایک دن مصحفی کو
نگاہوں کے اندر فنا کر رہیں گی

۵۲۹

یادِ فندق میں شب اس دل نے جو بیتابی کی
میں نے رو رو کے لہو ہر مژہ عنّابی کی

اک ذرا کھول کے پڑھ اس کو کہ ظاہر ہے تمام
میرے نامے سے حقیقت مری بیتابی کی

جلوۂ حسن کے آگے ترے، اے ماہِ منیر!
روشنی پھیکی ہوئی جاتی ہے مہتابی کی

ساز دل وہ ہے کہ ہر تار کے اوپر جس کے
سالہا ناخنِ اندوہ نے مضرابی کی

اب تلک آنکھوں سے مری اشک بہے جاتے ہیں
اک جھلک دیکھی تھی اس پیرہنِ آبی کی

پیشِ محراب میں کرتا تو ہوں سجدہ لیکن
دل سے جاتی نہیں یاد ابروے محرابی کی

مصحفی ہوں میں گداے درِ شاہنشہِ عشق
آرزو مجھ کو نہیں خانی و نوّابی کی

۵۳۰

نصیبوں سے کوئی گر مل گیا ہے
تو پہلے اس پہ اپنا دل گیا ہے

کرے گا یاد کیا قاتل کو اپنے
تڑپنا یاں سے جو بسمل گیا ہے

لگے ہیں زخم کس کی تیغ کے یہ — کہ جیسے پھوٹ سینہ کھل گیا ہے
خدا کے واسطے اس کو نہ لاؤ — ابھی تو یاں سے وہ قاتل گیا ہے
کوئی مجنوں سے ٹک جھوٹے ہی کہہ دے — کہ لیلیٰ کا ابھی محمل گیا ہے
اگر ٹک کی بھی ہے کچھ ہم نے جنبش — پہاڑ اپنی جگہ سے ہل گیا ہے

کوئی اے مصحفیؔ اس سے یہ کہہ دے
"دعا دیتا تجھے سائل گیا ہے"

۵۳۱

ہم تو بیٹھے ہی رہے یار کے در کے آگے — کھائیں سو ٹھوکریں پر واں سے نہ سرکے آگے
وے نہیں ہم کہ سپر سینے پہ اپنے رکھیں — بلکہ رکھ دیتے ہیں سینے کو سپر کے آگے
صرف اے دیدہ! کوئی لختِ جگر روتا ہے — چاہیے اشک بھی ہوں لختِ جگر کے آگے
یک بیک جا جو پڑی اس گلِ نازک پہ نگاہ — پھر گئے سیکڑوں رنگ اپنی نظر کے آگے
مجھ کو یہ ڈر ہے چرالیں نہ کہیں حسن ترا — منہ کو مت کھولیو تو شمس و قمر کے آگے
گریہ رکتا ہی نہیں ہم سے تو رومال ہی ایک — باندھ رکھیں گے اب اس دیدۂ تر کے آگے

مصحفیؔ اس کو ہی کہتے ہیں، سنا ہی ہوگا
وہ جو کل غش میں پڑا تھا ترے در کے آگے

۵۳۲

بیٹھا مونڈھے کو بچھا جب کہ وہ در کے آگے — خون کتنوں کے ہوئے یار کے گھر کے آگے
بال اک وضع پہ رہتے ہی نہیں کافر کے — کبھی پیچھے تو کبھی ہیں وے کمر کے آگے
دجلۂ خشک کے مانند نظر آتا ہے — پاٹ دریا کا مرے دامنِ تر کے آگے
صدمۂ آہ کہیں اس کو نہ پہنچا ہووے — اور تو کچھ نہیں اک دل ہے جگر کے آگے
داغ سینے کے مرے دیکھے جو اس نے تو کہا — "پھول اتنے تو نہ تھے تیری سپر کے آگے"

منتظر فیض کا رہ موے جبیں سے اس کے — صبح نورانی ہے اس تیرہ سحر کے آگے

بے ہنر گو کہ کرے آ کے ہنر کا دعویٰ — پیش جاتی ہے کوئی اہلِ ہنر کے آگے

دیکھ کر ہم کو ہوا چیں بہ جبیں مجلس میں — اپنی جا سے جو ٹک اک ہم کہیں سر کے آگے

مصحفی کیا ہوا گر سب میں آنکھوں کو سیا

میرا مطلوب تو ہے میری نظر کے آگے

۵۳۳

سر اس کے پہ کیا کوئی دستار باندھے — جو پھرتا ہے گلیوں میں زنّار باندھے

کمر باندھتے تو کیا قتلِ عالم — قیامت ہے جس دم وہ تلوار باندھے

کوئی سحر سے باندھتا تھا دکاں کو — وہ کافر جو آوے تو بازار باندھے

ہو دشوار بانکوں کو پھر سر اٹھانا — جو بلدار پھینٹا وہ خونخوار باندھے

فرشتہ بھی گر اس کے آ جائے آگے — پکڑ ہاتھ مثلِ گنہگار باندھے

نہ ساون کرے پھر برسنے کا دعویٰ — جو یہ دیدۂ تر کبھی تار باندھے

ہے صرفہ اسی میں کہ یاں مردِ عاقل — دل اپنا کسی سے نہ زنہار باندھے

کھلیں بازوے زاغ اس فصلِ گل میں — فلک بالِ مرغِ گرفتار باندھے

تپِ دل سے ہے دردِ سر مصحفی کو

سر اپنا نہ کیونکر یہ بیمار باندھے

۵۳۴

یار آ کے رہے قریب مرے — ہیں گے ایسے کہاں نصیب مرے

گر نالے کی طرز سیکھنا چاہے — سن نالے تو عندلیب مرے

اس کو میں نہیں کوئی مزاحم — ہیں طالعِ بدر قیب مرے

کیوں ہو گیا ناتواں تو اے دل! — کیا تجھ پہ پڑی غریب مرے

بیمار ہوں مصحفیؔ میں کس کا؟
حیراں ہیں جو سب طبیب مرے

۵۳۵

نہ ملیے اس سے، رہیے فاصلے سے ضرر ہوا پنے تئیں جس کے ملے سے
نہ قاتل اس جگہ آیا نہ تلوار یہ سب مارے پڑے ٹک بھوں ہلے سے
سب اپنے مہرباں منزل کو پہنچے رہے اک ہم ہی پیچھے قافلے سے
مریدِ زلفِ خوباں ہوں کہ میرا بندھا ہے اعتقاد اس سلسلے سے
نہ کر اے مصحفیؔ روزی کا شکوہ
خدا بیزار ہوتا ہے گلے سے

۵۳۶

ہمیں گالی دینا یہ خو تھی کسو کی کبھو ہم سے بھی گفتگو تھی کسو کی
میں آئینے سے آنکھ ہرگز نہ پھیری کہ صورت مرے روبرو تھی کسو کی
گلے لگ کے سویا تھا کس رشکِ گل سے سحر جیب میں میری بو تھی کسو کی
ہوئے خاک میں بھی نہ آسودہ ہرگز وہاں بھی ہمیں جستجو تھی کسو کی
مری نعش پر لوگ کہتے ہیں آکر اسی شخص کو آرزو تھی کسو کی
اب اے مصحفیؔ ہم کہاں اور تعشق
مگر چاہ ہم کو کبھو تھی کسو کی

۵۳۷

باتوں نے اس کی ہم کو خاموش کر دیا ہے آگو زباں تھی لیکن اب گوش کر دیا ہے
عشقِ بتاں میں ازبس کھائے ہیں داغ پیہم ساعد کو اپنے ہم نے گل پوش کر دیا ہے

کس سیمبر کا، یارو! عاشق ہوں میں؟ کہ مجھ کو
کاہش نے جوں مہِ نو آغوش کر دیا ہے

جب یادِ قد میں تیرے کھینچا ہے ہم نے نالہ
سروِ چمن سے اس کو ہم دوش کر دیا ہے

طاقت یہ اپنی کب ہے جو اس کی تاب لاویں
جس جلوے نے کہ موسیٰ بیہوش کر دیا ہے

اے مصحفی اٹھا ہے جب دل سے میرے شعلہ
مار آستیں میں اس کو خاموش کر دیا ہے

۵۳۸

دامن کی اک جھپک نے مدہوش کر دیا ہے
جیسے چراغ ہم کو خاموش کر دیا ہے

ہمراہِ آہ ازبس لختِ جگر اڑے ہیں
میں عرصۂ ہوا کو گل پوش کر دیا ہے

کون آیا تھا نہانے، لطفِ بدن نے کس کے
لہروں سے سارا دریا آغوش کر دیا ہے

اب اور آہِ پیچاں کیا چاہیے ہے، میں اس کو
زنجیرِ عرش سے تو ہم دوش کر دیا ہے

ساقی کو میں دیا تھا خونِ فسردہ، اُس نے
میرے تئیں اسی کو پھر جوش کر دیا ہے

صوفی و شیخ و زاہد سب کیفی بن رہے ہیں
اس کی نگہ نے عالم مے نوش کر دیا ہے

نوبت سخن کی ہم تک جب آئی ہے، ادب نے
خاموش کہہ کے سب کو خاموش کر دیا ہے

مجلس میں مصحفی کی آیا ہے جو بہ دعویٰ
میں اک قدح میں اس کو بیہوش کر دیا ہے

۵۳۹

شب آ کے روبرو جو نہیں بجلی چمک گئی
نظروں میں میری، یار کی صورت جھمک گئی

آئی ہوائے ابر تو کیا دل خنک ہوا
وہ بھی ہماری آگ پہ دامن جھپک گئی

اے گل! تجھے دکھاویں گے اس کے بدن کا رنگ
اس نازنیں کی گر کبھو چولی مسک گئی

طوفاں کیا وہ اشک نے غم میں ترے کہ رات
جو موجِ تند اس سے اٹھی تا فلک گئی

بجلی شب آسماں سے جو بیتاب ہو گری
آ کر کے آستاں پہ ترے سر پٹک گئی

اُس گلبدن نے بندِ قبا جوں ہی وا کیے
مجلس تمام پھولوں کی بُو سے مہک گئی

یاروں کو ہم دکھاویں گے بے طاقتی کے رنگ
اپنی بھی آنکھ گر کسی گل سے اٹک گئی

ہر بات پر مری تو نہ کر نکتہ چینیاں
ان باتوں سے تری مری چھاتی تو پک گئی

ہم نے بہت علاج کیا لیک مصحفی
ہرگز نہ دردِ دل کی ہمارے چمک گئی

۵۴۰

باغ سرسبز ہے اور آب و ہوا اچھی ہے
کیجیے سیر کوئی دم تو ۔ فضا اچھی ہے

تیری تصویر کو کب پہنچے ہے تصویر پری
تو ہی پھر خوب ہے ، وہ گو کہ ذرا اچھی ہے

شوخ چشمی نہ کر ، اے شوخ! کہ معشوقوں کی
جس قدر چشم میں ہو شرم و حیا اچھی ہے

گل سے کہتی ہے کہ ' یہ تیری ہے بُو کا طالب '
تو' بھڑا دینے کو اے بادِ صبا اچھی ہے

دیکھتا ہے جو کوئی اس کو ، یہی کہتا ہے
"صورت اس طفلِ پری زاد کی کیا اچھی ہے!"

اس فریبندہ سے کیونکر کوئی سودا نہ کرے
طرح ترکیب ہے خوش ، وضع و ادا اچھی ہے

"حق تعالیٰ مرے پیارے سے ملادے مجھ کو"
یہ دُعا وِردِ کر ، اے دل! یہ دُعا اچھی ہے

جس قدر خونِ جگر کھاوے اسے کھانے دے
تیرے بیمار کے حق میں یہ غذا اچھی ہے

ٹکیو پیشانی کو خاک اس کی گلی کی ، اے دل!
دردِ سر جائے گا اس سے یہ دوا اچھی ہے

مصحفی مجھ سے تعجب ہے کہ یہ بات کہوں
ق کہ "مری طرزِ سخن کہنے کی کیا اچھی ہے"

پر میں اتنا تو سمجھتا ہوں کہ سب کے نزدیک
نالۂ چغد سے بلبل کی نوا اچھی ہے

۵۴۱

اب تلک یار کی ہے چینِ جبیں ویسی ہی
نت مرے ساتھ چلی جاتی ہے کیں ویسی ہی

اب تلک بھوں کا چڑھانا ہے وہی ہر ساعت
اب تلک پڑتی ہے پیشانی میں چیں ویسی ہی

جب سے دیکھا ہے مرا لختِ جگر کہتا ہے
مجھ کو بازار سے لادے تو نگیں ویسی ہی

جس جگہ میرے تئیں قتل کیا تھا اس نے
اب تلک خون سے تر ہے وہ زمیں ویسی ہی

دل جو غائب ہے مری نظروں سے، شاید اس کو
پھر کے صورت نظر آئی ہے کہیں ویسی ہی

کب مرے نالۂ جاں کاہ کو وہ سنتا ہے؟
بات بدگو کی ہے واں ذہن نشیں ویسی ہی

مصحفی اب تلک آیا نہیں ہرگز میں بہ حال
غمِ ایّام سے ہے طبعِ حزیں ویسی ہی

۵۴۲

پاسباں جاگے ہے، دربند ہے، مینہ برسے ہے
میں ادھر تڑپوں ہوں اور یار اُدھر ترسے ہے

اس طرح توڑ کے پر پھینک نہ دے بلبل کے
بیر ہی اس کو تو اک بالِ کبوتر سے ہے

چرخِ بے مہر سے میں کیا گلہ بنیاد کروں
کہ ستم میرے اوپر بازیِ اختر سے ہے

وہ ستم کشتۂ بتاں کا ہوں کہ کل روزِ جزا
دعویِٔ خون مجھے داورِ محشر سے ہے

ہم گرفتار ہوئے اور ہی ہنگامے میں
یاں خبر کا ہیکو ہنگامۂ محشر سے ہے

دوستو! اس کو جو پکڑا ہے تو تم چھوڑیو مت
لاؤ لاگ اپنے تئیں بھی اسی کافر سے ہے

کیونکہ بیت الصنمِ عشق کا جلوہ دیکھیں
راہ و رسم اپنے تئیں بت سے نہ بت گر سے ہے

کیوں نہ اس زلف سے مل ہوں میں مشوّش اے دل
کیا کروں یار! کہ کام ایسے ہی ابتر سے ہے

مصحفی دوکھیں ہیں گر خویش و برادر دوکھیں
کام کیا اپنے تئیں خویش و برادر سے ہے

۵۴۳

منظور گر تمھیں بھی تماشائے خلق ہے
وابستہ اک نظر کی تمنّائے خلق ہے

افسوس ہے نہ جانے تو اس کی ہی قدر کو
جو شخص تیرے واسطے رسوائے خلق ہے

کس طرح کوئی چین سے بیٹھے کہ رات دن
دورِ سپہر در پئے ایذائے خلق ہے

میرا گناہ کیا ہے جو مجھ بے گناہ پر عالم سمٹ کر آیا ہے دعوائے خلق ہے

معنی طلب کی صورتِ خالق پہ ہے نظر صورت پرست محوِ تماشائے خلق ہے

پھرتا ہے نت وہ برہنہ رُو جیسے آفتاب گو خلق دیکھے کب اُسے پروائے خلق ہے

شاید کہ آج مصحفیؔ مارا گیا کہیں

اس کی گلی میں کہتے ہیں غوغائے خلق ہے

۵۴۴

کوچہ ترا یہ جائے تماشائے خلق ہے بہرِ نظارہ بیہودہ غوغائے خلق ہے

میری طرح سراسرِ عالم پھرا نہیں ہر چند آفتاب بھی رسوائے خلق ہے

کیا تجھ کو فائدہ ہے بھلا اس میں اے فلک! تو اس قدر جو درپئے ایذائے خلق ہے

کم ہم سے کم بغل پہ وہ ہوتا ہے ملتفت نت جس کے ساتھ گرمیِ سودائے خلق ہے

میں ہوں وہ خاکِ راہ کہ کوچے میں یار کے میرا سر شکستہ ہے اور پائے خلق ہے

کچھ شعر و شاعری سے نہیں مجھ کو فائدہ الاّحصولِ کاوشِ بیجائے خلق ہے

چل تو بھی مصحفیؔ کہ وہ نکلا ہے بزم سے

ہے بارِ عام نوبتِ مجرائے خلق ہے

۵۴۵

تو بے وفا ہوا تو مروّت کہاں رہی عاشق کو تجھ سے جائے شکایت کہاں رہی

دنبالِ دل پری سی کوئی گامزن تو تھی پر یہ خبر نہیں کہ وہ صورت کہاں رہی

وقتیکہ شاعروں نے رگِ گل کیا خیال موئے کمر کی اس کے نزاکت کہاں رہی

میں نے چمن سے آن کے جب نالہ سر کیا مرغانِ نغمہ سنج کی حرمت کہاں رہی

مرتے ہی بتوں کے، ہاتھ سے جاتا رہا یہ دل اپنے کہے میں اپنی طبیعت کہاں رہی

مدت ہوئی کہ بیٹھے ہیں ہم انتظار میں کیا جانے آتے آتے قیامت کہاں رہی

وقتیکہ میں نے نامے پہ رو رو دیا لہو
سمجھے کوئی جسے وہ عبارت کہاں رہی

جب تو نے دی رقیب کو پہلو میں اپنے جا
عاشق کی تیری بزم میں عزت کہاں رہی

آنے سے خط کے اور ہی کچھ رنگ ہو گیا
چہرے کی اس کے اب وشباہت کہاں رہی

جو کچھ میں دیکھتا ہوں، فلک! تجھ سے حادثہ
فرہاد و قیس پر یہ مصیبت کہاں رہی

جب تیرِ غمزہ دل سے مرے پار ہو گیا
جانِ ستم رسیدہ سلامت کہاں رہی

کیا بات پوچھتے ہو کہ وقتِ اخیر ہے
اب ہم کو بات کرنے کی قدرت کہاں رہی

حیراں ہیں سارے قاضی و مفتی و بادشاہ
آگے ترے کسی کی حکومت کہاں رہی

تھی یاروں تک ہی رونقِ بزم اپنی مصحفیؔ
جب یار ہی اٹھ گئے تو وہ صورت کہاں رہی

۵۴۶

کیا کہوں بات میں اس گریے کی طغیانی کی
کشتیِ نوح اسی گریے نے طوفانی کی

خوشہ خوشہ مری آنکھوں سے گرے دامن میں
دانۂ اشک نے اس سال فراوانی کی

نو بہار آنے سے سودائے جنوں تازہ ہوا
سبزے کی موج نے پھر سلسلہ جنبانی کی

صاف تو یہ ہے کہ انصاف نہیں یاروں میں
ورنہ جوں آئنہ صورت ہوں میں حیرانی کی

دردِ سر کیونکہ نہ ہو مجھ کو کہ ان آنکھوں سے
شکل دیکھی ہے میں صندل گی پیشانی کی

ایسی کیا جلدی ہے ہاں خط بھی پڑھوں گا، قاصد!
بہلے کچھ بات تو کہہ لے تو مرے جانی کی

مجتہدِ ملّتِ ترسا کا ہوں میں کیوں کہ مدام
خدمتِ بت میں رہا، دیر کی رہبانی کی

وہ غارت زدہ کی طرح نمایاں ہے تمام
میرے ظاہر سے حقیقت مری ویرانی کی

تیرے دامن کی کناری کو نہ پہنچا زنہار
شعلۂ برق نے ہر چند کہ جولانی کی

جو سدا محو رہے اپنی ہی آرائش کا
اس کو کیا فکر مری بے سروسامانی کی

فصلِ گل میں بھی رہے کنجِ قفس کے ہی اسیر
ہم گرفتاروں نے کس روز پَر افشانی کی

گھر میں رہنا تمھیں ہو جائے گا مشکل پیارے!
کر گئی آہ اثر گر کسی زندانی کی

ابرِ مژگاں نے مرے بس کہ دُرافشانی کی
بن گیا سطحِ فلک تختۂ دامن سارا

مصحفی دوں میں جہاں ریختہ گوئی کو رواج
قدر شیرازی کی ہو واں نہ صفاہانی کی

۵۴۷

خوش حال ان کا، وے جو گلستاں میں مر گئے
حسرت نصیب ہم تھے کہ زنداں میں مر گئے

پہنچا نہ کام، چشم کی گردش تلک دریغ
ہم اس کی ایک ہی جنبشِ مژگاں میں مر گئے

آخر نہ ہو سکا سفرِ دورِ راہِ عشق
لاکھوں گھسٹ گھسٹ کے بیاباں میں مر گئے

روتا پکارتا نہیں اب کوئی، کیا میاں!
عاشق ترے سبھی شبِ ہجراں میں مر گئے؟

نسبت درست کیجیے اب کس سے مصحفی
جو منتخب تھے گبر و مسلماں میں مر گئے

۵۴۸

کہیں مغز اس کے میں صبحدم تری بوئے زلف سما گئی
ترے کوچے سے جو چمن تلک گل اڑاتی خاکِ صبا گئی

مرض اک جہاں سے نرالا تھا، مری جان! تیرے مریض کا
نہ ہوا کسی سے علاج جب، اجل اس کی کرنے دوا گئی

غرض اس نباہ کے صدقے میں غرض ایسی چاہ کے صدقے میں
نہ ترا ہی جور و جفا گیا، نہ مری ہی مہر و وفا گئی

یہ بہار ہووے گی سب خزاں، نہ سمن، نہ لالہ، نہ ارغواں
دمِ گرم کی مرے، دوستاں! کبھو باغ میں جو ہوا گئی

جو فدائے صورتِ خوب ہیں انھیں تب کہوں گا کہ دیکھیے
کوئی شکل اپنی ہی چشم میں کبھو سیر کرتی جو آگئی

میں ہوا بہ خاکِ سیہ فرو، ترے کوچے میں بصد آرزو
رہا شرمگیں ہی ہمیشہ تو، تری اب تلک نہ حیا گئی

سر اٹھاؤں کیونکہ میں مصحفی، نہیں مجھ میں تاب و تواں ذری
کہ خرام اس بتِ شوخ کی مجھے خاک ہی میں ملا گئی

۵۴۹

تصویرِ یار جب تئیں پیشِ نظر رہی
سو صورتوں سے آنکھ مری بے خبر رہی

آخر ہمیں جلا کے کفِ خاک کر دیا — دن رات کی یہ سوختگی کام کر رہی
اک روز دیکھ لوگے کہ ہم درمیاں نہیں — گر درمیاں، میاں! یہی شام وسحر رہی
وقتیکہ خط کو پانی میں ان نے ڈبو دیا — کہہ تو ہی میری آبرو کیا نامہ بر رہی
واں جھوٹ موٹ بھی نہ ہوئی ان کی چشم نم — یاں اشک سے ہر اک مژہ سلکِ گہر رہی
جوں زخمِ تازہ تجھ کو میں نت پوچھتا رہا — سوکھی کب آستیں مری، اے چشمِ تر! رہی؟
وقتیکہ اس کمر پہ طمنچے سجے کیے — انصاف کیجیے آپ ہی کہاں سے کمر رہی؟
شاید کہ لختِ دل کوئی پیچھے رہا جو آج — مژگاں پہ بوند اشک کی آکر ٹھہر رہی
جانا نہ ہم نے بالشِ پر کہتے ہیں کسے — اک خشت سی تو اپنے بھی ہاں زیرِ سر رہی
میرا اور اس کا جھگڑا نہ فیصل ہوا کبھی — آپس کے بیچ بحث ہی دو دو پہر رہی
قسمت کہ تجھ سے اب کے بھی اپنی ملازمت — موقوفِ مہربانیِ وقتِ دگر رہی
دیکھوگے کر دکھا دیں گے ہم ریختے کو فرس — یک چند اگر توجہِ خاطر ادھر رہی
بے اعتدالیوں سے تری اس گلی کے بیچ — خانہ خراب دھوم ہی شام وسحر رہی

آہ و فغاں ہی کرتا رہا تو تو مصحفیؔ
تیری زباں نہ ایک دم، اے نوحہ گر! رہی

۵۵۰

نہ غمِ عاشقِ رسوا ہے تجھے — نہ خیالِ دلِ شیدا ہے تجھے
میں ترے غم میں موا جاتا ہوں — کوئی یہ بات بھی کہتا ہے تجھے؟
آشنا سا نظر آتا ہے تو، یار! — میں نے شاید کہیں دیکھا ہے تجھے
جب میں کہتا ہوں کہ "ٹک زلف تو کھول" — تب یہ کہتا ہے کہ "سودا ہے تجھے"
جانِ من! تو ہے بہت بے پروا — سچ ہے، پروا مری کیا ہے تجھے

جاں بہ حسرت جو تو یوں دیتا ہے
مصحفیؔ کس کی تمنا ہے تجھے؟

۵۵۱

جب کمر میں کٹار رکھا ہے — اس نے کتنوں کو مار رکھا ہے

اک فریبِ نگہ پہ یاں ہم نے — سالہا انتظار رکھا ہے

پھانس بھی گر چبھی ہے دل میں مرے — اس نے برسوں فگار رکھا ہے

تم نے اپنا جہاں دھرا ہے قدم — ہم نے واں سر اتار رکھا ہے

اپنا عاشق نہیں تو اے کافر! — آئنہ کیوں دوچار رکھا ہے

ہم نے دستِ جنوں کے ہاتھوں سے — جیب کو تار تار رکھا ہے

میری تربت پہ آن کر گا ہے — کب قدم تو نے یار رکھا ہے؟

بعد از مرگ بھی مجھے یعنی — کشتۂ انتظار رکھا ہے

مصحفی ہم نے اپنے پہلو میں
دل کو دے دے فشار رکھا ہے

۵۵۲

دنیا میں دل سے دل کو محبت نہیں رہی — ہرگز کہیں دو شخص میں الفت نہیں رہی

پھڑکے ہیں زیرِ دام ہم اتنے کہ اب ہمیں — خنجر تلے تڑپنے کی حسرت نہیں رہی

کیا فائدہ ہے اس سے گر آنکھیں ملا ئیے؟ — آنکھوں میں اس کی کچھ بھی مروت نہیں رہی

اے دیدہ! زار زار نہ رو اس قدر کہ اب — مجھ کو بھی گریہ کرنے کی طاقت نہیں رہی

مجلس میں اس کی جا کے کوئی کیا ذلیل ہو — ہرگز موافق اپنے وہ صحبت نہیں رہی

کیا جا کے اب کسی کے تئیں منہ دکھائیے — وقتیکہ وہ زمانے کی صورت نہیں رہی

آتے ہی اس کے سامنے ٹوٹی ہے آرسی — ہرگز نظر سے اس کی سلامت نہیں رہی

اے غم! فشارِ دل میں نہ اتنی بھی سعی کر — جانے بھی دے کچھ اس میں تو حالت نہیں رہی

آتنا رمیدہ خو ہے کہ اس کو ہمارے ساتھ — الفت تو اک طرف کہ خصومت نہیں رہی

اے مصحفی! نہ کیجے سوے کودکاں نگاہ
اس کام میں بزرگوں کی حرمت نہیں رہی

۵۵۳

اس سوا اور ہزاروں ہیں تو کیا کام مجھے
اس کے بن دیکھے نہیں ایک دم آرام مجھے

شہر میں شہرۂ ہر برزن و کو تو میں ہوا
عاشقی اور کہاں تک کرے بدنام مجھے

یہ ہی حسرت رہی دل میں کہ کبھی ساقی نے
اپنے ہونٹوں سے لگا کر نہ دیا جام مجھے

شہر سے دور پڑا خاطرِ یاراں سے گیا
کون اب بھیجتا ہے نامہ و پیغام مجھے

مجھ کو سو چشم تھیں یاروں سے، دلے روزِ فراق
نہ کیا یاد کسو نے بہ دو بادام مجھے

سادگی دیکھ کہ بوسے کی طمع رکھتا ہوں
جن لبوں سے کہ میسر نہیں دشنام مجھے

میں نے کیا ان کا لیا ہے جو گلی کوچوں میں
مدعی ڈھونڈتے ہیں صبح مجھے شام مجھے

اک ترے کوچے سے باہر نہ نکالے تا زیست
یوں جو چاہے سو کرے گردشِ ایام مجھے

مصحفی ہاتھ اٹھا اب بھی تعشق سے کہ یار
نظر آتا ہے بد اس کام کا انجام مجھے

۵۵۴

ڈرتی نہیں وہ چشمِ سیہ، زاریِ دل سے
دن رات اسے کام ہے خونخواریِ دل سے

یارب تری زلفوں سے مجھے جس نے چھڑایا
تا حشر نہ چھوٹے وہ گرفتاریِ دل سے

اک داغ نیا ہر بنِ مو پر ہے نمایاں
یہ پھول چنے ہم نے شرر باریِ دل سے

شعلے کا ترے حسن کے فانوس بنا ہے
تو اس پہ بھی غافل ہے ہواداریِ دل سے

ہم بھی دلِ خوں گشتہ لیے ساتھ ہیں اس کے
گو ہاتھ اٹھاوے نہ دل آزاریِ دل سے

غم کیونکہ چھپاؤں میں کہ چہرے کا مرے رنگ
عالم کو نشاں دیتا ہے بیماریِ دل سے

اے مصحفی جز آہ و غم و نالہ و زاری
حاصل نہ کیا ہم نے تو کچھ یاریِ دل سے

۵۵۵

پہنچا ہے زیاں تجھ کو وفاداریِ دل سے
کیا میں نہیں واقف تری بیزاریِ دل سے ؛

بن دل کے تری زلف بھی اب رہ نہیں سکتی
ہے وہ بھی گرفتار، گرفتاریِ دل سے

ایسا نہ ہو لیجا کے کہیں مجھ کو مٹا دے
میں آگو ہی ڈرتا ہوں زیاں کاریِ دل سے

شب دیدۂ بیدار کے محتاج نہیں دے
جو فیض سحر لیتے ہیں بیداریِ دل سے

اس شہر کا کیا نام ہے جس شہر میں کوئی
جاں بر نہیں ہوتا تپ بیماریِ دل سے

کیا نامِ محبت لیں کہ اب بزمِ بتاں میں
ہم آپ خجل ہوتے ہیں ناداریِ دل سے

کرتا تھا یہ دل پیش ازیں مشقِ طپیدن
ہے اب تو شکایت ہمیں بیکاریِ دل سے

اے آئنے! ہم تجھ کو دکھا دیویں گے نقشا
گر پردہ اٹھا آئنہ رخساریِ دل سے

ہر چند کہ ہیں خانہ برانداز دے آنکھیں
پر شکر کہ غافل نہیں معماریِ دل سے

کاہیکو ہیں بادہ کہ پہنچے ہے ہمیشہ
بے ہوشی کا مژدہ ہمیں ہشیاریِ دل سے

ان روزوں پھر اس شوخ کی آنکھوں نے کیا ہے
بازارِ نظر گرم خریداریِ دل سے

وقتیکہ مددخواہ تھے ہم، کوئی نہ آیا
کیا فائدہ ہے اب مددیاریِ دل سے

اے مصحفی سمجھیں ہیں ہم اس شوخ کو غافل
یک لحظہ جو غافل نہیں معماریِ دل سے

۵۵۶

جب دیکھوں وہ صورت مرے آگے ہی کھڑی ہے
اک قاتلِ خونخوار سے ہی آنکھ لڑی ہے

اس گریے کے صدقے ہوں کہ خونناب جگر کی
جو بوند ہے پلکوں پہ وہ چُنّی سی جڑی ہے

وہ ابرِ سیہ جس سے کہ خوں برسے ہے ہر دم
اس کے لبِ پاں خوردہ پہ مسّی کی دھڑی ہے

اس زلف میں کیا کام کریں اپنی نگاہیں
جس زلف کا ہر حلقہ زرہ کی سی کڑی ہے

حیراں ہوں کہ اس غم کے تئیں کیونکہ میں ٹالوں
اے وائے کہ سل سی مری چھاتی پہ اڑی ہے

وہ کشتۂ بے کس ہوں کہ خونخواہی کی خاطر
دروازے پہ قاتل کے، مری لاش پڑی ہے

خوں کس کا کیا تو نے جو آج، اے مرے قاتل!
تلوار ترے ہاتھ میں پھولوں کی چھڑی ہے

سنگینوں سے پلکوں کی شرارے ہی اُڑے ہیں
جب جنگ کو پلٹن پہ مری باڑھ چڑھی ہے

اے مصحفیِ خستہ کی ٹک دیکھ لے صورت
یہ غم زدہ مہماں کوئی پل، کوئی گھڑی ہے

٥٥٧

کس گل کی نزاکت پہ مری آنکھ پڑی ہے؟ — جو ہر رگِ گل خار سی نظروں میں گڑی ہے

جس موج سے لپٹا ہوں کر ابرو کا تصوّر — اس موج نے سر پر مرے تلوار جڑی ہے

گھر کیونکہ غریبوں کے بھلا بیٹھ نہ جاویں — بے فاصلہ رونا مرا ساون کی جھڑی ہے

جو دیکھے ہے وہ ابروئے خم دار، کہے ہے — کیا صانعِ قدرت نے یہ تلوار گھڑی ہے

تو آئینہ خانے میں بہت دیر رہی ہے — کیا جانیے واں کس سے تری آنکھ لڑی ہے

گلدستہ ہے خود اک تو ترا دستِ نگاریں — پھر تس پہ غضب اور یہ پھولوں کی چھڑی ہے

کچھ ذکر تھا میرا، جو میں آنکلا تو ہنس کر — کہنے لگا وہ یوں "تری کیا عمر بڑی ہے"!

خوں جلوہ گری کرتا ہے ازبس کہ شب و روز — اس جاگہ پہ جس جاگہ مری لاش گڑی ہے

جو نخل کہ اگتا ہے وہاں خاک سے، لڑکے! — گویا وہ ترے واسطے پھولوں کی چھڑی ہے

اے مصحفی گزرے گی ذرا سیر تو کر لے
جاتا ہے کہاں دن ابھی دو چار گھڑی ہے

٥٥٨

دل کیونکہ کریں بیٹھ کے ہم یار سے خالی — ہوتی ہی نہیں بزم تو اغیار سے خالی

کس طرح قدِ یار سے وہ آ کے طرف ہو — ہے سرو کے اک پانو سو رفتار سے خالی

ہم سوئے عدم یوں گئے دُنیا سے تہی دست — جس طرح کہ مفلس پھرے بازار سے خالی

باندھی ہے کمر اس نے زبس خلق کُشی پر — جب دیکھو میاں اس کا ہے تلوار سے خالی

پیمانہ مری چشم کا افسوس کہ یا رب — مرتے بھی رہا شربتِ دیدار سے خالی

اے مصحفی! شاید کہیں دل بند ہے تیرا
یہ آہ کا بھرنا نہیں اسرار سے خالی

۵۵۹

سر تری تیغ کو دیے ہی بنے — سجدہ محراب میں کیے ہی بنے

دستِ ناصح سے تنگ آیا ہوں — چاکِ جیب اب مجھے سیے ہی بنے

آ پھنسے اب تو بزمِ رنداں میں — شیخ جی تم کو مے پیے ہی بنے

ہم کب اس زندگی کے تھے طالب — پر جِلایا تو اب جیے ہی بنے

مصحفیؔ تم کو وہ کرے گا خراب
اس سے دل باز پس لیے ہی بنے

۵۶۰

لبِ زخمِ جگر سیے ہی بنے — خونِ دل ہم کو اب پیے ہی بنے

کھینچ کر تیغ یار آیا ہے — اس گھڑی سر جھکا دیے ہی بنے

دل گرا ہی پڑے ہے سینے سے — اب یہ دل ہاتھ میں لیے ہی بنے

یار کا صبح پر ہے وعدۂ وصل — ایک شب اور بھی جیے ہی بنے

اب تو اس دردِ دل کی تاب نہیں
مصحفیؔ کچھ دوا کیے ہی بنے

۵۶۱

تو ہر شب نت بغل میں اور کے ہے — یہ دل شائستہ کب اس جور کے ہے؛

ترے دامن کا ڈورا ایسا ہے، پیارے! — کہ صدقے ڈور بھی جس ڈور کے ہے

اسے کیا دورِ دامن کی خبر ہے — جو قضیے میں تسلسل دور کے ہے

بتاں! کیا پوچھتے ہو ہم سے؟ کیجے — جو کچھ شایاں تمہارے طور کے ہے

مرے نامے کو یوں مت سرسری دیکھ — کہ ہر اک سطر قابل غور کے ہے

نہ خود قائم ہے یہ پتلا بدن کا — کل اس کی ہاتھ میں اک اور کے ہے

جبیں اس بت کی اب اے مصحفی دیکھ
کہ وہ سودے میں چندن گھور کے ہے

۵۶۲

اب تو اس بزم میں پیارے تمہیں آئے ہی بنے
اپنے مشتاقوں کو دیدار دکھائے ہی بنے

زخم دو چار تری تیغ کے کھائے ہی بنے
جائے تسلیم ہے یہ سر کو جھکائے ہی بنے

سخت حیران کیا چہچہۂ بلبل نے
باغ میں ہم کو بھی اب دھوم مچائے ہی بنے

گر تصور ہے یہی تو مرا جینا معلوم
اس تصور کے تئیں جی سے بھلائے ہی بنے

یارے رشتہ و سوزن کو بکف آیا ہے
اب تو اس چاکِ گریباں کو سلائے ہی بنے

وہ جو ہجراں میں ترے مجھ پہ گزرتی ہے میاں!
تو سنے یا نہ سنے مجھ کو سنائے ہی بنے

سخت افسردہ کیا ہے ہمیں بے عشقی نے
مصحفی پھر کہیں اب آنکھ لڑائے ہی بنے

۵۶۳

بند بھی آنکھوں کو ذری کیجیے
چند پریشاں نظری کیجیے

اک نظر ایدھر بھی ذری کیجیے
گر نہیں اچھی، نظری کیجیے

دل کے عوض دیجیے بوسہ ہی ایک
خوب نہیں مفت بری کیجیے

آئنے میں دیکھیے مکھڑا میاں!
آئنے کو رشکِ پری کیجیے

گر نہیں قاصد تو بدل کر کے بھیس
آپ ہی پیغامبری کیجیے

قدر ہنر کی جو ہوئی، دیکھ لی
اب ہنرِ بے ہنری کیجیے

کون ہے ان باتوں کا مانع میاں
خوب سی بیدادگری کیجیے

دل کی کچھ اس کو ہے نہ آئی خبر
ماتمِ یارِ سفری کیجیے

مصحفی ہے وقتِ وداعِ جہاں
مثلِ چراغِ سحری کیجیے

۵۶۴

روحِ بلبل چمن میں بھٹکے ہے — اب تلک یاں گلاب چھٹکے ہے

زلف کو جب وہ کھول دیتا ہے — جیسے مارِ سیاہ لٹکے ہے

گر پڑا ہیں، ترا برا ہووے — یوں بھی دامن کو کوئی جھٹکے ہے

مے پیوں ہوں تو مثلِ شیشۂ مے — وہ بھی تجھ بن گلے میں اٹکے ہے

کونسے عضو کی کروں تعریف — اس کی تو بوٹی بوٹی مٹکے ہے

جب سے دیکھی ہے وہ پلک میں نے — پھانس سی کچھ جگر میں کھٹکے ہے

گھر سے باہر نکل کہ مصحفی آج
تیری چوکھٹ پہ سر کو پٹکے ہے

۵۶۵

آغازِ صبحِ ہجر کا انجام دور ہے — اے دیدہ! اور رو کہ ابھی شام دور ہے

طاقت کہاں ہے اتنی کہ واں تک پہنچ سکیں — ہر چند باغ ہم سے کئی گام دور ہے

انصاف تو کرو، دلِ بیتاب کو مرے — آرام کس طرح ہو؟ دل آرام دور ہے

بیٹھے ہیں اور لوگ تو سارے بھرے ہوئے — مجلس میں تجھ سے اک یہی ناکام دور ہے

نزدیک میرے لاشے ٹک اس راہ رکے نہیں — کیا یہ بھی تجھ سے گردشِ ایّام دور ہے

مے پی چکوں تو دیکھیو بدمستیاں مری — یارو! ابھی تو لب سے مرے جام دور ہے

مت بھولیو تو اپنی کمندِ شعاع پر — اے آفتاب! اس کا لبِ بام دور ہے

بیٹھا ہے نقش سب کا لبِ یار پر درست — الّا کہ اس نگیں سے مرا نام دور ہے

جب سے نظر پڑی ہے اس ابرو کی تیغ پر — سر سے ہمارے بالشِ آرام دور ہے

کیوں مصحفی کو دیکھ کے کہتا ہے "دور دور"؟
مدت سے تجھ سے آپ ہی یہ بدنام دور ہے

۵۶۶

گہ خون روئی، گاہے لختِ جگر نکالے
پھر تو نے رنگ اپنے، اے چشمِ تر! نکالے

پھر نو بہار آئی اور پھر شگوفہ پھولا
ہر شاخِ بے ثمر نے پھر برگ و بر نکالے

ٹک دیکھ تو تماشا صنعت کی باغباں نے
اک مشتِ گِل سے کیا کیا رنگیں سحر نکالے

سدِّ سکندری میں گر رکھیے خوب رو کو
وہ کاوشِ مژہ سے اس میں بھی در نکالے

اے نانمودہ عارض! اس تیری جستجو نے
پردے سے باہر آخر شمس و قمر نکالے

کوے بتاں میں میری چاروں طرف نظر ہے
شاید کوئی پری رو، غرفے سے سر نکالے

یہ حسن وہ بلا ہے آوے جو ساحری پر
گھر سے پری کو اپنے دیوانہ کر نکالے

ممنونِ بے پری رہ یعنی کہ اس جہاں سے
پروازِ زندگی ہے جب مور پر نکالے

اے شوقِ جاں فشاندن! کیجو خبر ہمیں بھی
دستِ ستم میاں سے شمشیر اگر نکالے

مارے خوشی کے مجھ کو آجائے ہے غشی سی
کیسے سے خطِّ جاناں تا نامہ بر نکالے

توجس زمیں پہ اپنا اے مصحفیؔ دھرے پانو
یمنِ قدم سے تیرے وہ گنجِ زر نکالے

۵۶۷

مارے گئے کئی ترے، اے یار! ہاتھ سے
پر تو بھی تو نے رکھی نہ تلوار ہاتھ سے

اللہ رے دشمنی، کہ جو نہیں مجھ کو دیکھنا
کر لینے بند رخنۂ دیوار ہاتھ سے

یارب کہیں وہ دن ہو کہ میں گریہ جب کروں
پونچھے تو میرے دیدۂ خونبار ہاتھ سے

دیکھا ہے میں نے جب سے ترا چاکِ آستیں
جاتا رہا ہے دل مرا، اے یار! ہاتھ سے

کیا اتنا اضطراب ہے خوں ریزی میں مری
مہندی تو کھول ٹک کہیں، خونخوار! ہاتھ سے

صیّاد! مرغِ دل کو ابھی ٹک قفس میں رکھ
خوگر نہیں ہوا یہ گرفتار ہاتھ سے

کرنی ہے کچھ دوا مرے دل کی تو کر طبیب!
جاتا ہے مفت ورنہ یہ بیمار ہاتھ سے

گر اس چمن سے میں نے چنا ہو گلِ مراد
نکلیں لبانِ شانہ مرے، خار ہاتھ سے

کہتے ہیں رات سیر و تماشا میں مصحفی
مارا گیا کسی کے طرحدار ہاتھ سے

۵۶۸

او دامن اٹھا کے جانے والے
ٹک ہم کو بھی خاک سے اٹھا لے

روٹھو ہو اِدھر، اُدھر مَنو ہو
دنیا سے یہ ناز ہیں نرالے

حلقے زلفوں کے تیرے رخ پر
اک ماہ ہے اور ہزار ہالے

عشق اس کو ہے جو کہ مثلِ شانہ
ہاتھوں میں کھِلائے ناگ کالے

اس دل نے مجھے بہت ستایا
دشمن کے پڑے نہ کوئی پالے

واں ہلتی ہیں پلکیں تیری اور یاں
چلتے ہیں مرے جگر پہ بھالے

اتنا بھی تو مصحفی نہ خوں رو
رنگین تو ہو گئے رسالے

۵۶۹

پردہ گر درمیاں سے اٹھ جاوے
اک جہاں جسم و جاں سے اٹھ جاوے

مارے الفت کے مر گئے، اے کاش
رسمِ الفت جہاں سے اٹھ جاوے

دیکھ اس کو میں مجھ کو یوں بولا
"کہہ دو اس کو کہ یاں سے اٹھ جاوے"

جی میں ہے اتنے بوسے لیجے کہ آج
مہر اس کے وہاں سے اٹھ جاوے

رہے اے گل تو باغ میں، بلبل
ستمِ باغباں سے اٹھ جاوے

ہم کو چلنا وہ شوخِ بے پروا
گو مرا امتحاں سے اٹھ جاوے

گل کا یہ رنگ! کیا تعجب ہے
مرغ اگر آشیاں سے اٹھ جاوے

نہ ملے جا اُسے کسی در پر
جو ترے آستاں سے اٹھ جاوے

کون کہتا تھا، خوش زباں ایسا
مجلسِ دوستاں سے اٹھ جاوے

ہائے رے مصحفی کا مرنا ہائے
آدمی یوں جہاں سے اٹھ جاوے

۵۷۰

آنکھوں سے رواں خونِ دلِ ریش رہے ہے — یاں روز یہی واقعہ درپیش رہے ہے
نظروں میں گھبی ہے مژہ اس شوخ کی جب سے — دل ساتھ مرے نت خلش نیش رہے ہے
منصور صفت گو کہ اسے دار پہ کھینچیں — حق گوئی سے کب مردِ حق اندیش رہے ہے
گہ لام تو گہ لام الف بنتی ہے بل کھا — زلف اس کی نہ برقاعدہ خویش رہے ہے
نت قتلِ غریباں پہ کمر اس کی ہے بستہ — ان باتوں سے کب چرخِ جفا کیش رہے ہے
پانو اپنا رہِ عشق میں رکھوں کہ نہ رکھوں — ہر لحظہ یہی مجھ کو پس و پیش رہے ہے

اک روز تو کر مصحفی کی تو بھی زیارت
کوچے میں ترے کب سے یہ درویش رہے ہے

۵۷۱

جوں ہی ٹک یار کی پیشانی میں چیں پڑتی ہے — سر و ساماں میں مرے برق وہیں پڑتی ہے
اس تامّل کا ہوں کشتہ کہ ترا وقتِ خرام — پانو پڑتا ہے کہیں، آنکھ کہیں پڑتی ہے
خار خار اس مژہ کا بس کہ رہے ہے شبِ ہجر — ایک پل میرے تئیں نیند نہیں پڑتی ہے
نیم بسمل گئے ہیں وے جو ترے کشتۂ ناز — کیونکہ کل ان کے تئیں زیرِ زمیں پڑتی ہے

مصحفی کے تو گھر آوے تو عجب بھی نہیں کچھ
تجھ سے امّید تو، اے زہرہ جبیں! پڑتی ہے

۵۷۲

عینِ رقّت میں کوئی مجھ سے رکا جاتا ہے — کیا کروں خونِ دل آنکھوں سے بہا جاتا ہے

اندک، اے پیش رواں! وقفہ کہ اس منزل میں
اک مسافر سا کوئی پیچھے رہا جاتا ہے

بے حجابانہ نہ یوں بام پر آیا کر تو
کہ ترے سامنے خورشید چھپا جاتا ہے

کون آگاہ ہے یاں درد سے اس گھایل کے
روز زخموں سے نمک جس کے ملا جاتا ہے

بیٹھو، اے یارو! کوئی بات بتاؤ مجھ کو
آج نامے کا جواب اس کے لکھا جاتا ہے

آج کیا جانیے کیا باد چلی گلشن میں
خود بخود رنگِ گل و لالہ اڑا جاتا ہے

مصحفی کے بھی میں ابرام کا دیوانہ ہوں
جھڑکیاں دے ہے وہ، یہ ساتھ لگا جاتا ہے

۵۷۳

سرِ دل پر مجھے اک نیشتر معلوم ہوتا ہے
مژہ کا تیری رخ پھر کچھ اِدھر معلوم ہوتا ہے

نمی سی پنبۂ داغِ جگر میں اپنے پاتا ہوں
کئی دن سے مجھے پھر اب وہ تر معلوم ہوتا ہے

کوئی گھر بیٹھے کیا جانے اذیت راہ چلنے کی
سفر کرتے ہیں جب، رنجِ سفر معلوم ہوتا ہے

امیدِ وصل پڑتی ہے طلوعِ شمس سے دل کو
ابھی سے نالۂ شب کا اثر معلوم ہوتا ہے

کروں کیوں ذکر میں زاہد کے آگے شعر و شاہد کا؟
وہ ان باتوں سے مجھ کو بے خبر معلوم ہوتا ہے

میں تم سے پوچھتا ہوں انتہا اس عشق بازی کی
تمھیں بھی کچھ، بھلا اے چشمِ تر معلوم ہوتا ہے

مری بھوں کی نگاہیں دیکھ شب، ہمدم سے یوں بولا
کہ "مجھ کو مصحفی کچھ بد نظر معلوم ہوتا ہے"

۵۷۴

تو دیکھے تو اک نظر بہت ہے
الفت تری اس قدر بہت ہے

اے دل! تو نہ کر ہماری خصمی
بس اک دلِ کینہ ور بہت ہے

ٹک اور بھی صبر کر کہ مجھ کو
لکھنا ابھی، نامہ بر! بہت ہے

ہم آبلہ بن رہے ہیں ہم کو
اک جنبشِ نیشتر بہت ہے

شیشے میں ترے شراب ساقی
ٹک ہم کو بھی دے، اگر بہت ہے
اس رنگ سے اپنے گھر نہ جانا
دامن ترا خوں میں تر بہت ہے
افسانۂ عشق کس سے کہیے
اس بات میں دردِ سر بہت ہے
مجھ کو نہیں آہ کا بھروسا
یعنی کہ یہ بے اثر بہت ہے
اس دل کی تو تو خبر رکھا کر
یہ آپ سے بے خبر بہت ہے
کیا بگڑی ہے آج مصحفیؔ سے
اس کوچے میں شور و شر بہت ہے

۵۷۵

اٹھ گیا ہے وہ ستم دیدہ کہیں مدّت سے
کچھ خبر مجھ کو دل اپنے کی نہیں مدّت سے
جیسے ناسور شب و روز بہا کرتی ہیں
ہے یہ آزار ان آنکھوں کے تئیں مدّت سے
کبھی آزردگی اپنی کو کریں گے ظاہر
دل میں کھٹکے ہے تری چینِ جبیں مدت سے
کچھ نہ پوچھو کہ غمِ عشقِ بتاں نے، یارو!
کر رکھا ہے مری خاطر کو حزیں مدت سے
آسماں تازہ نہیں بر سرِ بیداد آیا
یاد ہے اس کے تئیں شیوۂ کیں مدّت سے
کچھ تبسّم نے لبِ یار کے ڈالا نہیں شور
خندۂ زخمِ جگر ہے نمکیں مدّت سے
کوئی واقف نہیں احوال سے میرے شاید
میں تو اس شہر میں ہوں گوشہ نشیں مدّت سے
آبرو کی ہے زبس پاس مجھے، گاڑے پانو
گھر میں بیٹھا ہوں میں مانندِ نگیں مدّت سے
مصحفیؔ اس کی گلی میں ہی رہا آخر کھو ر
تھی مرے خون کی پیاسی یہ زمیں مدّت سے

۵۷۶

جب سے اس شوخ نے شمشیر و سپر باندھی ہے
ہم نے بھی خون پہ یاں اپنی کمر باندھی ہے
روز آ آ کے مجھے گالیاں دے جاتے ہو
مجھ پہ زور آپ نے اس بات کی کر باندھی ہے

کیا تماشا ہے کہ اس شعبدہ بازی نے تری — جو نظر باز ہیں ان کی بھی نظر باندھی ہے

گل ہی اس باغ سے جانے پہ نہیں بیٹھا کچھ — گٹھری غنچے نے بھی از بہر سفر باندھی ہے

جائے مرہم نمکِ سودہ لگایا ہے اسے — زخمِ دل پر میں نئی پٹی اگر باندھی ہے

آج جو گریے کا ساماں ہے یہ اندازِ دگر — شرط کیا ابر سے، اے دیدۂ تر! باندھی ہے

دل کو اپنے ہدفِ تیرِ بلا پاتا ہوں — اس کماں کش نے مگر شست ادھر باندھی ہے

لختِ دل جھمکے ہے یوں چشم کے پردے سے مری — تو کہے جگنو ہے یا اس میں شرر باندھی ہے

باندھنوں ہم پہ نئے سر سے لگے ہیں بندھنے — اس نے پھر باندھنوں کی پگڑی مگر باندھی ہے

مصحفیؔ اشکِ مسلسل کے میں صدقے جس نے
ہر پلک سے مری اک سلکِ گہر باندھی ہے

۵۷۷

اوّل تو یہ دھج اور یہ رفتار غضب ہے — تس پر تری پازیب کی جھنکار غضب ہے

کیونکر نہ تجھے دوڑ کے چھاتی سے لگاؤں — پھولوں کا گلے میں ترے، یہ ہار غضب ہے

جب دیکھوں ہوں کرتی ہے مرے دل کو پریشاں — آشفتگیِ طرّۂ طرار غضب ہے

اے کاش! یہ آنکھیں مجھے یہ دن نہ دکھاتیں — اس شوق پہ محرومیِ دیدار غضب ہے

خورشید کا منہ ہے کہ طرف ہو سکے اس سے — یعنی وہ برافروختہ رخسار غضب ہے

میں اور کسی بات کا شاکی نہیں تجھ سے — یہ وقت کے اوپر ترا انکار غضب ہے

اب تک حرمِ وصل سے محرم نہ ہوئے ہم — کعبے میں حجابِ در و دیوار غضب ہے

گر ایک غضب ہو تو کوئی اس کو اٹھا دے — رفتار غضب ہے، تری گفتار غضب ہے

فرہاد بچا عشق سے، نے قیس، نہ وامق — جی لے ہی کے جاتا ہے یہ آزار غضب ہے

اے مصحفیؔ! اس شوخ سے ٹک بچ کے تو چلنا
سنتا ہے، میاں! وہ بتِ خونخوار غضب ہے

۵۷۸

راہِ خدا میں اتنی سعیِ قدم کریں گے
اب اس گلی کا ہم بھی جانا ہی کم کریں گے

تیغِ نگہ کی اس کے سنتے ہیں آبداری
اک دن جگر کے ٹکڑے ہم بھی بہم کریں گے

آئے تھے کچھ سمجھ کر، کیا جانتے تھے یہ ہم
تیغِ جفا کو خوباں ہم پر علم کریں گے

بن خوں سے لکھے کوئی ہوتا ہے نامہ رنگیں
ہم انگلیوں کو اپنی اک دن قلم کریں گے

جانے لگا ہے پھر دل بے طرح اس گلی میں
اس کا بھی رفتہ رفتہ کچھ فکر ہم کریں گے

مسجد میں گر خروشاں ہے شیخ یا صمد خواں
ہم بت کدے میں جا کر ذکرِ صنم کریں گے

معمورۂ جہاں سے دل سرد ہو گیا ہے
یک چند جا کے سیرِ ملکِ عدم کریں گے

گر تازہ کاریوں پر آئے یہ اشکِ خونیں
تیری گلی کو، جیسے باغِ ارم کریں گے

کیا غم ہے مصحفی گر کاغذ نہیں حنائی
ہم خون رو رو اس کو نامہ رقم کریں گے

۵۷۹

چاہ ہی کہیں بلا بھی ہوتی ہے
طبع ہی مبتلا بھی ہوتی ہے

شیخ جی! سچ کہو تو تم سے نماز
کبھی حضرت قضا بھی ہوتی ہے؟

تو نے اک بات پر کیا مجھے قتل
کہیں ایسی جفا بھی ہوتی ہے!

مار نہیں ڈالتے ہیں یوں اس کو
آدمی سے خطا بھی ہوتی ہے

مصحفی جب میں شعر پڑھتا ہوں
تحسین اور مرحبا بھی ہوتی ہے

۵۸۰

یوں کر کے مرے لاشۂ قرباں کے ٹکڑے
جاتا ہے کدھر، او بے مری جان کے ٹکڑے!

مت نام تو سینے کا کوئی ورنہ ابھی میں
کر ڈالوں گا پھر اپنے گریباں کے ٹکڑے

وہ خستہ بدن ہوں میں کہ جب ڈھونڈیں ہیں احباب
زخموں سے مرے نکلیں ہیں پیکان کے ٹکڑے
تم نے کبھو آگو بھی کوئی قتل کیا ہے؟
اس طرح نہیں کرتے ہیں انسان کے ٹکڑے
اے عشق! روا ہے یہ، گریبانِ زلیخا
ثابت رہے، یوسف کے ہوں دامان کے ٹکڑے
کچھ لختِ دل اور اشک میں اتنا تو نہیں فرق
وے پارۂ آتش ہیں، یہ طوفان کے ٹکڑے
اے مصحفی! غیرت سے مرے طرزِ سخن کی
ہر اک نے کیے پھاڑ کے دیوان کے ٹکڑے

۵۸۱

اوّل تو قفس کا مرے در باز کہاں ہے
اور ہو بھی تو یاں طاقتِ پرواز کہاں ہے
انجام ہے بد اس کا نہ ہر اک سے ملا کر
چہرے پہ ترے خط ابھی آغاز کہاں ہے
بلبل تو طرف مجھ سے تو سوم تبہ ہوتی
میری سی و لیکن تری آواز کہاں ہے
معلوم ہی گھر اس کا نہیں، ڈھونڈیں سو کیونکر
کیا جانیے وہ خانہ براندا کہاں ہے
طاؤسِ چمن گرچہ بصد ناز چلے ہے
تیری سی روش پر بتِ طنّاز کہاں ہے
یارو! کوئی سمجھو تو مغنّی کی صدا کو
کس پردے میں بولے ہے یہ آواز کہاں ہے
میری ہی طرح اور بھی یاروں کی زباں پر
سو بات ہیں پر بات کا انداز کہاں ہے
اے مصحفی میں جس سے کہوں دردِ دل اپنا
اب کوئی یہاں محرمِ ہمراز کہاں ہے

۵۸۲

اس کی جب بات کان پڑتی ہے
تنِ بے جاں میں جان پڑتی ہے
دیکھنا سب کا بھول جاتا ہوں
جب نظر تجھ پر آن پڑتی ہے
ایک دن بھی معاملت جس کو (ق)
تم سے اے مہربان! پڑتی ہے
جی دیے ہی بنے پھر اس کو صبح
گو کہ شب درمیان پڑتی ہے

عشق کی برق گو نہیں ہمہ سوز
مصحفیؔ پر نہ دان پڑتی ہے

۵۸۳

جوں نقشِ قدم، پیارے! واں خاک میں جم بیٹھے
اٹھنے کی ترے در سے ہم کھا کے قسم بیٹھے

احسان کا قاتل کے حق کیونکہ کریں برباد
شمشیر تلے اس کی ہم بھی کوئی دم بیٹھے

نت تفرقہ ہی اس میں اور ہم میں رہا یا رب
افسوس کہ اک دن بھی مل کر نہ بہم بیٹھے

دل کرنے لگا جب شغل اس کوچے میں نالے کا
اک سمت کے تئیں ہم بھی لے دیدہ نم بیٹھے

آتے ہو تو جلدی آؤ یا یوں ہی کہو 'جاؤ'
تا چند میاں صاحب! در پر رہیں ہم بیٹھے

اے مصحفیؔ آئے تھے وے یار کہ بن بن کر
اس محفلِ ہستی میں افسوس کہ کم بیٹھے

۵۸۴

خط آچکا پہ ہنوز اس کی آن باقی ہے
وہی ادا ہے وہی عظم و شان باقی ہے

گر اور بھی ہوسِ امتحان باقی ہے
تو اب تلک بھی، میاں، نیم جان باقی ہے

جو اٹھ گئے ترے کو، سے، نشست گاہ ان کی
برنگِ نقشِ قدم اک نشان باقی ہے

گدازِ غم کو جو اب تک ہے لاگ شمع صفت
مگر بدن میں کوئی استخوان باقی ہے

لیا تو جان و دل، اس وقت وہ بھی لے لیجے
کچھ اور بھی اگر، اے مہربان باقی ہے

رہا ہے کون سدا اس جہانِ فانی میں
اسی کی ذات ہے وہ جو ندان باقی ہے

ملے بھی خاک میں ہم لیک مصحفیؔ اس کو
ہمارے جینے کا اب تک گمان باقی ہے

۵۸۵

اس کے لبِ میگوں ہیں سدا کام میں اپنے
ہم خونِ جگر کیوں نہ بھریں جام میں اپنے

کس طرح کریں عشق کہ مانندِ نگیں کے — حرف آتا ہے اس بات سے اک، نام میں اپنے

بیدار نہ ہوتے کبھی ہم خوابِ عدم سے — گر عشق نہ کرتا خلل آرام میں اپنے

آئینے میں وہ دیکھ کے زلف اپنی پریشاں — آخر کے تئیں آ ہی گیا دام میں اپنے

کر کر کے یہ فریاد و فغاں راتوں کو آپھی — ہم آپ خلل کرتے ہیں آرام میں اپنے

مر جادیں پہ واعظ کی نہ ہو ہم سے اطاعت
اے مصحفی یہ کفر ہے اسلام میں اپنے

۵۸۶

دل کو یہ اضطرار کیسا ہے؟ — دیکھیو بے قرار کیسا ہے!

ایک بوسہ بھی دے نہیں سکتا — مجھ کو، پیارے! تو یار کیسا ہے؟

کشتۂ تیغِ ناز کیا جانے — خنجرِ آبدار کیسا ہے؟

ہر گھڑی گالیاں ہی دیتے ہو — جان میری! یہ پیار کیسا ہے؟

مے نہیں پی تو کیوں چھپاتے ہو؟ — انکھڑیوں میں خمار کیسا ہے؟

اور تو ہیں ہی، یہ تو کہہ، یارے
مصحفی دوستدار کیسا ہے؟

۵۸۷

دل میں مرغانِ چمن کے تو گماں اور ہی ہے — پر دلِ زار کا اندازِ فغاں اور ہی ہے

قدِ نوخیز نہیں، آفتِ جاں اور ہی ہے — جس پہ دل اپنا گیا ہے وہ جواں اور ہی ہے

ہم جہاں رہتے ہیں، یارو! وہ جہاں اور ہی ہے — وہ جگہ اور ہی ہے اور وہ مکاں اور ہی ہے

شفقی رنگ پہ مت بھولیو اپنے، اے ابر! — چشمِ خشک اور مژۂ اشک فشاں اور ہی ہے

بدن آغشتہ بخوں ہونے پہ موقوف نہیں — زخمیِ ناوکِ مژگاں کا نشاں اور ہی ہے

گو کہ اوروں کی ہوئیں سرمے سے آنکھیں روشن — سرمۂ بینشِ صاحب نظراں اور ہی ہے

گرچہ رکھتے ہیں نزاکت یہ سبھی مو کمراں — وہ نزاکت ہے جدی اور وہ میاں اور ہی ہے

مصحفی گرچہ یہ سب کہتے ہیں ہم سے بہتر
اپنی پر ریختہ گوئی کی زباں اور ہی ہے

۵۸۸

یہ نہیں، پیارے! وہ تقریر و بیاں اور ہی ہے — جس سے کوئی تم کو سراہے وہ زباں اور ہی ہے

میں تو کہتا ہوں بہت دن سے کہ ہوں عاشقِ صاف — لیک یاروں کو مرے حق میں گماں اور ہی ہے

کیا عمارات سے ڈھونڈے ہے نشانِ عشّاق — ہائے ان خانہ خرابوں کا نشاں اور ہی ہے

ہو گیا پردۂ دل چاک تو تم دیکھو گے — اس کے پردے میں کوئی آفتِ جاں اور ہی ہے

اور کہتے ہیں جو مو تیری کمر کو تو کہیں — ہم کو کیا کام خیال اپنا میاں اور ہی ہے

اک ذرا جھانک تو تو خاک کے پردے سے اُدھر — تا تجھے بھی نظر آوے کہ جہاں اور ہی ہے

پھول جھڑتے ہیں قلم سے مرے، گل ریز کی طرح — کوئی انصاف سے دیکھے تو سماں اور ہی ہے

مصحفی ہر کوئی کب پہنچے ہے اس رتبے کو
رتبۂ شعر و سخن سچ ہے کہ ہاں اور ہی ہے

۵۸۹

معشوق کی بلا سے پڑا خوار ہو کوئی — جیوے کوئی، مرے کوئی، بیمار ہو کوئی

جس طرح دامِ زلف میں پھڑکے ہے مرغِ دل — یارب نہ یوں کسی کا گرفتار ہو کوئی

سوتا ہے میرے پاس وہ اور گرد سب رقیب — دھڑکا ہے دل میں یہ کہ نہ بیدار ہو کوئی

کیا ایسی تجھ میں خوبی ہے، کاہیکو، کیا ضرور — جی بیچ کر جو تیرا خریدار ہو کوئی

گر کام دل کا لیجیے اس سے تو خوب سا — کیا ایک بوسہ لے کے گنہگار ہو کوئی

پیارے! کرے نہ آہ تو پھر آہ کیا کرے — ہاتھوں سے درد و غم کے جو ناچار ہو کوئی

میری طرف سے اک نے کہا اس کو کاے میاں (ق) — کرتے ہیں یوں خفا اسے جو یار ہو کوئی

کہنے لگا کہ "واہ جی تم بھی ہو زور شخص   میں کیا کروں جو آپ سے بیزار ہو کوئی"

سو بار جا چکا ہے یہ گذری میں مصحفیؔ
وہ دل نہیں کہ جس کا خریدار ہو کوئی

۵۹۰

ہے جی میں تو اپنے کہ وفا کیجیے اس سے   پر جی ہی کا دشمن ہو تو کیا کیجیے اس سے
شاید وہ غمِ دل کی مرے داد کو پہنچے   اس بات کو ظاہر تو بھلا کیجیے اس سے
غصّے ہو تو کچھ اپنی غرض آپ نہ کہیے   جو کچھ وہ کہے اس کی سنا کیجیے اس سے
تا حشر لبِ شکوہ مرے بند نہ ہو ویں   اس دل کو اگر باتوں میں وا کیجیے اس سے
وہ ہم سے جو شاکی ہے تو گو ہووے ولیکن   ہم کو نہیں لازم کہ گلا کیجیے اس سے
پیچھے ہی لگا پھرتا ہے جوں سایۂ شب و روز   کیونکر دلِ دیوانہ جدا کیجیے اس سے

سنتے ہو میاں مصحفیؔ! ہو جاؤ گے رسوا
چھپ چھپ کے نہ راتوں کو ملا کیجیے اس سے

۵۹۱

آہ و فغان و گریہ و زاری   ہم ہیں اور یہ رات ہے ساری
دیکھ تُو تو' اس رونے کا رنگ   یوں روتا ہے ابرِ بہاری؟
اس بُت سے تو وہی بہتر تھا   پتّھر سے گر کرتے یاری
اے دل!! اب ہم دور چلے ہیں   دیکھیو مت تو راہ ہماری
کیا کیا ہم نے کیا نہیں آگے   چہرہ خراشی، سینہ نگاری

مصحفیؔ آیا وقت سفر کا
چلنے کی کیجے تیاری

۵۹۲

ایسے تم کیا ہو میاں جو تمہیں ہم دیکھیں گے
جا کسی اور ہی کو اب کوئی دم دیکھیں گے

تم خفا ہم سے بہت ہو گئے اس دیکھنے پر
آج سے ہم کو بھی سوگند ہے کم دیکھیں گے

قبلہ ہو گے تو کبھی منہ نہ کریں گے اودھر
بخدا ہم کو بھی، ہم اور صنم دیکھیں گے

غیر دیکھیں تمہیں اور ہم کو کہو "جا بے نہ دیکھ"
اپنی آنکھوں سے بھلا ہم یہ ستم دیکھیں گے!

دیکھنے کی جو ادھر تم نے قسم کھائی ہے
کب تلک نبھتی ہے، ہم بھی، یہ قسم دیکھیں گے

دیکھ کر ہم تو چلے پر یہی حسرت ہے کہ ہائے
اب یہ اغیار ترے لطف و کرم دیکھیں گے

ایک دن جان نکل جاوے گی آنکھوں ہی کی راہ
مصحفیؔ عشق میں گر ایسے ہی غم دیکھیں گے

۵۹۳

جب وہ قاتل خرام کرتا ہے
ہر قدم قتلِ عام کرتا ہے

جو کوئی دیکھتا ہے اس کے تئیں
دونوں ہاتھوں سلام کرتا ہے

تجھ بِن اس میکدے میں، اے ساقی!
کون لبریز جام کرتا ہے

تو کھڑا رہ کہ آ بھی یہ بسمل
کام اپنا تمام کرتا ہے

جب کہ نکلے ہے گھر سے وہ باہر
عالم اک ازدحام کرتا ہے

نہ کرے گا کوئی، میاں صاحب!
خدمتیں جو غلام کرتا ہے

ایک دن آ کے مل بھی جا پیارے!
روز کیا صبح و شام کرتا ہے

ابھی اک زخم اور بھی، قاتل!
تیغ کو کیوں نیام کرتا ہے

مصحفیؔ دل دیا تو ایسے کو
جس سے ہر اک پیام کرتا ہے

کیا کیا تو نے سن تو دیوانے
کوئی ایسا بھی کام کرتا ہے!

۵۹۴

دلِ عشق کردہ مرا زار و نزار اس کا ہے
لے چلو واں مجھے جس جا گزار اس کا ہے

ایسے بد وضع سے اب اپنی، کہو کیونکہ نبھے
ہر گھڑی غیر سے ملنا، یہ شعار اس کا ہے

داغ ہوتے ہیں اسے دیکھ کے گل گلشن میں
سرخ جوں لالہ زبس رنگِ عذار اس کا ہے

نشۂ مے سے نہیں، یارو! مری آنکھیں سرخ
خونِ دل کل جو پیا تھا یہ خمار اس کا ہے

شمع رو! کیوں نہ جلوں رشک سے پروانے کے
رات ہوتے ہی تری بزم میں بار اس کا ہے

چہرۂ زرد پہ عاشق کے نہیں اس کو نگاہ
جو کوئی زر اسے دے، یار وہ یار اس کا ہے

مصحفی گرچہ میں حسرت زدہ ہوں خاک کا ڈھیر
تو بھی ہر روز مرا آئنہ دار اس کا ہے

۵۹۵

کیا جانے کب وہ چہرۂ پر نور دیکھیے
کب صبح ہووے یہ شبِ دیجور، دیکھیے

ازبس ہیں تجھ سے دیکھے ہیں رنج و تعب کہ اب
دل دیجیے نہ اس کو اگر حور دیکھیے

کیا کر رہے ہو باغ میں نرگس ہی پر نگاہ
ٹک اپنی بھی تو نرگسِ مخمور دیکھیے

وہ دل کہ جس کی آنکھ سے آنسو گرا نہ ہو
کیا قہر ہے کہ اب اسے ناسور دیکھیے

ہم رہ گئے، رفیق سب آگے نکل گئے
اب ہم سے طے ہو کب یہ رہِ دور، دیکھیے

تم دیکھو آئنے میں تمھیں اس کا کیا ہے ڈر
جو ہووے اپنی چشم کا منظور دیکھیے

اک تند خو، سے آنکھ لڑائی تو ہے ولے
ہے حق میں میرے کیا اسے منظور، دیکھیے

مارا ہے ہم کو جان سے اس کے غرور نے
کب مہرباں ہو وہ بتِ مغرور، دیکھیے

ایسے کے تئیں نہ چھیڑیے زنہار مصحفی
دیوانے! پہلے اپنا بھی مقدور دیکھیے

۵۹۶

نت ضعف سے فتادہ یہ سر بر زمین ہے
مانندِ نقشِ پا مرا بستر زمین ہے

کاٹے ہی سے کٹے گی یہ مانندِ بیستون
فرہاد! راہِ عشق کی پتھر زمین ہے

پست و بلندِ دہر پہ کیا کیجیے نظر
جب آنکھیں مند گئیں تو برابر زمین ہے

اس زلفِ مشک فام کی لٹ کھل گئی تھی رات
دیکھا تو اب تلک بھی معطر زمین ہے

بارِ گنہ سے آپ کو اتنا گراں نہ کر
کشتی کی طرح، پانی کے اوپر زمین ہے

ہوں خاکِ پائے خلق میں دنیا میں مصحفی
یعنی بسانِ مور مرا گھر زمین ہے

۵۹۷

کوچے میں اس کے کتنوں کا سر بر زمین ہے
مسجودِ خلق ہے یہ عجب سر زمین ہے

مت پوچھ ماند و بود تو اپنے مریض کی
بالیں جو سنگ سے ہے تو بستر زمین ہے

ہندوستان سے ہائے کوئی کیونکہ بچ کے جائے
یہ خاکِ سحر خیز تو کافر زمین ہے

اک دن ہوا تھا وہ گلِ عارض عرق فشاں
اب تک ہمارے گھر کی معطر زمین ہے

تخمِ امید اس میں جو بویا سو جل گیا
صحرائے دل کی حیف کہ بنجر زمین ہے

مت کھینچ آسمان پہ خود کو کہ آخرش
منزل گہِ فقیر و تونگر زمین ہے

فرشِ شہی سے کام ہے کیا ہم کو مصحفی
اپنی نشست گاہ تو اکثر زمین ہے

۵۹۸

کوچے کی تیرے خوں میں تر اکثر زمین ہے
کیا خاکِ کربلا ہی کا فر زمین ہے

ہے مبتذل ہمیشہ ہوا آہِ سرد کی
اقلیمِ عشق کی بھی عجب سر زمین ہے

دل کی طپش پہ میری ہے اس کا بھی عرصہ تنگ
صحرائے حشر اگرچہ سراسر زمین ہے

کس طرح کہیے ہائے چھوٹ گئے مر کے وے مریض
سل سی جنھوں کی چھاتی کے اوپر زمین ہے

کیا کیا نہ خوں ہوئے ترے کوچے کی خاک پر
انصاف ہو تو قابلِ محضر زمین ہے

آتا ہے جی میں رو کے ڈبا دوں اسے بھی سب   یہ تھوڑی سی جو پانی کے باہر زمین ہے

گاڑا اٹھا تیری زلف کے کشتے کو جس جگہ   کہتے ہیں لوگ واں کی معنبر زمین ہے

دیکھو نہ خاکساروں کو ہرگز بہ چشمِ کم   رتبے میں آسماں کے برابر زمین ہے

جس جا کیا تھا ذبح مجھے اس نے مصحفی
تھالے سے خوں کے اب بھی وہاں تر زمین ہے

۵۹۹

ہر طرف وہ شمع رو ہے جلوہ آرا، دیکھ لے   حق نے گر دی ہیں تجھے آنکھیں تماشا دیکھ لے

اس گزر کا اور بھی دو دن تماشا دیکھ لے   آنکھیں کرتی ہیں تری کس کس سے سودا دیکھ لے

ہم کو تو ہرگز نظر آتی نہیں اس کی کمر   چاہیے کیا ہم نشیں گر تو ہے بینا دیکھ لے

یار کے چہرے سے کھولا چاہتا ہوں میں نقاب   لیک ڈرتا ہوں کوئی اس کو مبادا دیکھ لے

پھر کہاں پاوے گا، اے دیوانے! یہ فصلِ بہار   کر لے سیرِ گلستاں اور کوہ و صحرا دیکھ لے

دیکھ تو کیسا یہ تیری راہ میں ہے شور و شر   رکھ نہ تو، یاں سے قدم آگے، یہ غوغا دیکھ لے

بام پر آیا تو ہے تو ہو کے ہر شب بے حجاب   اور جو کوئی چاند سا تیرا یہ مکھڑا دیکھ لے

مصحفی آخر تو تو جاوے گا آپ ہی اس کے پاس
راہ اس کی اور بھی امروز و فردا دیکھ لے

۶۰۰

نہ کرو دیر مرے قتل میں تم آؤ بھی   گر نہیں تیغ تو خنجر ہی میاں لاؤ بھی

سر بسر مایۂ شر ہے یہ مری بدمستی   شیخ جی! خیر سے تم گھر کو کہیں جاؤ بھی

جانِ من! دور کھڑے کیا ہمیں ترساتے ہو   آئے ہو اب تو گلے سے کہیں لگ جاؤ بھی

کون برداشت کرے نت کی تمہاری ہر دم   ایک تو گالیاں دو دوسرے دھمکاؤ بھی

کیا کروں اب تو کیا تم سے سوالِ بوسہ   لبِ شیریں سے جو دینا ہے تو فرماؤ بھی

سارے عالم میں بہت تم نے کیا مجھ کو خراب کہیں، اے دیدۂ دل! اپنا کیا پاؤ بھی
بزم سب منتظر آنے کی تمہارے ہے غرض
حضرت مصحفی تشریف کہیں لاؤ بھی

۶۰۱

ہم کو تو اپنا ہی جانا چاہیے غیر سے یوں منہ پھرانا چاہیے
کیونکہ بے تقریب جاؤں اس کے پاس کچھ تو ملنے کو بہانا چاہیے
جانے کا کچھ اس گلی میں ڈر نہیں شب کے رہنے کو ٹھکانا چاہیے
کوئی کسی کو مفت بھی دیتا ہے جاں؟ او میاں! اتنا تو جانا چاہیے
قصۂ غم میں اگر لکھوں تمام اس کے لکھنے کو زمانا چاہیے
جب کہ گردن رکھ دی ہو خنجر تلے پھر ہمیں کیا سر اٹھانا چاہیے؟
تیرِ مژگاں کے یہ دل قابل نہیں یاں کوئی ناوک نشانا چاہیے
رہیے اک شب یاں بھی، ایسی کیا ہے ضد! بات کو میری بھی مانا چاہیے
مصحفی ناصح تو مکلا منہ کا سخت
اس کے تئیں اب اک دہانا چاہیے

۶۰۲

اے عشق! تیری اب کے وہ تاثیر کیا ہوئی شورِ جنوں کدھر گیا؟ زنجیر کیا ہوئی؟
دیوانہ پن کا میرے جو کرتے نہیں علاج تدبیر کرنے والوں کی تدبیر کیا ہوئی؟
آگو کی طرح آپ جواب بولتے نہیں کیا جانے ایسی ہم سے وہ تقصیر کیا ہوئی؟
ہم نے تو تم کو دوڑ کے کولی میں بھر لیا فرمائیے اب آپ کی شمشیر کیا ہوئی؟
کی تھی جو میں مرقعِ عالم سے انتخاب
اے مصحفی، دریغ! وہ تصویر کیا ہوئی

۶۰۳

وصل کی شب جسے کہتے ہیں سو پائی نہ گئی
ہم گئے جان سے پر تیری جدائی نہ گئی

عشق سے ہم کو کھلاتا تھا قسم یار بہ تیغ
تیغ کھائی پہ قسم ہم سے تو کھائی نہ گئی

تیری تصویر بنا ویسی ہی پھر مانی نے
اور تصویر بنائی تو بنائی نہ گئی

آہ، وہ آتشِ سوزاں ہے کہ جس دم بھڑکی
پھر کسی طرح سے یہ آگ بجھائی نہ گئی

آج جو رطلِ گراں دے اسے، دشمن ہے مرا
جس سے کل مے کی صراحی بھی اٹھائی نہ گئی

گرم ہے آہ سے ہنگامۂ آتش بازی
کون سی شب کہ فلک تک یہ ہوائی نہ گئی

کب وہ بت گھر سے نہ مسجد کی طرف آنکلا
دیکھیے کس دن اسے ساری خدائی نہ گئی

گرچہ کوتاہ کیا قطع کر ان کو تو نے
تو بھی، پیارے! تری زلفوں کی رسائی نہ گئی

کس طرح ہم تجھے پردے میں چھپا بٹھلادیں
جب کہ حق سے ہی تری شکل چھپائی نہ گئی

وصل کی شب ہی تو کچھ مجھ سے بگڑ بیٹھے ہے
سب ہوا پر یہ تری شب کی لڑائی نہ گئی

دیکھ اس جنبشِ ابرو کو ہوئے ہم مجروح
مصحفی ہم سے یہ تلوار بچائی نہ گئی

۶۰۴

کل جوں ہی دابی چشمِ تر انگشت کے تلے
آنے لگا لہو سا ہر انگشت کے تلے

صیاد مجھ کو اب ترے چنگل سے چھوٹنا
رہ جاویں گو کہ ایک دو پر انگشت کے تلے

قاتل سے میرے خون کا دعویٰ نہ کیجیو
دیکھو مزار اس کی گر انگشت کے تلے

مرہم لگاوے گر تو مرے داغ کو، طبیب!
رکھ لیجو ٹک حنا بھی سر انگشت کے تلے

مردوں کے زیرِ دست ہی ہوتے ہیں بھائی بند
جیسے سب انگلیاں ہیں تر انگشت کے تلے

سینے میں داب داب کے رکھوں کہاں تلک
دل ہاتھ کے تلے، جگر انگشت کے تلے

کاہے کو اپنا زور سے رکھو تم اس پہ ہاتھ
جو ناتواں کہ جائے مر، انگشت کے تلے

تو مجھ سے کیا چھپائے ہے، لایا ہے اس کا خط
کچھ ہے تو تیرے نامہ بر! انگشت کے تلے

۶۰۵

روتے نت زار زار گزری ہے
یوں ہی لیل و نہار گزری ہے

جی سے گزرا ہے وہ، تری صورت
جس کی نظروں سے، یار! گزری ہے

سیکھے عشق ہم سے کوئی کہ اپنی عمر
کرتے یہی کار و بار گزری ہے

اشکِ گلگوں رہے ہیں زیبِ مژہ
خار پر بھی بہار گزری ہے

گل کی خاطر میں بھی نہیں اب تک
جی سے بلبل ہزار گزری ہے

پوچھ مت سرگذشت کچھ میری
زیرِ شمشیرِ یار گزری ہے

کیا کہوں اس نگاہ کا انداز
تیر سی دل کے پار گزری ہے

کہدو مجنوں سے، ناقۂ لیلیٰ
آج پھر بے مہار گزری ہے

مصحفیؔ سر سے آبِ تیغ اس کی
جیسے دریا کی دھار گزری ہے

۶۰۶

آغوش میں کب آ کے، تم اے یار! سو گئے
خالی بغل ہی ہم تو کئی بار سو گئے

اغلب کہ حشر کو نہ اٹھیں گے وے خواب سے
جو اس کے زیرِ سایۂ دیوار سو گئے

آتی نہیں جو کان تلک اب صدائے آہ
شاید کہ تیری چشم کے بیمار سو گئے

جو آئے اس کے کوچے میں، رات ان پہ یوں کٹی
دو چار جاگتے رہے، دو چار سو گئے

کیا رکھے چشم وا کوئی اس خواب گاہ میں
یاں ہم سے کتنے مردمِ ہشیار سو گئے

باہر کل تو گھر سے کہیں اب تو، میری جاں!
باشندگانِ کوچہ و بازار سو گئے

مخمل کی سیج پر بھی نہ آتی تھی جن کو خواب
سو اب وے فرشِ خاک پہ ناچار سو گئے

گر ہم تمہارے ملنے کو آئے تو تم، میاں!
چادر سے منہ چھپا وہیں یکبار سو گئے

اے مصحفیؔ ملا نہ وہ کافر بقول درؔد
"ایسے ہمارے طالعِ بیدار سو گئے"

۶۰۷

ہم کو نے دنیا دنے دیں چاہیے
اک صنم زہرہ جبیں چاہیے

دل مرے پہلو میں ٹھہرتا نہیں
جا اسے اب زیرِ زمیں چاہیے

یار کے کوچے میں کرو مجھ کو دفن
یعنی میری قبر یہیں چاہیے

غم نہیں گر ہو مری خاطر حزیں
خاطرِ عشاق حزیں چاہیے

گریۂ شبنم میں نمک ہے تو لیک
خندۂ گل بھی نمکیں چاہیے

چاہیے یہ مہر کی باتیں کرو
ہم سے میاں تم کو نہ کیں چاہیے

بیچتے ہیں مصحفیؔ ہم اپنا دل
ہم سے تو، کہیو جو کہیں چاہیے

۶۰۸

چہرے سے نقاب دور کیجے
بس شرم و حجاب دور کیجے

ہو تیغ تو دل کو چاک کر کے
پہلو سے عذاب دور کیجے

ہے جی میں، یہ زندگی کا برقع
مانندِ حباب دور کیجے

تا چند نوشت و خواند، اے دل!
بس لوح و کتاب دور کیجے

دھوڈالیے خونِ مصحفیؔ کو
خنجر سے خضاب دور کیجے

۶۰۹

شبِ ہجر کل بے قراری میں گزری
سحر تک ہمیں آہ و زاری میں گزری

نہ جھپکی نہ جھپکی ذرا آنکھ میری
یہ شب مجھ کو اختر شماری میں گزری

کیا اس نے گا ہے نہ ملنے کا وعدہ
مری یوں ہی امیدواری میں گزری

یہ آنکھیں تری ہیں وہ بازِ سبک پر
کہ جن کی سدا دل شکاری میں گزری

کوئی فعلِ نیکو نہ ہم سے ہوا ہائے | اسی خجلت و شرمساری میں گزری
یہ عمرِ دراز اپنی جوں زلفِ خوباں | پریشانی و سوگواری میں گزری
کبھو خوں کبھو آب رویا کیا میں | ان آنکھوں کی نت تازہ کاری میں گزری
ترے روبرو بیٹھا رویا کیا میں | شبِ وصل بھی اشکباری میں گزری

بیاں کیا کرے مصحفیؔ تجھ سے اس کا
جو حالت تری دوستداری میں گزری

۶۱۰

تری واں تغافل شعاری میں گزری | مری یاں سدا آہ و زاری میں گزری
ہوئے آخرِ کار اپنے وے دشمن | جنہوں کی ہمیں دوستداری میں گزری
بن اک خوبصورت نہ ہرگز رہے ہم | ہمیشہ سے یاروں کی یاری میں گزری
کبھی ایسی زلفوں کو شانہ کیا ہے؟ | صبا! تیری نت شانہ کاری میں گزری
چھٹی ہی رکھیں منہ پہ مژگاں سے چلمن | ان آنکھوں کی نت پردہ داری میں گزری
مجھے آخرِ کار آیا یہ رونا | کہ عمرِ عزیز اپنی خواری میں گزری

تو کتنا برا ہے کہ اوقات تیری
سدا مصحفیؔ ہرزہ کاری میں گزری

۶۱۱

انداز و ناز میں تجھے استاد کر گئے | اہلِ زمانہ ہم پہ یہ بیداد کر گئے
صد آفریں ہے ان کو جو اس قتل گاہ میں | آ، سر کو وقتِ خنجرِ جلاد کر گئے
آتے ہوئے گلی سے تری جیسے گرد باد | ہم آپ اپنی خاک کو برباد کر گئے
پہنچی نہ گوشِ گل میں سدا اس چمن کے بیچ | کیا کیا نہ مرغ نالہ و فریاد کر گئے
کیا ڈر ہے، باغباں! جو کبھی آ کے باغ میں | ہم بھی نظارۂ گل و شمشاد کر گئے

گر آگئے گلی میں تری ہم کبھی تو، یار! | رو کر تسلّیِ دلِ ناشاد کر گئے
یارب بھلا ہو ان کا جو آتے ہی روزِ عید | زندانیوں کو قید سے آزاد کر گئے
مرغانِ تیز بال سے شکوہ ہے یہ، کہ ہائے! | ہم کو اسیرِ چنگلِ صیّاد کر گئے
مردانِ دیں انھیں کو لکھا اہلِ ہوش نے | دنیا میں آ کے وے جو تری یاد کر گئے
ہاتھوں کو ان کے چومیے جو اک زخم کے بیچ | کاغذ کو رشکِ صفحۂ بہزاد کر گئے

اک تو ہی مصحفیؔ نہ گیا قافلے کے ساتھ
اسباب اپنا یار تو سب لاد کر گئے

۶۱۲

صورت کے تیری صدقے، تصویر ہے تو یہ ہے | عاشق کے حق میں پیارے تسخیر ہے تو یہ ہے
دل پیچ زلف سے ہو کیوں کر رہا کسی کا | گر دام ہے تو یہ ہے زنجیر ہے تو یہ ہے
شب خواب میں لیے ہیں بوسے ترے لبوں کے | کیوں کر نہ منفعل ہوں تقصیر ہے تو یہ ہے
دل کی تڑپ سے اپنی پے لے گیا میں یعنی | تیرِ نگہ کا اس کی نخچیر ہے تو یہ ہے
ہے جی میں شاخِ گل کے لگ کر گلے سے روؤں | رفعِ جنوں کی میرے تدبیر ہے تو یہ ہے
ابرو کے آگے تیری لازم ہے سر جھکانا | محراب ہے تو یہ ہے، شمشیر ہے تو یہ ہے
میری طرف سے اس کا دل کر دیا ہے پتّھر | آہ و فغاں کی اپنے تاثیر ہے تو یہ ہے
کل کی شب، آہ اپنی گردوں سے پار گزری | ترکش میں عاشقوں کے گر تیر ہے تو یہ ہے
میں مر گیا پر اس نے میری طرف نہ دیکھا | اس جرمِ عاشقی کی تعذیر ہے تو یہ ہے

فرقت میں تیری، پیارے! جیتا رہا ہے اب تک
ہاں سچ ہے مصحفیؔ کی تقصیر ہے تو یہ ہے

۶۱۳

غیر کے قابو میں یوں آ جائے یار، افسوس ہے | ہم رہیں یاں ہاتھ ہی ملتے ہزار افسوس ہے

خاک بھی اپنی نہ پہنچی اس کے کوچے میں، صبا! — یوں کیا برباد یہ مشتِ غبار، افسوس ہے
ہم صفیرانِ قفس نے باغ کے لوٹے مزے — ہم قفس ہی میں رہے، فصلِ بہار، افسوس ہے
کیوں نہ میں ماتم میں دل کے، بیٹھ کر زاری کروں — اٹھ گیا دنیا سے ایسا غم گسار، افسوس ہے
اے دلِ شوریدہ! آخر اس کی زلفوں کی طرح — ہو گیا تو بھی پریشاں روزگار، افسوس ہے
یہ بھی کچھ قسمت کی خوبی ہے کہ یا ایں ارتباط — میری اور اس کی نہ ہو صحبت برار، افسوس ہے

جس کو ہم سمجھے تھے یارِ باوفا، اے مصحفی
آخرش اس نے دیا ہی انتظار، افسوس ہے

۶۱۴

ہم رہیں باحسرت و حرماں دوچار، افسوس ہے — آئنہ ہو اس کا ہم زانو، ہزار افسوس ہے
مجھ سے روٹھا ہی پھرے ہر لحظہ یار، افسوس ہے — غیر سے ہو اس کو یوں صحبت برار، افسوس ہے
گل کا پت جھڑ دیکھ کر بلبل یہ بولی آہ مار — "مل گیا یوں خاک میں رنگِ بہار، افسوس ہے"
اس کا وہ دامن جھٹکنا اب تلک آتا ہے یاد — کیا گیا ہے ہاتھ سے میرے شکار، افسوس ہے
عید کے دن بھی رہیں محروم ہی ہم یا نصیب! — یار یوں غیروں سے ہووے ہمکنار، افسوس ہے

دیکھتے ہی اس کی صورت مصحفی، دل سے مرے
یک بیک جاتا صبر و قرار، افسوس ہے

۶۱۵

کرتے نہیں جو داد تو بیداد کیجیے — یعنی کسو طرح تو ہمیں یاد کیجیے
دام و قفس کو توڑ کے جاتے رہیں گے ہم — کچھ فکر اور، اے مرے صیاد! کیجیے
صفحے پہ دل کے کھینچیے تصویرِ روے یار — تضحیکِ کارِ مانی و بہزاد کیجیے
اک آسمان طرفہ بپا ہو ہوا کے بیچ — گر اپنی مشتِ خاک کو برباد کیجیے
تقریب کونسی ہے ہمارے نشاط کی — اس دل کو کس طرح سے بھلا شاد کیجیے

اپنے نصیب میں یہ لکھا تھا کہ فصلِ گل — کنجِ قفس میں زمزمہ بنیاد کیجیے

صنعت پہ آئیے تو ابھی سنگِ سخت میں — ناخن سے کارِ تیشۂ فرہاد کیجیے

کیوں مصحفی کو دیتے ہو دشنام، او میاں!

مرتا ہے وہ اسے بہ دعا یاد کیجیے

٦١٦

خاطر کو بندِ غم سے ٹک آزاد کیجیے — چلیے چمن میں روئیے، فریاد کیجیے

تا چند ہم سے، جانِ مری! یہ رکھائیاں — گاہے تسلّیِ دلِ ناشاد کیجیے

مانندِ گل جو کھولیے دستِ سخا کبھو — زر اک طرف کہ آپ کو برباد کیجیے

آتا ہے جی میں صورتِ شیریں کو دیکھ کر — جا بیستوں میں ماتمِ فرہاد کیجیے

روے شبِ فراقِ سیہ کانپتا ہے دل — اس شب کی بے قراریاں گر یاد کیجیے

کہنا ہے جو کچھ آپ کو، پھر سوچتے ہو کیا — ہم کو بجاں قبول ہے، ارشاد کیجیے

گر جائیے چمن میں تو آنکھیں نہ موندیے — واں بھی نظارۂ گل و شمشاد کیجیے

یک پردہ عندلیب سے رکھیے نوا بلند — نالے کی طرز اب کے گر ایجاد کیجیے

ڈرتے نہیں جفا سے جو چوکیں وفا سے ہم — جتنا کہ تم سے ہو سکے بیداد کیجیے

اڑنے کے بال و پر ہیں کہاں مصحفی مگر

اب پھر سراغِ خانۂ صیّاد کیجیے

٦١٧

ہے آج تو گلشن میں بہارِ گلِ مہندی — آتا ہے نظر سرخ عذارِ گلِ مہندی

بے برگی غرض اس کی تو ظاہر ہے سبھوں پر — کیا رنگِ شفق ہووے دو چارِ گلِ مہندی

کہیے گلِ بے خار اگر اس کو بجا ہے — یعنی کہ نہ دیکھا کہیں خارِ گلِ مہندی

ہر شاخِ گل افشاں سے ہے ظاہر کہ چمن میں — ہے خود گلِ مہندی ہی نثارِ گلِ مہندی

کیونکر نہ گریباں کو کریں چاک کہ بن یار یوں ہاتھ سے جاتی ہے بہارِ گلِ مہندی
رنگین ہے اتنا کہ وہ ہو جاوے حنائی انگشت سے گر کیجے شمارِ گلِ مہندی
اے مصحفیؔ! آتش سی لگا دی ہے چمن میں
اڑتے نہیں پتّے میں شرارِ گلِ مہندی

۶۱۸

عاشق کو اپنے منعِ محبت نہ کیجیے یہ بھی نہ کیجیے، جو مروّت نہ کیجیے
ہے گریۂ شبانہ سے آگو ہی دل پہ کوفت اے آہِ صبح! اور قیامت نہ کیجیے
میں آپ خوش ہوں، آیئے تلوار کھینچ کر تم کو قسم ہے میری، رعایت نہ کیجیے
گر یہ طپش ہے دل کی تو شاید کہ بعدِ مرگ زیرِ زمیں بھی خوابِ فراغت نہ کیجیے
وقتیکہ دسترس ہی نہ ہو اس عذار پر پھر کس طرح نگاہ بہ حسرت نہ کیجیے
مقتل کو دل چلا ہے، یہ جانے گا کیا بھلا گر واں تلک بھی اس کی رفاقت نہ کیجیے
میری طرف بھی دیکھیے ٹک میرے روبرو نظروں میں ہر کسی سے اشارت نہ کیجیے
تابوت پر تو آیئے اپنے مریض کے گر زندگی میں اس کی عیادت نہ کیجیے
سر کاٹ کر اگر تو مرا پھینک دے میاں! تو بھی کسی سے تیری شکایت نہ کیجیے
صورت کو ٹک ہی دیکھیے اس کی بھی، ناصحو! مجھ کو ہی وقت وقت نصیحت نہ کیجیے
اس دھج سے اپنا پانو نہ رکھیے زمین پر میری تو کیا ہے، شہر کو غارت نہ کیجیے
اے مصحفیؔ! نہ جایئے اس کی گلی کے بیچ
سنیے کسی کی بات، جہالت نہ کیجیے

۶۱۹

اجل کی گھات، مری جان! ہر کسی پر ہے بہ ہوش باش کہ عالم رواروی پر ہے
مژہ سے چنّی سی آتی ہے کوئی بوند کبھی زبس کہ خونِ جگر ان دنوں کمی پر ہے

میں دیکھتا ہوں طرف اس کی، اور بہ رغم مری
نگاہ اس بتِ کافر کی آرسی پر ہے

دلا خمش! گلہ، روزگار کیا کیجے
کچھ ایک پر نہیں یہ حادثہ سبھی پر ہے

میں جانتا نہیں تڑپے ہے کون خوں میں؟ مگر
کسی کے ہاتھ سے آفت، کسی کے جی پر ہے

لگا کے تیر مرے، ہمسروں سے یوں بولا
"لگاؤ تم بھی، کہ چوٹ اپنی اب اسی پر ہے"

ہمیں خبر نہیں پر بعضے لوگ کہتے ہیں
کہ خون کتنوں کا اس پان، اس مسی پر ہے

بظاہر اتنی خشونت یہ کیا ہے، حیراں ہوں
مزاج اس کا اگر ہم سے آشتی پر ہے

خدا کے واسطے ہاتھوں کو مت حنائی کر
کہ تیرے ہاتھوں سے بیداد مصحفیؔ پر ہے

۶۲۰

شب روتے روتے ہم جو ترے غم میں سو گئے
تا صبح ہوتے ہم پہ تو طوفان ہو گئے

آئے جو تیرے کوچے میں سوداگرانِ عشق
تیر آتو کیا لیا دے کچھ اپنا ہی کھو گئے

کس سے ہم اپنے دیدۂ تر کا کریں گلہ
ڈوبے یہ آپ اور ہمیں بھی ڈبو گئے

از بس وہ چند شوق رہا مجھ کو، نامہ بر
آیا جو واں سے ایک تو پھر یاں سے دو گئے

تو، کارگاہِ عشق کی کچھ نازکی نہ پوچھ
یاں رونے والے پلکوں سے موتی پرو گئے

دریائے خوں بہا تھا از بس اس گلی کے بیچ
پہنچے وے اپنی جان سے جو ہاتھ دھو گئے

آیا نہ تو، تو بجلی کا سینہ ترق گیا
تربت پہ بے کسوں کی ترے، ابر رو گئے

اس سرزمینِ عشق سے حاصل ہوا نہ خاک،
یاں کتنے شخص تخمِ تمنّا کا بو گئے

میں رہروانِ عشق کا پایا نہ کہیں سراغ
اے مصحفیؔ گئے ہی وہ اس رہ میں جو گئے

۶۲۱

نظروں سے جب نہاں وہ بر و دوش ہو گئے
ہم لاکھ حسرتوں سے ہم آغوش ہو گئے

آیا چمن میں وہ گلِ نازک جو ہم کو یاد
گلہائے باغ جی سے فراموش ہو گئے

گرمِ سخن تھی جن کی زباں ساری ساری رات
سو وے چراغِ صبح سے خاموش ہو گئے

تزئینِ عاریت کا اُسے کب خیال ہے؟
قطرے عرق کے، جس کی دُرِ گوش ہو گئے

رکھتے تھے دے جو ہوش کا کچھ اپنے اعتماد
صورت کو تیری دیکھ کے بیہوش ہو گئے

کس کس کو یاد کیجیے، پردے میں خاک کے
کیا کیا نہ ماہ پارے کہ رُو پوش ہو گئے

اس میکدے میں مثلِ خُمِ بادہ، مصحفی
دو دن ہمارے دل کے بھی سرجوش ہو گئے

۶۲۲

دین و ایماں، دل و جاں تجھ کو دوں، ایسے جی
ایک بوسہ بھی عوض اس کے نہ لوں ایسے جی

مجھ سے کہتے ہو "تجھے قتل نہیں کرنے کے"
غیر سے پھر یہ اشارہ ہے کہ "ہوں، ایسے جی"

ہر کوئی منہ میں، مری جان! زباں رکھتا ہے
گالیاں دو مجھے، میں کچھ نہ کہوں ایسے جی

مارگیری میں ہوں استاد میں، اے افعیِ زلف!
اک ذرا ہاتھ لگاتے ہی یہ فوں! ایسے جی

آپ ہر دم جو یہ کہتے ہیں کہ "تو کیوں ہے کھڑا؟"
دل تمھیں دے کے میں کیا بیٹھ رہوں ایسے جی

ذبح کر ڈالو ابھی تم تو غریبوں کے تئیں
بخش دیوے تمھیں اپنا کوئی خوں ایسے جی

ذلیت کی، قیس نے جس طرح کہ ویرانی میں
مصحفی تو بھی ہے گر اہلِ جنوں، ایسے جی

۶۲۳

اس بت کو نہیں ہے ڈر خدا سے
بگڑی بندے سے گر، خدا سے

گو خلق بھی جانے حال میرا
پوشیدہ نہیں مگر خدا سے

ہے ہم نے تو آہ آہ کرنا
دینا اس کو اثر خدا سے

ہم نے اسے اپنا سُود جانا
پہنچا بھی اگر ضرر خدا سے

دیکھا ہے میں جب سے وہ بتِ شوخ
پھر گئی ہے مری نظر خدا سے

بازیچے میں ہے اُدھر وہ مشغول
اور بن رہی ہے اِدھر خدا سے

کچھ خوب نہیں یہ خود نمائی
ہاں اے بتِ شوخ! ڈر خدا سے

ہے بیر خدائی اور خودی میں
اتنی بھی خودی نہ کر خدا سے

یہ سارے خدا شناس ہیں لیک
دیتا نہیں کوئی خبر خدا سے

اے مصحفی کچھ کمی نہیں مگر واں
جو چاہے سو مانگ، پر خدا سے

۶۲۴

بتاں! وہ مہر و محبت وہ چاہ بھول گئے؟
ہمارے حال پہ کرنی نگاہ بھول گئے؟

کل ایسی شکل سے آیا وہ بیچ مجلس کے
کہ داد مانگنی سب داد خواہ بھول گئے

ابھی تو تم نے کہا تھا کہ بوسہ دیتا ہوں
پھر اتنے ہی میں، مری جان! واہ بھول گئے

پھرا کریں ہیں شب و روز، کیا مگر پیارے!
تمھارے کوچے میں کچھ مہر و ماہ بھول گئے؟

تمھارے دل میں جو خطرہ نہیں محبّت کا
مگر ہماری وہ فریاد و آہ بھول گئے

ہمیشہ مصحفی ہم راہ راہ جاتے تھے
گئے کل اس کی گلی میں تو راہ بھول گئے

۶۲۵

جاویں کیدھر کو اب اس تاب و تعب کے مارے
اے بتاں! ہم تو خدا کے ہیں غضب کے مارے

ابھی چاہیں تو تمھیں بھر لیں، میاں! کولی میں
چھیڑتے ہم جو نہیں ہیں تو ادب کے مارے

جا کے پوشیدہ ہوئے کوہ بدخشاں کے بیچ
لعل و یاقوت تری سرخیِ لب کے مارے

ایک بوسہ نے قلیاں ہی کا دے، اے گل رو!
دل مرا سوخت ہوا جاتا ہے طلب کے مارے

کون ہوتا ہے بلد گم شدگاں کا تیرے؟
کوچۂ عشق میں وے پھرتے ہیں کب کے مارے

خاک بھی ان کی جو جلتی ہو تو کچھ دور نہیں	مر گئے وے جو ترے عشق کی تب کے مارے

مصحفی ہم میں تو طاقت نہ رہی، خانہ خراب!
گریۂ روز کے اور نالۂ شب کے مارے

۶۲۶

ہوسِ گریہ سے ہو دل کوئی دم تا خالی	آہ، نہ اے رشک! ہے آنکھوں میں تری جا خالی
بس کہ فرقت میں تری سال ہی گزرے ہم کو	ہم نے جو چاند کہ دیکھا سو وہ دیکھا خالی
ہم وے مے نوش ہیں، ساقی! کہ اگر مستی میں	منہ بھڑا دیویں تو ہو جا خُمِ صہبا خالی
اور سامانِ طرب سب ہوا موجود پہ، یار!	اک تجھی سے ہے ابھی بزمِ تمنّا خالی
نقدِ وقت اپنا تو برباد نہیں دیتا میں	گو زر و سیم سے اب ہاتھ ہے میرا خالی
دل میں کچھ خوں نہ رہا چشم میں جب اشک آئے	جام پُر ہوتے ہی، یاں ہو گیا مینا خالی

مصحفی دیکھ کے دل کیوں نہ بھر آوے اس کو؟
نظر آتا ہے مجھے قیس سے صحرا خالی

۶۲۷

دن رات دل اضطراب میں ہے	جی ہے سو جدا عذاب میں ہے
سبحان اللہ تیرا چہرہ	یہ نور کب آفتاب میں ہے
کرتے ہو جو تم عتاب اتنا	کچھ لطف بھی اس عتاب میں ہے
اس شاہسوار کے میں صدقے	جس کے دو جہاں رکاب میں ہے
دل، گریۂ گرم و تر کے ہاتھوں	کچھ آتش میں، کچھ آب میں ہے
سورج نکلا پہ تیرا مکھڑا	اب تک، پیارے! نقاب میں ہے
اس دل میں، میاں! تری محبّت	جیسے کہ نمک کباب میں ہے

پاس اپنے تو مصحفی زرِ نقد
ایک دل ہے سو کس حساب میں ہے

۶۲۸

معشوقۂ گل نقاب میں ہے		محجوبہ ابھی حجاب میں ہے

مہندی نہ لگا کہ، جان میری		ہاتھوں سے ترے عذاب میں ہے

تو ہے وہ بلا کہ ماہ و خورشید		زلفوں کی ترے رکاب میں ہے

ہر اک تجھے آپ سا کہے ہے		قضیہ مہ و آفتاب میں ہے

اللہ رے ترے پسینے کی بُو		کب ایسی بھبک گلاب میں ہے

اس زلف کا اینٹھنا تو دیکھو		بن چھیڑے ہی پیچ و تاب میں ہے

قہاری کی شان جب سے تیری	ق	عالم کے اوپر عتاب میں ہے

دل کوہ کا ہو گیا ہے پانی		دریا سب اضطراب میں ہے

اٹھ مصحفی آفتاب نکلا
اب تک تو، دوانے خواب میں ہے

۶۲۹

جب مری خاک پہ ٹک بیٹھ کے یار اٹھتا ہے		اس کے دامن کے پکڑنے کو غبار اٹھتا ہے

ہم کو تکلیف نہ دو، شیخ جی! عمّامے کی		لادیں سر کس کا؟ کوئی ہم سے یہ بار اٹھتا ہے!

جو کوئی تجھ سے مقمّر سے رکھے ہے بازی		نقدِ دل اپنا وہ اک آن میں ہار اٹھتا ہے

آ جھمکتا ہے وہیں خونِ دل آنکھوں میں مری		ناگہاں جیسے کبھی ابرِ بہار اٹھتا ہے

پُربجاں آئے ہیں ہم ہاتھ سے ناداری کے		جب ہو دکان سے بنیے کی اُدھار اٹھتا ہے

تاب و طاقت ہے کہاں ہم میں تو اب اٹھنے کی		ہاں مگر دل سے کبھی نالۂ زار اٹھتا ہے

مصحفی کے تئیں، کیا جانے ترا کیا ہے خیال
سوتے سوتے تجھے اکثر یہ پکار اٹھتا ہے

۶۳۰

کاہیکو ترے دام سے آزاد ہو کوئی؟		کیا یاں سے بھی اڑ کر کہیں برباد ہو کوئی؟

گلبن کے تلے جائیو، بلبل! تو سمجھ کر
ایسا نہ ہو واں گھات میں صیّاد ہو کوئی

گل چاک گریباں ہے تو سنبل ہے پریشاں
اس گلشنِ ناشاد میں کیا شاد ہو کوئی؟

بس مرتبۂ عشق ہوا ختم انھیں پر
من بعد نہ مجنوں ہو، نہ فرہاد ہو کوئی

تم بھیجو گے ہم پاس، میاں! کاہیکو قاصد
قاصد تو وہ بھیجے کہ جسے یاد ہو کوئی

کیا پوچھو ہو یارانِ عدم رفتہ کا احوال
ان یاروں سے حاشا کہ مجھے یاد ہو کوئی

کر لے ابھی، اے دل! تجھے ارمان نہ رہ جائے
سینے میں اگر اور بھی فریاد ہو کوئی

البتہ گرفتاری میں آزاد رہے وہ
مجھ سا ہی اگر مردمِ آزاد ہو کوئی

چھوڑا نہ میاں مصحفیؔ تم نے کوئی لونڈا
تم کام میں اپنے غرض استاد ہو کوئی

۶۳۱

سخت نازک ہے ترا موے کمر رشتے سے
اس کے واقف ہو، میاں! کیا کوئی سر رشتے سے

ہووے ان تارِ گریباں کی قسم ہی گل کے
باغباں! باندھے تو گلدستہ اگر رشتے سے

زخم پیوند رفو گر سے نہ ہو عاشق کا
پیچکِ زلف سیے اس کو مگر رشتے سے

اب کے کیا جانیے اس بند سے کیوں کر چھوٹیں
بے طرح باندھے ہیں صیّاد نے پر رشتے سے

ان سے کیا فائدہ ہے اس کے سرِ زلف کا ذکر
وے جو واقف ہی نہیں بات کے سر رشتے سے

اشک کا تار نہ کر صرفِ قبا دوزیِ دل
کفنِ مردہ کو سیتے نہیں تر رشتے سے

روز و شب طولِ امل کا ہوں گرفتار کہ ہے
دلقِ درویش کو کام اٹھ پہر رشتے سے

رشتہ داری نہیں کچھ خوب، تو گر آپ کو گم
کر کے سوزن کی طرح قطعِ نظر رشتے سے

اشک مژگاں سے ٹپکتے ہیں مری پے در پے
مصحفیؔ گرتے ہیں جس طرح گہر رشتے سے

۶۳۲

جان کر زلف کیا ہم نے حذر رشتے سے
سانپ کے کاٹے کو لگتا ہی ہے ڈر رشتے سے

گہ کمر کا تو گہے زلف کا کرتے ہو بیاں
بات کہتے ہی نہیں تم کبھی سر رشتے سے

کیا ہی دلچسپ ہے دانتوں کی ترے تبسی
ٹانک رکھے ہیں کہے تو، یہ گہر رشتے سے

جی میں ہے کیجے گریباں کے تئیں اتنا چاک
کہ رفو ہو نہ کبھی بارِ دگر رشتے سے

ڈورے کا نہ پہن جامہ کہ میں ڈرتا ہوں
تنِ نازک کو ترے پہنچے ضرر رشتے سے

اس قدر چاکِ گریباں کے مرے ہے مصروف
کہ نہیں سوزنِ عیسیٰ کو خبر رشتے سے

کیا ستم تو نے کیا؟ مجھ کو کھلا خط بھیجا
کچھ بھی واقف ہے مروّت کے تو سر رشتے سے

گر کمر بند بھی ہوتا نہیں تو رسم ہے یوں
باندھ دیتے ہیں ذرا خط کی کمر رشتے سے

مصحفی اشک یہ مژگاں پہ نہیں سرخ و سپید
منعقد ہیں کئی یاقوت و گہر رشتے سے

۶۳۳

جگر چھن گئے اس کی پلکوں کے ہلتے
ہم اے کاش اُن انکھڑیوں سے نہ ملتے

مرے داغ دیکھو، غضب تھا چمن میں
گر اس رنگ کے بھی کئی پھول کھلتے

جو دامن کشاں تو، چمن میں نہ آتا
صبا سے کہیں کُل کے غنچے نہ کھلتے

وے دلّی کے کوچے ہیں اب سارے خالی
کھوے سے کھوے تھے جہاں روز چھلتے

غضب تھا اگر نیزہ درانِ مژگاں
اُٹھا گھوڑے یکبارگی تم پہ پلتے

میاں! عید کے دن تو بیجا نہ تھا کچھ
جو تم مصحفی سے گلے لگ کے ملتے

۶۳۴

ان گرم نگاہوں سے تری کوہ بھی جل جائے
تو دیکھے جو یکبار تو پتھر بھی پگھل جائے

آرام ہو آئندہ کو اور رنت کا خلل جائے
دل آب ہو سینے سے مرے کاش نکل جائے

کرتا ہے وضو شیخ لبِ حوض پہ بیٹھا
ایسے میں تماشا ہو جو پانو اس کا پھسل جائے

جس آگ میں جلتا ہے پڑا نعلِ دل اپنا
پتھر بھی اگر رکھیے تو اس آگ میں جل جائے

حسرت تو مجھے یہ ہے کہ با ایں ہمہ خواہش
آغوش میں کھینچوں اُسے اور یوں وہ نکل جائے

اک قطرۂ خوں ٹپکے گر آنکھوں سے ہماری
واللہ زمانے کا ابھی رنگ بدل جائے

گہہ سبزے کو دیکھوں ہوں، گہے آبِ رواں کو
تا یہ دلِ غم دیدہ اسی طرح بہل جائے

اک روز تو کر مصحفی اپنے کی عیادت
شاید تری پرسش سے یہ بیمار سنبھل جائے

۶۳۵

ٹھکراتے طرفِ دامن بندِ قبا کو ملتے
کچھ آج زور سج سے آتے ہو دھج بدلتے

دے دن کدھر گئے اب، جو وعدہ گہ میں اکثر
ہم ہوتے منتظر اور تم وو ہیں آ نکلتے

یا پاس سے ہم اس کے اب آپ بھاگتے ہیں
یا ایک دن وہ تھا جو ٹالے ہوئے نہ ٹلتے

شعلے میں شمع کے گر جلوہ ترا نہ ہوتا
پروانے صدقے ہو ہو اس پر سے یوں نہ جلتے

آنے کی مصحفی کے سن کر خبر شتابی
کل رہ گئے گلی سے ہم اس کی، چلتے چلتے

۶۳۶

انگشتری جو دی ہے، مرے یار! پھینک دے
میں ہوں ادھر کھڑا، پسِ دیوار پھینک دے

آوے تو مرکے میں تو صورت کو تیری دیکھ
رستم بھی اپنے ہاتھ سے تلوار پھینک دے

آیا ہوں پھرتے پھرتے پہ ڈر ہے یہی کہ یار
کیا جانے پھر کدھر کو بہ یکبار پھینک دے

کیا ہووے باغباں جو تو گلشن سے چن کے گل
بلبل کے آشیاں میں بھی دو چار پھینک دے

کس کام کا یہ دل ہے مرے پاس، اے میاں
تو سر سے وار کر یہ دلِ زار پھینک دے

ہووے نہ اس کا پائے طلب ریش پھر کبھی
جو راہ سے کسی کی اٹھا خار پھینک دے

دیکھے جو ایک جلوہ ترا شیخ و برہمن
یہ توڑ ڈالے سبحہ، وہ زنّار پھینک دے

کیا ظلم ہے کہ کرے ہمیں قید باغباں — اور آشیاں کو آ، سوے گلزار پھینک دے
روے زمیں پہ حسن نہیں، ہاں مگر خدا — اب آسماں سے کوئی طرح دار پھینک دے
اک ٹھیکرے پہ لکھ کے کوئی حالِ دل مرا — ایسا ہوا اس کے گھر میں شبِ تار پھینک دے
کس پاس بھیجوں دل کے تئیں، لے کے ہاتھ میں — یہ ہے وہ جنس جس کو خریدار پھینک دے
کیا ڈر ہے جو اپنے تئیں تو لی فلک — تجھ پر سے وار پھیر کے سو بار پھینک دے

ناصح نے پکڑا تیرا گریباں تو مصحفی
بھڑوے کی تو اُتار کے دستار پھینک دے

۶۳۷

تم رات وعدہ کر کے جو ہم سے چلے گئے — پھر تب سے خواب میں بھی نہ آئے بھلے گئے
رکھا قدم زمیں پہ جو اس سروِ ناز نے — پہلے قدم کے رکھتے ہی، واں دل ملے گئے
اب کس ہوس سے باغ میں دھومیں مچائیے — وہ شوق ہی نہیں رہا، وے ولولے گئے
آتش میں تیرے عشق کی مانندِ چوبِ خشک — جب تک کسی نے ہم کو جلایا جلے گئے
وعدہ تھا پشتِ بام پر اس مہ کا نیم روز — ہم ناتمام بھول گئے، دن ڈھلے گئے

رکھتا تھا مصحفی تو بہت شوقِ کوے یار
ہم ساتھ اپنے آپ ہی اس کو نہ لے گئے

۶۳۸

یہ تو آوازِ ہم صفیر ہی ہے — اس قفس میں کوئی اسیر ہی ہے
ہو چکا دورِ خسرو و فرہاد — اب نہ شیریں نہ جوے شیر ہی ہے
دشت پُر صید ہے تو کیا کیجیے — پاس اپنے کماں نہ تیر ہی ہے
دل تو اُس کو، سے کیوں نہیں اُٹھتا؟ — کیا کہیں یاں ترا خمیر ہی ہے
جل گئے ہم تو اپنی خاکستر — دیکھ لوگے ترا عبیر ہی ہے

تیری ابرو کے روبرو مہِ نو اپنی آنکھوں میں تو حقیر ہی ہے

گو کہ تو میرؔ سے ہوا بہتر
مصحفیؔ پھر بھی میرؔ میر ہی ہے

۶۳۹

بات سن لے خدا غریبوں کی اجل آوے مرے رقیبوں کی
مجھ سے تم پھر گئے بہ ایں خوبی یہ بھی خوبی مرے نصیبوں کی
وہ کہ تشخیص میں مرض کی مرے عقل حیران ہے طبیبوں کی
غنچۂ گل کی چولی مسکی دیکھ ق عقل بھولی جو عندلیبوں کی
ہائے دیکھی نہیں انھوں نے مگر وضع دلّی کے جامہ زیبوں کی
کہیں کم بختی سے جو جا نکلا ق مصحفیؔ کل طرف جیبوں کی
ان کے مرزائیوں کے ہاتھوں سے
مار اس پر پڑی جریبوں کی

۶۴۰

تسبیحِ شیخ میں گو ہو دیں ہزار دانے اپنے بھی اشک کے ہیں یاں بے شمار دانے
از بس کہ رنگِ پاں نے تزئیں کیا ہے اس کو ہیں دانت سرخ اس کے جیسے انار دانے
جوں خوشنما فلک پر لگتے ہیں عقدِ پرویں رکھتا ہے موتیوں کے، کانوں میں یار دانے
زیرِ فلک ہے ہم پر وہ اضطراب پیدا جوں آسیا کے نیچے ہوں بیقرار دانے
ہیں جیسے اشکِ گلگوں، اے مصحفیؔ، ہمارے
یاقوت کے رکھیں ہیں، کب یہ بہار دانے

۶۴۱

لینے لگے جو چٹکی یکبار بیٹھے بیٹھے یہ چھیڑ کیا نکالی، اے یار! بیٹھے بیٹھے

کل وعدہ گاہ میں جب وہ بے وفا نہ آیا / اُکتا کے اُٹھ گئے ہم ناچار بیٹھے بیٹھے

جو کچھ پڑھا ہے ہم نے، ہم آپھی آپ اس کی / گھر میں کیا کریں ہیں تکرار بیٹھے بیٹھے

ہم نے تو اس کو ہرگز، یارو! کہا نہ تھا کچھ / کچھ یوں ہی ہو گیا وہ بیزار بیٹھے بیٹھے

تجھ بِن تو ہم نے دے بھی با خامشی ادا کیں / یاد آئیاں جو باتیں دو چار بیٹھے بیٹھے

اے مصحفی! اُنھوں میں صنعت نہیں کچھ اپنی
لکھ ڈالے ہم نے کل یہ اشعار بیٹھے بیٹھے

۶۴۲

بیٹھے بیٹھے جو ہم، اے یار! ہنسے اور روئے / آگیا یاد تو اک بار ہنسے اور روئے

شعرِ تر پڑھنے سے یاروں میں ہمیں کیا حاصل / مگر اتنا ہے کہ دو چار ہنسے اور روئے

شادی و غم کی جو اٹھ جائے جہاں سے رہ و رسم / پھر تو کوئی بھی نہ زنہار ہنسے اور روئے

ناتوانی نے کیا اس کو تو نقشِ قالیں / کیا تری چشم کا بیمار ہنسے اور روئے

مصحفی رات میں افسانۂ دل کہتا تھا
سن کے ہمسایے کئی بار ہنسے اور روئے

۶۴۳

خبر کچھ نہیں مجھ کو بسمل کی اپنے / میں صورت ہی تکتا ہوں قاتل کی اپنے

جو گزرے ہے مجھ پر سو حق جانتا ہے / حقیقت کہوں کس سے میں دل کی اپنے

نہ آئینے میں اس نے پھر عکس دیکھا / لی اپنی ہی صورت مقابل کی اپنے

کوئی لوٹتا ہے، کوئی پیٹتا ہے / غرض طرفہ حالت ہے محفل کی اپنے

وہیں خفتگانِ عدم چونک اٹھیں گے / جو جھنکار پہنچی سلاسل کی اپنے

کیا زخمیِ غمزہ اور پھر نہ پوچھا / خبر زور لی تم نے گھایل کی اپنے

زمیں بوجھ کیونکر ہمارا اٹھا دے / فلک کو نہیں تاب محمل کی اپنے

اسے مردمِ دیدہ کیونکر نہ سمجھے
سیاہی تُو تو، دیکھ ٹک تل کی اپنے
میاں مصحفی تجھ سے کیا مانگتا ہے
سدا تو بھلا سن لے سائل کی اپنے

۶۴۴

پوچھا جو ہم نے اس سے کل، "تیرا نام کیا ہے؟"
کہنے لگا "تجھے کیا؟ چل، تجھ کو کام کیا ہے؟"
جو ٹھوکروں کے مارے پامال ہو گئے ہیں
کوئی پُوچھے اس سے اس کی طرزِ خرام کیا ہے
مستغرقِ تصوّر کیا ہو رہا ہے، اے دل!
ٹک سر اٹھا کے تو دیکھ، بالائے بام کیا ہے
ہم نامہ دے چکے ہیں قاصد کو اپنے، تو کہہ
جانِ بلب رسیدہ تیرا پیام کیا ہے؟
اس نازنیں کی تصویر جو دیکھے ہے کہے ہے
"اس نیم رخ کے آگے ماہِ تمام کیا ہے"
کہتا تھا تو، "تو، اے دل! میں ہو چکا ہوں تسکیں
پھر اضطراب سا یہ ہر صبح و شام کیا ہے
ہونا تھا مصحفی پر جو، ہو چکا، عزیزو!
اب لاش پر پھر اُس کی یہ ازدحام کیا ہے

۶۴۵

گالی سے لبِ شیریں کو بس تلخ نہ کیجے
جو گرٹّ دیے مرتا ہو اُسے زہر نہ دیجے
رستے میں جو مل جائے وہ بت ہم کو، خدا کا ر
مسجد کی طرف جانے کا پھر نام نہ لیجے
جائیکہ گل و لالہ ہوں سب چاک گریباں
بیداد ہے گر اپنے گریبان کو سیجے
کھانا کبھو اس غم کا نہ ہو ہم کو گوارا
اوپر سے جو خونابِ جگر اس کے نہ پیجے
آہن مرے گریے سے ہوا آب و لیکن
اے مصحفی! یہ سنگ دلاں بت نہ پسیجے

۶۴۶

نہا کر جب وہ اپنے سر کے بالوں کے تئیں جھاڑے
بجائے خار و خس موتی ہی رولے جو زمیں جھاڑے

تو اے نورِ نظر! جس جا قدم اپنا رکھا چاہے
ہر اک خوش چشم واں جاروبِ مژگاں سے زمیں جھاڑے

نمودِ سجدہ ہے منظور، خاک ایسی نماز اوپر
نہیں ممکن کہ زاہد جیتے جی گردِ جبیں جھاڑے

یہ سب دامن درازاں بھول جائیں رقص کرنے کو
جو ہو کر دست افشاں عاشق اپنی آستیں جھاڑے

نظر آدیں پڑے بھٹّے سے سرپانو میں یاروں کے
ابھی دو دو پٹے کے ہاتھ اگر وہ نازنیں جھاڑے

کیا کر خاک رُوبی مصحفی ایسے کے تو، در کی
کہ جس کے واسطے رُوح الامیں عرشِ بریں جھاڑے

۶۴۷

ہر اک نے نگاہوں سے مجھے ڈال دیا ہے
کیا میرے تئیں عشق نے اقبال دیا ہے

ترکیب تو دیکھو اس کے خوش اسلوب بدن کی
جیسے کہ وہ سانچے سے ابھی ڈھال دیا ہے

میں ہوں وہ گنہگار کہ غیرت نے ابھی سے
ہاتھوں میں مرے نامۂ اعمال دیا ہے

ہنستے ہو تو اچھی ہی طرح مجھ پہ ہنسو نہ
یوں منہ میں، میاں! کاہیکو رومال دیا ہے؟

ہر لحظہ گرفتار ہوں اک تازہ الم میں
یہ عشق کہ جی کو مرے جنجال دیا ہے؟

سوغات میں کی ہیں، میاں! بادِ صبا کی
تب زلف کا تیری کہیں اک بال دیا ہے

ہم بھی گہرِ اشک کی دولت سے غنی ہیں
گو چرخ نے اوروں کو زر و مال دیا ہے

رہتا ہے فقیروں کی طرح نت وہ پریشاں
اپنا جسے زلفوں نے تری جال دیا ہے

بندے ہیں تمھارے، کوئی ہر اک کو خدا نے
یہ حسن، یہ نقشا، یہ خط و خال دیا ہے

اے مصحفی! اس شوخ کی باتوں پہ نہ جانا
لاکھوں کو لگا اس نے یونہیں ٹال دیا ہے

۶۴۸

رات کے رہنے کا نہ ڈر کیجیے
ایک تو شب یاں بھی سحر کیجیے

لوگ کہیں گے تمھیں 'ہرجائی ہے'
دل میں اک عالم کے نہ گھر کیجیے

دیکھتے ہو میری طرف کیا، میاں! — اپنی بھی صورت پہ نظر کیجیے
آہی لیا بے خبری نے ہمیں — کون ہے یاں کس کو خبر کیجیے
غیر کو جا دیتے ہو گھر میں اگر — میرے تئیں شہر بدر کیجیے
دیکھ نگاہیں تری کہتی ہے خلق — ایسی نگاہوں سے حذر کیجیے
پھر نہیں ملنا ترا مشکل، میاں! — جان کا گر اپنی ضرر کیجیے

منزلِ ہستی میں بہت ہم رہے
مصحفی اب یاں سے سفر کیجیے

۶۴۹

دل سینے میں بیتاب ہے، دلدار کدھر ہے؟ — کوئی مجھ کو بتا دو، وہ مرا یار کدھر ہے؟
ہم کب کے چمن زار میں بیہوش پڑے ہیں — معلوم نہیں گل کدھر اور خار کدھر ہے؟
اس گل کا پتا گر نہیں دیتے ہو تو، یارو! — اتنا تو بتا دو، درِ گلزار کدھر ہے؟
دل چھیننے والے کوئی گھر بیٹھ رہیں ہیں! — پوچھیں ہیں یہی رستۂ بازار کدھر ہے؟
دیکھا مجھے کل اس نے، تو غیروں سے یہ بولا — "لاؤ بھی شتابی، مری تلوار کدھر ہے؟"
یاں ہو رہا ہے سینہ مرا آگو ہی چھلنی — ڈھونڈے ہے کہاں تیر کو سوفار کدھر ہے؟
احوال نپٹ تنگ ہے بیمار کا تیرے — اس وقت تو، اے آئنہ رخسار کدھر ہے؟
شیریں سخناں سب ہی شکر بیچیں ہیں لیکن — انصاف کرو، جوششِ خریدار کدھر ہے؟

برسوں نہ ملے اس سے تو اس شوخ نے ہم کو
پوچھا نہ کبھی، "مصحفیِ زار کدھر ہے؟"

۶۵۰

کس طرح شامِ فراق اپنی سحر ہوتی ہے — دیکھیے آج کی شب کیونکہ بسر ہوتی ہے
چشمِ بیمار کا کوئی اس کی، سبب مت پوچھو — خوب رو کے تئیں البتہ نظر ہوتی ہے

اس کے کوچے میں کیے ہم نے بہت سے نالے
پر نہ پوچھا کبھی، یہ دھوم کدھر ہوتی ہے

شیخ جی! چھیڑو نہ بدمستوں کو گھر کو جاؤ
بات یاں ورنہ ابھی نوعِ دگر ہوتی ہے

درمیاں سب کے ہے اور کچھ نہیں ہوتی معلوم
ہائے یارو! کہیں ایسی بھی کمر ہوتی ہے

ایسا آسان نہیں معنیٔ رنگیں کا تلاش
ایک اک بیت بصد خونِ جگر ہوتی ہے

شبِ ہجراں میں تری، شمع نمط عاشق کی
آستیں دیدۂ نمناک سے تر ہوتی ہے

تو نے جو کچھ کہ کہا، یار! کہوں گا میں تمام
مصحفیؔ! اس سے ملاقات اگر ہوتی ہے

۶۵۱

نہ چھو، پیارے! کہ تیری زلف کا ہر تار نازک ہے
تو، کافر بل نہ دے اس کو، کہ یہ زنّار نازک ہے

نہ ہو کیونکر کوئی شاکی تری باریک مژگاں سے
چبھے ہے اس قدر ہی جس قدر یہ خار نازک ہے

گل و نسرین و سنبل ہیں سبھی نازک تر از نازک
نہ تنہا اس چمن کی نرگسِ بیمار نازک ہے

ترے چہرے کے ہنگامِ تماشا دل دھڑکتا ہے
نگاہیں سخت ہیں بیباک اور رخسار نازک ہے

نہیں تم ذبح کر سکتے جو ہم کو، یہ تو بتلاؤ
تمھارے ہاتھ ہی نازک ہیں یا تلوار نازک ہے

نزاکت عاشق اور معشوق کی یکساں نہیں ہوتی
مری گفتار نازک ہے، تری رفتار نازک ہے

نہیں تشبیہ دے سکتے ہم اس کو رشتۂ جاں سے
زبس اے مصحفیؔ، موے میانِ یار نازک ہے

۶۵۲

ناتوانی سے تلاشِ سوختن میں مر گئے
شمع تک پہنچے نہ پروانے، لگن میں مر گئے

ہر سخن اوپر تو کیوں کھینچے ہے اب تلوار کو
ہم تو، میری جان! تیرے اک سخن میں مر گئے

وقت خوش ان ہم صفیروں کا کہ ہنگامِ بہار
بے غمِ دام و قفس صحنِ چمن میں مر گئے

دے جو جاں برکف لیے پھرتے تھے کتنے تشنہ لب
آخر آخر حسرتِ چاہِ ذقن میں مر گئے

مصحفیؔ عشقِ بتاں کا پوچھ مت کچھ ماجرا
ہم سے کتنے یار اس دیوانپن میں مر گئے

۶۵۳

نہ باہر ہی اسے آرام ہے ہرگز نہ گھر ٹھہرے
وہ طفلِ شوخ کیا معنی جو ٹک اک جا پہ ٹھہرے

صفائی میں ہیں تیرے لعلِ لب کے مشتری حیراں
کہے قیمت تو کوئی تب کہ جب اس پر نظر ٹھہرے

جوابِ نامۂ عاشق کبھی حاصل نہ ہو اس سے
اگر عمرِ ابد تک پاس اس کے نامہ بر ٹھہرے

کہوں کیا اشک اپنے کی خوش آبی اور غلطانی
نہ دل، نے چشم، نے مژگاں کے اوپر یہ گہر ٹھہرے

میں مفلس ہو رہا ہوں، دل کی بیتابی کے ہاتھوں سے
یہی بسمل ہے اب اکسیر گر ٹک آگ پر ٹھہرے

زبس اے مصحفی تھا ہیچ عرصہ زندگانی کا
جہاں میں آن کر ہم یک دو ساعت جوں شرر ٹھہرے

۶۵۴

راہ میں جاتے دوچار اک تازہ آفت ہو گئی
پوچھتے کیا ہو کہ ہم پر کل قیامت ہو گئی

پیچھے پھر پھر دیکھتا جاتا ہوں اور بھاگوں ہوں میں
اپنے سایے سے بھی اب تو مجھ کو وحشت ہو گئی

ہائے روزِ حج اگر بھی رہے غش ہی کے بیچ
ہم نہ جیتے اور کعبے کی زیارت ہو گئی

نوچ ڈالا اپنا چہرہ ہم نے ناخن سے تمام
منہ چھپاتے ہی ترے یاں اور ہی صورت ہو گئی

کیا رہا تھا مجھ میں پیارے تیرے ہنگامِ وداع
اک ذرا سی جان تھی سو وہ بھی رخصت ہو گئی

سر اٹھاؤں کیونکہ زانو سے کہ اٹھتا ہی نہیں
کیا کروں زانو سے اس سر کو محبت ہو گئی

جب تلک بیٹھا تھا تو، تھے اہلِ مجلس ہوش میں
تو ادھر اٹھ کر گیا یاں غش کی حالت ہو گئی

غیر کرتے ہی رہیں ہیں تم سے ہر دم بات چیت
ہم بھی گر بولے تو ایسی کیا قیامت ہو گئی

گردمِ آخر بہ حسرت جان دی میں نے تو کیا
ایک دم کی یہ بھی اے یار داذیت ہو گئی

اس کو ہم اپنی طرف سے پھر نہیں کرتے ہیں ترک
جس سے ٹک اک بار بھی صاحب سلامت ہو گئی

شب جو داڑھیں مار روئے ہم تو نقصاں کیا ہوا
بارے اس رونے سے دل کو تو فراغت ہو گئی

یوں رہے بیمار ہی نت لیک بعد از سال و ماہ
جوں ہی ٹک دیکھا تجھے اور ہم کو صحت ہو گئی

اک نگاہِ لطف کو ہم نت ترستے ہی رہے
گو یہ جانِ ناتواں بے تاب و طاقت ہو گئی

جانِ من! تُو تو توانا ہے، تجھے کیا اس کا غم
گو یہ جانِ ناتواں بے تاب و طاقت ہوگئی

فصلِ گُل سو بار آئی، ہم نہ چھوٹے قید سے
ہم کو اس کنجِ قفس میں رہتے مدّت ہوگئی

ہاے کعبے سے پھرا اب تک نہ ہرگز مصحفی
اس کو واں کیا جانیے کس سے محبّت ہوگئی

۶۵۵

لیتے ہی بوسہ ہو گئے بیزار کس لیے؟
تم کو کیا تھا اور بھلا یار کس لیے؟

فصلِ بہار آئی گئی، اب قفس کے بیچ
پھڑکیں ہیں طائرانِ گرفتار کس لیے؟

زخمِ نخست ہی میں مرا ہو چکا ہے کام
اب دمبدم لگاتے ہو تلوار کس لیے؟

پیارے! جو تم کو شوق نہیں تاک جھانک کا
پھر وا رہیں ہیں رخنۂ دیوار کس لیے؟

آئینہ لے کے دیکھو ٹک اپنے جمال کو
صحبت کا شب کی کرتے ہو انکار کس لیے؟

کیا ایسی سخت جانی ہے مرجاتے کیوں نہیں
تیرے مریض کھینچیں ہیں آزار کس لیے؟

بے مہر و بے وفا! نہ محبّت کا تجھ میں نام
کر تجھ سے دوستی کوئی ہو خوار کس لیے؟

گزری سو گزری اپنے اوپر اس کے غم کے بیچ
کہیے کسی سے دردِ دل اظہار کس لیے؟

سو بار دھولیں کھا چکے مسجد میں شیخ جی
پھر باندھ باندھ آتے ہو دستار کس لیے؟

اس نے تو اپنے مکھڑے اوپر ڈال لی نقاب
پھر اب کھڑے ہیں طالبِ دیدار کس لیے؟

اے مصحفی جو یار تجھے پوچھتا نہیں
جاتا ہے دوڑ دوڑ تو ہر بار کس لیے؟

۶۵۶

خیالِ صید جو وہ عنبریں کمند کرے
تو حلقے حلقے میں لاکھوں ہی دل کو بند کرے

نفس بھی کھینچتے اب جی مرا دھڑکتا ہے
مبادا آتشِ دل شعلہ پھر بلند کرے

ہے صرفہ مجھکو اب اس میں کہ اے ملامت گو!
تو ہم کو کچھ نہ کہے ترک وعظ و پند کرے

حدیثِ شکوہ، میاں! منہ پر آخر آتی ہے — کہاں تلک کوئی اپنی زباں کو بند کرے؟
تو آکے بیٹھے دمِ نزع جس کی بالیں پر — وہ مر بھی جائے تو آنکھیں نہ اپنی بند کرے
بغل میں جس کی کہ دل جیسا پکّا پھوڑا ہو — پھر آہ آہ نہ کیونکر وہ دردمند کرے؟

ہمیں تو چاہ نہیں مصحفیؔ کچھ اس دل کی
ہے نذر اس کی یہ دل اس کو جو پسند کرے

۶۵۷

وہ جس دم ہاتھ اپنا قبضۂ خنجر پہ رکھتا ہے — تکلّف برطرف منّت ہمارے سر پہ رکھتا ہے
ہوا تو دیدہ و دانستہ، اے دل! زخمیِ مژگاں — کوئی بھی پانو نوکِ نیزہ یا نشتر پہ رکھتا ہے؟
ترے ہر استخوانِ زار، یوں سلگے ہے دل اپنا — کہ جیسے خار و خس لا کر کوئی اخگر پہ رکھتا ہے
اگر غیروں سے خلوت میں نہیں مشغول وہ پیارا — تو پھر کس واسطے دربان اپنے در پہ رکھتا ہے
بصد بے طاقتی ہوتا ہے مانا نقشِ قالیں سے — قدم بیمار تیرا جس گھڑی بستر پہ رکھتا ہے
بسانِ آئنہ صورت پرستی کام ہے کتنا — ولیکن صاحبِ معنی نظر جوہر پہ رکھتا ہے

یہ حالِ مصحفیؔ ہے تجھ بن اب گریے کی شدّت سے
کہ دن میں سیکڑوں رومال چشمِ تر پہ رکھتا ہے

۶۵۸

کیونکہ مژگاں کو تری، تیزیِ نشتر پہنچے — جس کی خونریزی کو تلوار نہ خنجر پہنچے
عشق کی منزلِ اوّل بھی بڑی منزل تھی — واں تلک پہنچے تو ہم، یار! پہ مر کر پہنچے
دیکھنا کم نگہی کیجیو مت، اے ساقی! — بزمِ عشاق ہے مے سب کو برابر پہنچے
اعتدال اس قدِ رعنا کا بیاں کیا کیجے — جس کی خوبی کو نہ سرو اور نہ صنوبر پہنچے
گردشِ چشم کبھی، مشفقِ من! ادھر بھی — بارے اس دور میں اک ہم کو بھی ساغر پہنچے
جس گلی میں کہ فرشتے کے بھی پر جلتے ہوں — کب یہ ممکن ہے کہ واں اڑ کے کبوتر پہنچے

مصحفی میں ہوں زخود رفتہ تو وہ بے پروا
خبر احوال کی میرے اُسے کیوں کر پہنچے؟

۶۵۹

جس گلی میں نہ صبا اور نہ کبوتر پہنچے
مشتِ خاک اپنی کی طاقت ہے کہ اُڑ کر پہنچے!

یار ہم بادہ نہ ہو اپنا تو کر کے اُسے یاد
روئیے اتنا کہ خوں تا لبِ ساغر پہنچے

آ گیا ہاتھ میں گر اب کے گریباں اپنا
چاک وہ دیجے کہ تا دامنِ محشر پہنچے

میں تڑپنے لگوں جب کھا کے ترا تیر اے کاش!
تو شتابی سے لیے ہاتھ میں خنجر پہنچے

سینہ بے طرح میں کوٹوں ہوں غمِ دوری سے
مجھ کو یہ ڈر ہے کہیں صدمہ نہ دل پر پہنچے

اُس کی مژگاں نے کیا دل کا مرے کام تمام
کیا جیے جس کی رگِ جاں پہ نشتر پہنچے

مصحفی اتنا میں رویا کہ شبِ ہجراں میں
اشک آنکھوں سے گریباں تئیں بہہ کر پہنچے

۶۶۰

ہر آن میں گالی دے ہر اک بات میں جھنجلائے
اک یار ملا ہم کو سو اس وضع کا اے وائے!

کیا وجہ بتاؤں تمھیں اس زردیِ رُخ کی
رنگ اس کا یہی ہے جو کوئی خونِ جگر کھائے

گر آبِ رواں سروِ قدِ یار کو دیکھے
جوں دیدۂ آئینہ رہے محوِ سراپائے

کام اس سے پڑا مجھ کو جو تصویر کے مانند
میری ہی سنے گا ہے نہ کچھ اپنی ہی فرمائے

تلواریں ہی آتی ہیں نظر چاروں طرف سے
جا کر صفِ مژگاں میں یہ دل کیونکہ نہ گھبرائے

اے مصحفی جب چوہی پڑا اشک کے مانند
فریاد مرے دل سے یہی نکلی کہ دل ہائے

۶۶۱

بوند اشک کی اک تازہ نت آن نکلتی ہے
ان آنکھوں سے موتی کی اب کھان نکلتی ہے

از بس کہ کبھی اس نے یاں تیر لگائے ہیں — دل ڈھونڈوں تو سینے سے پیکان نکلتی ہے

تو نزع میں آ جس کو دیدار دکھا دے ہے — پھر آنکھوں سے جان اس کی آسان نکلتی ہے

کیا بیٹھنا، کیا اٹھنا، کیا بولنا، کیا ہنسنا — ہر آن میں کافر کی اک آن نکلتی ہے

جب گھر سے وہ نکلے ہے بن ٹھن کے کبھی باہر — اس وقت تو پھر اور ہی کچھ شان نکلتی ہے

اے مصحفی، ہجراں بھی اک طرفہ اذیت ہے
نے یار ہی ملتا ہے، نے جان نکلتی ہے

۶۶۲

جلوہ گر یار کا قامت ہے، خدا خیر کرے — حق میں عاشق کے قیامت ہے، خدا خیر کرے

دل مرا اور ترا آج جو مل بیٹھا ہے — شیشہ و سنگ کی صحبت ہے، خدا خیر کرے

صاف بگڑا ہوا آتا ہے مرا آئنہ رو — آج کچھ اور ہی صورت ہے، خدا خیر کرے

عشق میں اس کے جو بدنام مجھے کرتے ہیں — یہ بُری طرح کی تہمت ہے، خدا خیر کرے

نہیں منہ موڑتی زنہار وہ تیغِ ابرو
مصحفی سر پہ بلا آفت ہے، خدا خیر کرے

۶۶۳

گر جدا ٹک بھی یار ہوتا ہے — دل بہت بے قرار ہوتا ہے

تلخ و شیریں سے کچھ جہاں کے نہ پوچھ — ہم کو سب کچھ گوار ہوتا ہے

دل کو پالو تلے کھندلنا واہ! — کیوں جی ایسا ہی پیار ہوتا ہے؟

عشق سے ہجر میں گلہ کیا ہے — مے کا آخر خمار ہوتا ہے

کاش ہو خاک اس گلی کی یہ دل — جس میں تیرا گزار ہوتا ہے

لیجو، اے ناخدا! کہ یہ دل بھی — اب کے کھیوے میں پار ہوتا ہے

مصحفی اب وہ آن نکلے گا ق — اس کا یاں نت گزار ہوتا ہے

ٹھہر تو ٹک تو دم لے دیوانے
اتنا کیوں بے قرار ہوتا ہے؟

۶۶۴

گل کترے نہ بلبل مری فریاد کے آگے
سرسبز ہو شاگرد کب اُستاد کے آگے؟

دیرے، اے ملک الموت! کہ اس کوہ کنی کا
ہے کام بہت سا ابھی فرہاد کے آگے

گلشن سے اُڑا کر کے، صبا! میرے پر و بال
مرجاؤں تو لے جائیو صیّاد کے آگے

نخچیر سے تا صیدِ حرم فرق نہ سمجھے
آجائے جو کچھ اُس ستم ایجاد کے آگے

گو یار نے تلخ اُس کو کہا لیک تو قاصد!
یہ حرف نہ کہیو دلِ ناشاد کے آگے

تقصیر اگر کی ہے تو اس شوخ کی، یارو!
کیوں مجھ کو لیے جاتے ہو جلّاد کے آگے؟

نے ذکر ہے، نے شغل ہے، نے یادِ خدا ہے
سب بھول گئے ہم تو تری یاد کے آگے

بد مصحفی کو شیخ جی پیچھو ہی کہو تھے
اب بولتے تم کیوں نہیں داماد کے آگے؟

۶۶۵

ہے تجھ پہ تو زور ہی آن صدقے
صدقے ترے میری جان صدقے

کیا چیز جو کیجیے جان صدقے
تجھ پر سے کروں جہان صدقے

مژگاں پہ تری خدنگ قرباں
ابرو پہ تری کمان صدقے

وہ ماہ ہے تو، کہ جس کے اوپر
ہوتا ہے نت آسمان صدقے

رخسار ترے وے گل ہیں جن پہ
کیجے گل وار غوان صدقے

اے مصحفی تو نے ریختے میں
پائی ہے عجب زبان صدقے

٦٦٦

فراغت میں بتاں کی صورتِ دلخواہ یاد آوے
پڑے جب کچھ مصیبت تب ہمیں اللہ یاد آوے

بیاباں در بیاباں ہر طرف آوارہ پھرتے ہیں
نہیں بھولے ہوئے ایسے کہ ہم کو راہ یاد آوے

حقیقت دردمند ایسے کی سن کر کیا کوئی خوش ہو
کہ جس کو بات کہتے ہر سخن پر آہ یاد آوے

سنا کہیں ذکر یوسف کا تو میرے دل میں تو، گزرا
سخن جیسے بتقریبِ سخن ناگاہ یاد آوے

نہ ہنسنا بولنا نے اس طرف گاہے نظر کرنا
بھلا کس بات پر ہم کو، تمہاری چاہ یاد آوے

ہم اٹھ کر خواب سے تیری گلی کا قصد کرتے ہیں
گدا کو صبحدم جوں بارگاہِ شاہ یاد آوے

اسی کے نور سے تھا کلبۂ احزاں مرا روشن
شبِ غم کیوں نہ مجھ کو ہر گھڑی وہ ماہ یاد آوے

نت اس کی بزم میں اے مصحفی ہے ذکر غیروں کا
یہ کیا معنی جو گاہے بندۂ درگاہ یاد آوے

٦٦٧

ناچار ہو دین و دل اس شوخ کو دے گزرے
جو ہم پہ پڑی آکر اس عشق میں کہے گزرے

ہم جن کے سرِ رہ میں اک عمر سے بیٹھے ہیں
افسوس کہ اک دن بھی ایدھر سے نہ وے گزرے

دی اس نے اگر ہم کو دشنام بہانے دل
ہم مثلِ غرض منداں وو ہیں اُسے لے گزرے

ہر وقت جواب ہم کو تم گالیاں دیتے ہو
نہیں ہم بھی، میاں صاحب! ایسے تو گئے گزرے

رفتار پہ خوباں کی، اے مصحفی! مت جانا
پامال کیا عالم جس راہ سے یے گزرے

٦٦٨

ہے ماہ کہ آفتاب کیا ہے؟
دیکھو تو تہِ نقاب کیا ہے؟

میں نے تجھے تو نے مجھ کو دیکھا
اب مجھ سے تجھے حجاب کیا ہے؟

آئے ہو تو کوئی دم تو بیٹھو
اے قبلہ! یہ اضطراب کیا ہے؟

اُس بن ہمیں جاگتے ہی گزری | جانا بھی نہ یہ کہ خواب کیا ہے؟
مجھ کو بھی گنے وہ عاشقوں میں | اس بات کا سو حساب کیا ہے؟
سیپارۂ دل کو دیکھ اس نے | پوچھا بھی نہ یہ کتاب کیا ہے؟
اس میکدۂ جہاں میں، یارو! | مجھ سا بھی کوئی خراب کیا ہے؟

قسمت میں ہماری مصحفی، ہائے!
کیا جانے ثواب عذاب کیا ہے؟

۶۶۹

آئے ہو تو یہ حجاب کیا ہے؟ | مُنہ کھول بھی دو، نقاب کیا ہے؟
سینے میں ٹھہرتا ہی نہیں دل | یارب، اسے اضطراب کیا ہے؟
کل تیغ نکال مجھ سے بولا | تو دیکھ تو اس کی آب کیا ہے؟
معلوم نہیں کہ اپنا دیواں | ہے مرثیہ یا کتاب، کیا ہے؟
جو مر گئے، مارے لطف ہی کے | پھر اُن پہ، میاں عتاب کیا ہے؟
اوروں سے تو ہے یہ بے حجابی! | مجھ سے ہی تجھے حجاب کیا ہے؟

اے مصحفی! اٹھ یہ دھوپ آئی
اتنا بھی، دوانے، خواب کیا ہے؟

۶۷۰

مانی ان ابروؤں کی تصویر کھینچتا ہے | خورشید پر دو دستی شمشیر کھینچتا ہے
دل زلف کی طرف کو کیونکر کھنچا نہ جاوے | کوئی اس طرف سے اس کی زنجیر کھینچتا ہے
رہنے دے تا کہ دل کو ہو اک ذرا تسلّی | پہلو سے میرے، ظالم! کیوں تیر کھینچتا ہے؟
ہے یہ بھی بس کہ گاہے یہ دل بتاں کے غم میں | دو چار نالے ہو کر دلگیر کھینچتا ہے

کل مصحفی کہاں اور تیمارداری اُس کی
تا صبح اور بھی یہ تاخیر کھینچتا ہے

٦٧١

خط آیا وہ ادا نہ وے اطوار رہ گئے
عشاق تھے ہزار سو دو چار رہ گئے

صحبت پہ گل کی شور نہ کرا تنا، عندلیب!
اپنے بھی پاس کتنے طرحدار رہ گئے

ناگہ جو اُس کے چہرے سے پردہ اُلٹ گیا
جانے سے راہ مردمِ بازار رہ گئے

تیری گلی وہ جا ہے جہاں آ کے رات کو
اکثر لباسِ فقر میں سردار رہ گئے

دستِ جنوں سے چاک فقط جیب ہی نہیں
دستار کے بھی دیکھو تو دس تار رہ گئے

سودا ہمارا یار سے نظروں میں ہو گیا
مُنہ دیکھتے ہی کتنے خریدار رہ گئے

ہم گزرے اس گلی سے تو بیمِ رقیب سے
آہستہ تک گلی میں ہی کھنکار رہ گئے

قاتل سے آرزو تھی کئی زخم کی ہمیں
پر ہم تو کھا کے ایک ہی تلوار رہ گئے

صیاد نے خبر ہی نہ لی، زیرِ دام ہی
آخر تڑپ تڑپ کے گرفتار رہ گئے

بلبل کا کچھ نشاں نہ رہا باغ میں مگر
دو چار آشیاں کے خس و خار رہ گئے

بخشا سبھوں کو لب نے ترے شربتِ شفا
یاروں میں اپنے، ایک ہمیں بیمار رہ گئے

اوروں کو حکم دخل ہوا تیری بزم میں
ہم سر پٹکتے ہی پسِ دیوار رہ گئے

من بعد کیا ہے فائدہ جینے کا مصحفیؔ
نے وہ جہاں کی وضع، نہ وہ یار رہ گئے

٦٧٢

قد قیام اور خرام آفت ہے
واں جو کچھ ہے تمام آفت ہے

دل دُکھا ہی کرے ہے سینے میں
یاں یہی صبح و شام آفت ہے

ہے غضب اک تو قد کا خم کرنا
تس پہ طرزِ سلام آفت ہے

دل کو سمجھائیے کہاں تک؟ ہائے!
اشتیاقِ مدام آفت ہے

نہ پیو کوئی زیادہ بادۂ عشق
اس کا تو اک ہی جام آفت ہے

کہیے کیا آفتاب تو اس کو
کوئی بالائے بام آفت ہے

آفتِ عشق ہے وہ دنیا میں
مصحفی جس کا نام آفت ہے

۶۷۳

جا کر کہے یہ حرف مرے یار سے کوئی
سر دے دے مارے ہے درو دیوار سے کوئی

پہنچے خبر بہار کی اس کو بھی، اے صبا!
ہووے جو طائرانِ گرفتار سے کوئی

تیکھے تو ہو، پہ سچ کہو اس وقت کیا کرو
تم کو گلے لگائے اگر پیار سے کوئی؟

یارو! خدا کے واسطے جینے بھی دو کہیں
جاؤ نہ بولو مجھ سے دلِ افگار سے کوئی

دیکھیں تو ہم بھی تم کو، لگاؤ نہ مہرباں
بس ڈر گیا اس آپ کی تلوار سے کوئی

میں تم سے پوچھتا ہوں بھلا اس کا کیا علاج
پھر جائے وعدہ کر کے جو اقرار سے کوئی؟

دامن تمام ہو گیا افشاں، کہاں تلک
پونچھے لہو کو دیدۂ خونبار سے کوئی؟

کیوں نام لیں کسی کا پہ یہ تو کہیں گے ہم
"کیا ہو جو بولے ہم سے گنہگار سے کوئی؟"

شمع و شراب و شاہد و ساقی ہے روبرو
کیا چاہیے اور طالعِ بیدار سے کوئی

پیچھے گلہ نہ کیجیو، پیارے! تو منہ پہ کہہ
بوسہ لیا ہو گر ترے رخسار سے کوئی

تلوار جب چلے ہے تو پھر وہ کرے ہے قتل
جیتا اگر بچے تری رفتار سے کوئی

کیوں تو نے اس کو کر دیا آزردہ مصحفیؔ
ناداں! بگاڑتا ہے طرحدار سے کوئی؟

۶۷۴

جب میری طرح تو بھی تکے راہ کسی کی
معلوم ہو تب تجھ کو میاں! چاہ کسی کی

جوں چاہیے، صحبت کی ہوس دل سے نہ نکلی
یارب نہ شبِ وصل ہو کوتاہ کسی کی

یہ عشق برا ہوتا ہے معلوم کرو گے
گاہے جو اثر کر بھی گئی آہ کسی کی

نامے کو مرے پڑھ کے لگا یار یہ کہنے
قاصد! یہ حقیقت تو ہے جانکاہ کسی کی

اے آنکھ مری شکل کا حیران رہا ہے — کیا دیکھی نہیں صورتِ دل خواہ کسی کی

جوں آئنہ وہ غمزدہ رہجاتا ہے حیراں — جب اس پہ نظر پڑتی ہے ناگاہ کسی کی

ازبس کہ تو پیارا ہے مجھے تیرے سوا یارا — سوگند میں کھاتا نہیں واللہ کسی کی

اے مصحفی تربت کا مری نام نہ لینا

گر پوچھے تو کہیو کہ ہے درگاہ کسی کی

۶۷۵

وے جو ہم لوگوں سے کرتے تھے محبت، مر گئے — جی کے دشمن رہ گئے، اہلِ مروت مر گئے

جوں ہی کی اُس خوبیِ عالم نے آکر اک نگاہ — وے جو جی اُٹھے تھے پھر روزِ قیامت مر گئے

جان کو ہم اپنی کیا رو دیں کہ اس کوچے کے بیچ — ہم سے کتنے کھینچ کر رنج و اذیت مر گئے

نعش پر زاہد کی ۔ جائے ہے بہرِ نماز — ایسے بھڑوے کتنے یاں کہلا کے حضرت مر گئے

تو جو جاتا ہے وہیں نت دوڑ دوڑ اے مصحفی

اور کیا دنیا کے سارے خوبصورت مر گئے؟

۶۷۶

بیٹھ کر وہ جہاں سے اُٹھتا ہے — ایک فتنہ وہاں سے اُٹھتا ہے

اس کو جا بیٹھنا جہاں ہوں وے — کب یہ دل دلبراں سے اُٹھتا ہے

نالہ کرتی ہے جس گھڑی بلبل — شعلہ اک آشیاں سے اُٹھتا ہے

مُنہ کو مت کھول، ورنہ عالم کے — پردہ رازِ نہاں سے اُٹھتا ہے

بیٹھتا ہے وہ جنگجو جس جا — لڑ کے آخر وہاں سے اُٹھتا ہے

شورِ محشر کہیں ہیں جس کے تئیں — میرے شور و فغاں سے اُٹھتا ہے

کشتۂ عشق یوں نہیں ملتا — مر کے کوئے بتاں سے اُٹھتا ہے

جو کہ پتھر سا جم کے بیٹھے ہے — کب ترے آستاں سے اُٹھتا ہے

مصحفیؔ مت بہت رقیب کو چھیڑ
وہ کوئی درمیاں سے اُٹھتا ہے؟

۶۷۷

اہلِ دل گر جہاں سے اٹھتا ہے — اک جہاں جسم و جاں سے اُٹھتا ہے
چلو، اے ہمرہو! غنیمت ہے — جو قدم اس جہاں سے اُٹھتا ہے
جمع رکھتے نہیں، نہیں معلوم — خرچ اپنا کہاں سے اُٹھتا ہے
گر نقاب اس کے منہ سے اٹھتی نہیں — شور کیوں کارواں سے اُٹھتا ہے
وائے بے طاقتی و بے صبری — پردہ جب درمیاں سے اُٹھتا ہے
پھر وہیں گر پڑے ہے پروانہ — گر ٹک اک شمع داں سے اٹھتا ہے

قصۂ مصحفیؔ سنا کر، یار!
عشق اس داستاں سے اُٹھتا ہے

۶۷۸

تاب کس کی ہے کہ بے پردہ ترا منہ دیکھے — غش کرے وہ وہیں اگر تیرا، خدا منہ دیکھے
روئیے ہم سے ہوئی ایسی ہی خجلت حاصل — کیا کسی کا کوئی پھر روزِ جزا منہ دیکھے
کیا ستم ہے کہ تو آئینے کو رو دے، ظالم! — اور گنہگار سا دل دور کھڑا منہ دیکھے
نہ رہے آپ میں پھر ماہِ شبِ چار دہم — ٹک دوپٹے سے اگر تیرا کھلا منہ دیکھے
ایک نے اُس سے کہا "مصحفیؔ مرتا ہے میاں! ق — ہووے کیا اُس کا جو تو جا کے ذرا منہ دیکھے

لگا کہنے کہ "ہو آئینہ بھی جس سے بیزار
ایسے بدشکل کا اپنی تو بلا منہ دیکھے"

۶۷۹

پروا تجھے کب ہے، میاں جان! کسی کی — گو تجھ پہ، میاں! جان ہو قربان کسی کی

دل سخت مشوّش ہے مرارات سے، شاید
دیکھی ہے کہیں زلفِ پریشان کسی کی

معلوم نہیں کیا غرض اب آئی ہے درپیش
ہے کب سے زباں اپنی ثناخوان کسی کی

سمجھاتے ہیں تجھ کو ہی میاں تیرے طرفدار
تو ہم سے نہ اتنا بھی بگڑ، مان کسی کی

سو بار گئے، کچھ نہ ہوا نامہ بروں سے
اب آپ ہی قاصد ہو، مگر جان کسی کی

بسمل تو تڑپتا تو ہے پر دیکھیو زنہار
لوہو میں نہ بھر جاوے دامان کسی کی

کیا مجھ کو دہن سے ترے واشد کی توقع
مشکل نہ ہوئی تجھ سے تو آسان کسی کی

گر پھر گیا میں اس سے تو کیا اس کا عجب ہے
تا چند اطاعت کرے انسان کسی کی

گاہے جو قدم رنجہ کیا خاک پہ میری
اس بات سے کچھ گھٹ نہ گئی شان کسی کی

اُس چہرے میں کچھ اور ہی صورت کی صفا ہے
کس طرح نہ ہو آرسی حیران کسی کی

ہمدم تو نہ کر میرے اوپر عشق کی تہمت
کچھ عقل بھی ہے شکل تو پہچان کسی کی

اے مصحفی یہ شعر و سخن جائے گا سب بھول
گر کھب گئی نظر دل میں تری آن کسی کی

۶۸۰

ہیں نہاں داغِ جگر زخمِ نمایاں کے تلے
جس طرح لالہ کہیں ہو گلِ خنداں کے تلے

آشیاں بندی کی تکلیف نہ دے ہم کو ہوس
گر رہیں گے کہیں دیوارِ گلستاں کے تلے

دیکھ پاوے جو ترے چاہِ ذقن کو یوسف
ہاتھ حیرت سے رکھے اپنا زنخداں کے تلے

ہیں دو عارض ترے دے گل کہ بصد شادابی
تازہ رہتے ہیں سدا سایۂ مژگاں کے تلے

یار پہلو پہ مرے ہاتھ سمجھ کر رکھیو
دل سی آتش ہے دبی سینۂ سوزاں کے تلے

ہائے بوسہ نہ لیا ہم نے کبھی اُس لب سے
نت رہا یاں لبِ افسوس ہی دنداں کے تلے

ہم سے آوارہ کہاں، سایۂ دیوار کہاں؟
یہ بھی بس ہے کہ کبھی بیٹھیں مغیلاں کے تلے

سر بسر چشمۂ خورشید ہے یا آبِ حیات
گر نظر سیر کرے زلفِ پریشاں کے تلے

مصحفی اس سے بھی رنگیں غزل اک اور لکھی
رکھ دیا تازہ گلستاں کو گلستاں کے تلے

٦٨١

دل تڑپتا ہے مرے سینے میں، پیکاں کے تلے
نگۂ شرم ہے تو بھی تری مژگاں کے تلے

مر بھی جاؤں جو میں، پیارے، بتو بلا سے تیری
تو نہ رکھیو لبِ نازک کہیں دنداں کے تلے

گلبدن کا نہیں پاجامہ اگر کیجیے غور
سیرِ گلزارِ ارم ہے ترے داماں کے تلے

خندۂ زخمِ جگر، گل کی طرح کرتا ہے
چاک سینے کا مرے چاک گریباں کے تلے

تجھ سے اک داغ کا اخفا نہ ہوا، اے لالہ!
یاں ہیں سو داغ چھپے سینۂ سوزاں کے تلے

سیرِ گلزارِ شہادت ہو مبارک اس کو
رکھ دیا جس نے گلا خنجرِ بُراں کے تلے

رنگ یاقوت کے مانند پڑا جھمکے ہے
رنگِ لب کا مرے رنگِ مسی و پاں کے تلے

مصحفیؔ رو رو میں اُس کو، میں بہائے نالے
نہریں جس طرح بہیں جنّتِ رضواں کے تلے

٦٨٢

زلفوں کا بکھرنا اک تو بلا عارض کی جھلک پھر ویسی ہی
آنکھوں کا مٹکنا ہوش ربا ہر ایک پلک پھر ویسی ہی

وہ شوخ جو گزرے مثلِ صبا تو بھڑکے نہ کیونکر آتشِ دل
اک طور کی اُس کی جنبشِ پا دامن کی جھٹک پھر ویسی ہی

کوئی کیوں نہ گریباں چاک کرے اب دیکھ کے چھب کو اس بُت کی
پنڈے کا جھلکنا ہائے خدا! چولی کی مسک پھر ویسی ہی

دل کیوں نہ کرے سینے میں طپش، جب یار کی ہو یہ راہ وروش
رفتار میں اک البیلی ادا اور قد کی لچک پھر ویسی ہی

ہم کیوں نہ کفِ افسوس ملیں، جب وے ہی ترا پابوس کریں
دامن سے زیادہ بندِ قبا زلفوں کی لٹک پھر ویسی ہی

وہ ماہ چھپایا تو نے کہاں ہے جس سے جگر پر داغ مرے
صورت تو دکھا دے مجھ کو ذرا جلدی سے فلک پھر ویسی ہی

اے مصحفیؔ میرے حال پہ اب کیونکر نہ کوئی افسوس کرے
بیساختہ دل بیتاب ہوا آنسو کی ڈھلک پھر ویسی ہی

٦٨٣

جسے تصویر دکھلائی ہے تیری
اسے کیا وضع خوش آئی ہے تیری

نہ کر اُس سے، دلا! چھپ چھپ کے باتیں | کہ ان باتوں میں رسوائی ہے تیری
ہمارا غنچہ، دل کھِل گیا ہے | صبا جب بوئے خوش لائی ہے تیری
جو صید آیا سرِ تیر اس کے بولا | تجھے شاید اجل لائی ہے تیری
حنا کے ساتھ دل خوں ہو گیا ہے | یہ کس نے مٹھی بندھوائی ہے تیری
نہیں نظروں تلے ہرگز ٹھہرتی | جو صورت دل میں ٹھہرائی ہے تیری
کوئی کیونکر جیے گا دیکھ تجھ کو | بلائے جاں یہ زیبائی ہے تیری
کہا میں رات اُس سے "ایک بوسہ | ق | جو چپ کر دے تو دانائی ہے تیری"
خفا ہو کر لگا مجھ سے یہ کہنے | ۱۰ "ابے کم بختی کیوں آئی ہے تیری"

نہ لے، اے مصحفیؔ! تو صبر کا نام
کہاں اتنی توانائی ہے تیری؟

۶۸۴

باغ میں جا کے وہ جب بندِ قبا کھولے ہے | ہو کے محظوظ گُل اے وقت "تو خوش" بولے ہے
سر پہ میرے ہی لگاتا ہے فلک آخر کار | تیغِ بیداد کو جب ہاتھ میں لے تولے ہے
کیوں کے بچیے کہ نہنگِ فلکِ مردم خوار | کھول کر مُنہ کبھی اِس کو کبھی اُس کو لے ہے
جب کہ آغوش میں لیتی ہے تجھے میری نگاہ | پہلے سو بار، میاں! صدقے ترے ہولے ہے
گھول گھول اُس کی جدائی میں پیا زہر میں ایک | کسی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ "تو کیا گھولے ہے"

جان و دل دونوں ہیں حاضر یہ پسند اس کی ہے
مصحفیؔ بول نہ، لینے دے اُسے جو لے ہے

۶۸۵

غزل سرائی میں گر، وا کروں زباں اپنی | تو جا دے مرغِ چمن بھول داستاں اپنی
یہ دل تو چیز ہے کیا بلکہ تم اگر چاہو | تو، میری جان! تصدّق ہے تم پہ جاں اپنی

ستارے شب کو نکلتے نہیں جو سچ پوچھو
ہمیں دکھاتا ہے آنکھیں یہ آسماں اپنی

یہ باتیں خوب نہیں منہ پہ گالیاں دینی
زباں سنبھالے ہی ٹک رکھیو، مہرباں! اپنی

برنگِ آئنہ اس زنگبارِ عالم میں
ہمیشہ تختہ ہی رہتی ہے کچھ دکاں اپنی

بشرطا اس کو اگر معرکے میں رکھ دیجے
کھنچے نہ ہاتھ سے رستم کے بھی کماں اپنی

میں جبکہ گھر سے نکل بیٹھتا ہوں ٹک باہر
تو لے چلے ہے وہی کہنہ داستاں اپنی

خدا کے واسطے اے مصحفیؔ کہیں چپ رہ
بہت بھی بک نہ طبیعت ہے ناتواں اپنی

۶۸۶

چھاتی پہ لٹکتی نہیں زنجیر طلا کی
چاندی کے ورق پر ہے یہ تحریر طلا کی

افشانِ طلا سے یہ تمھارا خمِ ابرو
آتا ہے نظر جیسے کہ شمشیر طلا کی

جو چمپئی حسن اُس کے کو دیکھے ہے کہے ہے
بتخانے سے آئی ہے یہ تصویر طلا کی

جنّت کی طمع کیوں نہ کرے شیخ کہ واں ہیں
چاندی کے محل یا کہ ہے تعمیر طلا کی

ضعفِ جگر و دل ہو جسے غم سے بتاں کے
ہو وے نہ طلا کھائے سے تاثیر طلا کی

جاتی رہے ہے تپِ دل کوئی کافور ملے سے
احباب عبث کرتے ہیں تدبیر طلا کی

وہ سوختہ ہوں میں کہ مری خاک کو لے کر
گر طرح کریں تو ہے وہ اکسیر طلا کی

جب آئنہ دیکھے ہے تو کندن سا ترا رنگ
آئینے کو کر دیوے ہے تصویر طلا کی

ہم خانہ بدوشوں کو طلا گر نہیں ملتا
کوتاہیِ قسمت ہے نہ تقصیر طلا کی

تسخیر کوئی پہنچے ہے اُس کو نہ عزیمت
اے مصحفیؔ جو ہوتی ہے تسخیر طلا کی

۶۸۷

بزم سے اُٹھے جو ہم، بیکل گئے
لے کے چٹکی رات وے دل مل گئے

آہ بھی منہ سے نہ نکلی گرچہ یاں
عاشقوں کے سر پہ آرے چل گئے

خاک پر میری وہ آیا لے کے تیغ
جب لحد میں استخواں بھی گل گئے

دخترِ رز تو، تو کس گنتی میں ہے
یاں پری زادوں کے جوبن ڈھل گئے

تھے جو انگارے سے گل اس باغ میں
دیکھ اس رنگِ کفک کو جل گئے

معرکے میں عشق کے، اے مصحفی!
سامنے سے میرے رستم ٹل گئے

۶۸۸

جس دم کہ آنکھ میری اُس شوخ سے لڑی ہے
کافر نگاہ اس کی بجلی سی آ پڑی ہے

اُگتے ہیں گل چمن سے آسودۂ شہادت
کس کی لہو بھری لاش اس خاک میں گڑی ہے؟

کشتہ ہوں کس نگہ کا جو بہرِ پاسبانی
لوحِ مزار اب تک سر پر مرے کھڑی ہے

لختِ جگر سے از بس پایا ہے رنگ اس نے
مدِّ نگاہ اپنی پھولوں کی سی چھڑی ہے

بیمار کا تمھارے کل دم الٹ گیا تھا
کہتے ہیں آج اس پر پھر اب وہی گھڑی ہے

تیری نزاکتوں کو پہنچے ہے کب، وہ لڑکے!
بوٹے سے قد سے تیرے گو شاخِ گل بڑی ہے

اے مصحفی، وہ اتنا خوش رو نہیں ہے اس پر
کیا جانے آنکھ تیری کس وضع سے پڑی ہے؟

۶۸۹

اے دل! تو نہ بھڑ اس سے کہ تیغ اس کی ہے کٹّی
باندھے گا بھلا کون ترے زخم کو پٹّی

رنگیں نہیں ناخن ترے پاؤں کے حنا سے
پابوس کو آئی ہیں ترے، بیر بہٹّی

اس کوچے سے، ظالم! تو مجھے تو چلا ہے
اے عشق! کہیں خوار نہ کیجیو مری مٹّی

لیجاتے ہو دل مجھ سے تو پھر مانگو ہو جاں کو
یہ زور لگائی ہے غرض آپ نے جٹّی

اس سینۂ صد چاک میں داغوں کا تماشا
آ دیکھ کہ ہے یہ بھی چراغان کی ٹٹّی

ای پیرزن ایسی تری کیا عقل گئی ہے
یوسف کی بہا میں بھی کوئی دیوے ہے اٹی؟

لازم ہے مجھے مصحفی وصف اپنے سخن کا
کہتا نہیں ہرگز کوئی چھاچھ اپنی کو کھٹی

۶۹۰

رہے جو قبضۂ شمشیر کیں پہ ہاتھ دھرے
مرے سلام کو کب وہ جبیں پہ ہاتھ دھرے؟

کبھی جو آئے نظر سینکنے کو ہم کم بخت
تو اس نے ضد سے رخِ آتشیں پہ ہاتھ دھرے

خدا کے واسطے ہمدم یہیں نہ چھیڑ اس وقت
کہ بیٹھے ہیں دلِ اندوہگیں پہ ہاتھ دھرے

نہ دی خبر مجھے اس نے بھی زلف کی گرچہ
میں بارہا قدمِ شانہ بیں پہ ہاتھ دھرے

یہ کس کا غم ہے جو اس انجمن میں چھوٹے بڑے
ملول بیٹھے ہیں سارے جبیں پہ ہاتھ دھرے

پڑا میں تپ میں جلوں یاں ہزار حیف کہ واں
طبیب اُس کے تنِ نازنیں پہ ہاتھ دھرے

چل اس طرح کہ نہ اے مصحفی لگے ٹھوکر
پڑے ہیں وے جو سرہانے زمیں پہ ہاتھ دھرے

۶۹۱

خنجر تلے، اے دل! نہ تڑپ اتنا بھی، دم لے
کیا کرنا ہے قاتل کا کہیں ہاتھ تو تھم لے

کب چشمِ خماریں کا تری وصف ادا ہو
لکھے نہ اگر ہاتھ میں نرگس کی قلم لے

اُن ماتمیوں کی بھی تجھے خیر و خبر ہے
کوچے سے ترے جو گئے نالوں کے علم لے؟

جو اشک کہ گرتا ہے مری آنکھوں سے مجھ کو
کہتا ہے یہی "تو بھی یونہیں راہِ عدم لے"

ہاتھوں کی کلائی پہ تری رحم ہے مجھ کو
چُن چُن کے گُل اس باغ سے دامن میں تو کم لے

کعبے سے نکالا جو ہمیں اب کے تو ہم بھی
بتخانے میں جا بیٹھیں گے کوئی تازہ صنم لے

چاہا ہو اگر تیرے سوا ہم نے کسی کو
تُو جیسی کہ چاہے، تو میاں! ہم سے قسم لے

کس طرح میں دیکھوں کہ مرے سروِ رواں کی
پابوسی کرے رنگِ حنا، زلف قدم لے

اے ناخنِ غم! کیا ہے تجھے اتنی شتابی
مرہم کا یہ پھاہا تو مرے داغ پہ جم لے

اوروں نے متاعِ طرب و عیش اُٹھائے
ہم غمزدہ دنیا سے گئے درد و الم لے

کیا مصحفیِ خستہ کے دل پر تو مٹا ہے
زلفوں کی کمندوں میں کوئی صیدِ حرم لے

۶۹۲

دکھا کر منہ کو چھپ جایا نہ کیجے
ہمیں اس وضع ترسایا نہ کیجے

مجھے کیا بلکہ مشّاطہ کو اپنے
حنائی ہاتھ دکھلایا نہ کیجے

جو آیا کیجیے بندے کے آگے
تو میری جان! شرمایا نہ کیجے

تمھیں کہتا ہوں، اے دامن درازو!
مری آتش کو بھڑکایا نہ کیجے

پکارے گو کوئی، یوں گھر سے باہر
کھلے بالوں نکل آیا نہ کیجے

تمھاری زلف بل کھاوے تو کھاوے
ولیکن آپ بل کھایا نہ کیجے

خطا پاؤ گے اک دن مصحفی تم
بہت اس کوچے میں جایا نہ کیجے

۶۹۳

کیا کروں میں جو گلستاں میں بہار آئی ہے
یاں تو آنکھوں میں مری جانِ نزار آئی ہے

مر گیا ہوں تو مری روح بھی تجھ کو، قاتل!
تیرے دروازے پہ جا جا کے پکار آئی ہے

اک ذرا رہ کہ مری آنکھوں میں جوں قطرۂ اشک
جاں ترے قدموں پہ ہونے کو نثار آئی ہے

تیغ کو سان پہ رکھا ہے مرے قاتل نے
آج شاید اجلِ تازہ شکار آئی ہے

ہے بہت رنگِ حنا آج جو تغیر مگر
بازی ہاتھوں سے ترے رات وہ ہار آئی ہے

مصحفی ضد سے وہ ٹھکرا کے چلا ہے اس کو
راہ میں اس کی اگر میری مزار آئی ہے

٦٩٤

محبت میں صادق یہ اغیار ٹھہرے — ہم اک بات کہہ کر گنہگار ٹھہرے

نہ ٹھہرا مرے دل میں پیکاں تو تیرا — غنیمت ہے یہ بھی جو سوفار ٹھہرے

میں بیچا دل اپنا تمہارے ہی ہاتھوں — کہ اس جنس کے تم خریدار ٹھہرے

گلی سے تری کوئی بچ کر نہ آیا — چُھٹیلے گئے وے جو دو چار ٹھہرے

دل آنسو سے ہے سیل کی رہگزر میں — عجب ہے کہ اس گھر کی دیوار ٹھہرے

ستم یہ پڑا ہے کہ یہ بے وفا بھی — ستم کر کے ہم پر وفادار ٹھہرے

ہوئے کامیاب اُس سے، بیدرد! یارب — ہم ان حسرتوں کے سزاوار ٹھہرے

برسنے کا ساون کے خطرہ نہیں کچھ — جھڑی تیری، اے چشمِ خونبار ٹھہرے

صفِ جنگ سے ٹل گئے سب فلک کی — جو ٹھہرے تو میدان میں یار ٹھہرے

گلی سے تری ہم تو اُٹھ کر چلے تھے — ہوا ضعف مانع، سو ناچار ٹھہرے

ٹھہر جائے یہ جان بر لب رسیدہ — جو وعدے پہ اپنے وہ عیّار ٹھہرے

تو اک وار میں ہانپ جاتا ہے پیارے! — ترے ہاتھ میں کیونکہ تلوار ٹھہرے

سدا ہم سے بیہوشیاں ہی ہوئیں یاں
ہم اے مصحفیؔ کیونکہ ہشیار ٹھہرے

٦٩٥

برقِ رخسارِ یار پھر چمکی — اس چمن کی بہار پھر چمکی

تو نے پھر اس کو سان پر رکھا — تیرے خنجر کی دھار پھر چمکی

میرے گریے سے آب و تاب آیا — صورتِ روزگار پھر چمکی

خونِ عاشق سے وہ زہِ دامن — دمِ شمشیر وار پھر چمکی

دیکھیو پانو رکھدیا کس نے — آج کیوں نوکِ خار پھر چمکی؟

وہ جو اک ٹیس سی ہے دل میں مرے — رہ کے بے اختیار پھر چمکی

مصحفی کی جو تو نے دُرّ ریزی
شاعری تیری یار پھر چمکی

۶۹۶

کبھی جو ہجر میں ہم بے قرار ہوتے تھے — تو جا کے اُس کی گلی کے نثار ہوتے تھے
لگا رہا تھا نشانے پہ کل وہ تیر اُدھر — اِدھر وہ میرے کلیجے کے پار ہوتے تھے
گئے وہ دن کہ بہ تحریکِ نالۂ بلبل — ہم اُس چمن میں مہیّائے کار ہوتے تھے
خوشی کے مارے میں گُل کھا کے رہ میں جا بیٹھا — کہ کل وہ سیرِ چمن کو سوار ہوتے تھے
میں دیکھتا تھا کھڑا اک طرف جو راہ میں رات — تمھارے غیر کے قول و قرار ہوتے تھے
عرق کی بوندیں نہ گرتی تھیں اُس کے مکھڑے سے — ستارے بدر کے رو پر نثار ہوتے تھے

نہ پوچھو ہم سے میاں مصحفی کہاں تھے تم
خراب پھرتے تھے گلیوں میں خوار ہوتے تھے

۶۹۷

لوگ کہتے ہیں محبت میں اثر ہوتا ہے — کونسے شہر میں ہوتا ہے کدھر ہوتا ہے؟
اس کے کوچے میں ہے نت صورتِ بیدادِ نئی — قتل ہر خستہ باندازِ دگر ہوتا ہے
نہیں معلوم کہ ماتم ہے فلک پر کس کا — روز کیوں چاک گریبانِ سحر ہوتا ہے؟
وہ میں اپنی بھی ہے باریک تر از مُو گردن — تیغ کے ساتھ یہاں ذکرِ کمر ہوتا ہے
کر کے میں یاد دل اپنے کو بہت روتا ہوں — جب کسی شخص کا دنیا سے سفر ہوتا ہے
اس کی مژگاں کا کوئی نام نہ لو کیا حاصل — میرا ان باتوں سے سوراخ جگر ہوتا ہے

مصحفی ہم تو ترے ملنے کو آئے کئی بار
اے دِوانے! تو کسی وقت بھی گھر ہوتا ہے؟

کبھو پلکیں جی میں ڈبا گئے، کبھو انکھڑیوں کو لڑا گئے
غرض اس طرح ہی یہ خوبرو مجھے چاہ اپنی جتا گئے

سحر آ کے مجھ کو وے ناز سے چڑھی بھوں جو اپنی دکھا گئے
کہوں کیا کہ غصّے کی شکل سے مرے دل کو کیسے وہ بھا گئے

ہے قدم قدم پہ نشانِ خوں، سرِ خار سارے ہیں لالہ گوں
کوئی مجھ سے پوچھے تو یوں کہوں کئی یاں سے آبلہ پا گئے

سرِ راہ باتیں وہ کرتے تھے کسو ساتھ آنکھیں ملا ملا
میں اچانچک جوں ہی آ گیا مجھے دیکھ آنکھیں چرا گئے

رہے نقشِ پا کی طرح سے ہم چمنِ جہاں میں ہزار حیف
جو مثالِ بادِ وزیدہ تھے وے برنگِ موجِ ہوا گئے

کھلے بندوں در پہ وہ بیٹھے تھے جوں ہی سامنے سے میں آ گیا
نہ بن آیا کچھ تو دوپٹے میں وہ نہیں گات اپنی چھپا گئے

نہ چلے جنازے کے ساتھ وے، مرے دو قدم بھی تو ناز سے
یونہیں کہنے سننے سے خلق کے ذرا ہاتھ آ کے لگا گئے

تک اسی بہانے سے دیکھیں ہم تمہیں اس میں کیا ہے بھلا بُرا
اگر آ کے کوٹھے پہ دھوپ میں کبھو سر کے بال سکھا گئے

گئے چھوڑ وادیِ عشق میں مجھے ہمرہاں سبھی مصحفیؔ
میں اکیلا روتا ہی رہ گیا کہ نہ ساتھ اپنے بلا گئے

٦٩٩

غرض ان بیوفاؤں سے وفاداری تو مشکل ہے
نہ کیجے آپ بھی گر اپنی غمخواری تو مشکل ہے

بتنگ آئے ہیں ہم تھوڑی سی رنجش میں معاذاللہ!
گر آئے درمیاں میں اور بیزاری تو مشکل ہے

تپِ غم کا علاج، اے دل! جو کچھ ہو تجھ سے کر لو وہ
دگر نہ ہو گئی مزمن یہ بیماری تو مشکل ہے

ہجومِ جلوۂ خوباں کے ہم پامال ہیں، ہم سے
اب ایسے وقت میں دل کی خبرداری تو مشکل ہے

مرمت قصرِ تن کی کر کہ ہے ناموسِ جاں اس میں
جو ناگہ ڈھے گئی یہ چار دیواری تو مشکل ہے

بہت ناصح نے ضبطِ گریہ و زاری کو فرمایا
کروں کیا آہ ضبطِ گریہ و زاری تو مشکل ہے

مداوا دیدۂ خونبار کا اپنے بھی کچھ کیجے
اگر یوں ہی رہے ناسور سے جاری تو مشکل ہے

لگا بیٹھے ہو تم جی جان تک داوِ محبت میں
یہ بازی بھی جو تم نے مصحفیؔ ہاری تو مشکل ہے

۷۰۰

تیرے سوا کسو کی تمنّا نہ چاہیے — تو چاہے گر ہمیں تو میاں کیا نہ چاہیے

خوگر نہیں ہوئے ہو تماشے کے تم ابھی — ہر لحظہ تم کو آئنہ دیکھا نہ چاہیے

مجلس میں اپنی میری نگاہوں کو دیکھ کر — کہتا ہے "اس کے سامنے بیٹھا نہ چاہیے"

پیچھے پڑے ہو تم جو بلا کی طرح تمھیں — اتنا خیالِ عاشقِ رسوا نہ چاہیے

ہر گوشہ دیکھتے ہو کہ نرگس ہے دیدہ باز — بندِ قبا کو باغ میں کھولا نہ چاہیے

دل بن رہا ہے غم سے نرے جیسے آبلہ — کیا فائدہ ہے، بس اسے چھیڑا نہ چاہیے

اسبابِ زندگی جو میسر ہو تو، دلا! — سب چاہیے ہے زیست کو کیا کیا نہ چاہیے

ساعد کی نازکی پہ یہ تیری ہے مجھ کو رحم — ہاتھوں میں تیرے پھولوں کا دستانہ چاہیے

غافل! نہ آسماں کے تلے خواب گاہ کر — زیرِ پلِ شکستہ تو سویا نہ چاہیے

کہتی ہے شرمِ عشق یہی نت مجھے کہ "یار! — گلیوں میں ڈاڑھیں مار کے رویا نہ چاہیے"

آنے میں تو بہار کے کتنے ہیں دیر ہے — ہم کو بھی غش سے ہوش میں آیا نہ چاہیے

جس تازہ گل میں ہووے نہ تیرے بدن کی بُو — انصاف تو یہ ہے اُسے سونگھا نہ چاہیے

غصّے میں مُنہ تھمائے وہ بیٹھا ہے مصحفیؔ
اب اُس سے ایسے وقت میں بولا نہ چاہیے

۷۰۱

وحشت اگر یہی ہے تو صحرا کو جائیں گے — صحرا کے وحشیوں سے دل اپنا لگائیں گے

صورت سے تو ہماری خفا ہے تو لے چلے — پھر آ کے تجھ کو اپنی نہ صورت دکھائیں گے

ان خوش قدوں کے ہاتھ سے جاؤں کہاں نکل — یہ چال ہے تو مجھ پہ قیامت یہ لائیں گے

مانگی ہزار بار دُعا پر نہ کچھ ہوا — ناچار اب دعا ہی سے ہم ہاتھ اُٹھائیں گے

محرابِ تیغِ یار ہوئی جلوہ گر تو ہم — سجدے میں سب سے آگے سر اپنا جھکائیں گے

آنکھیں برنگِ آئنہ اس دم تو خشک ہیں — گر تر ہوئیں تو ان سے ہی دریا بہائیں گے

کل ایک نے کہا کہ "میاں مصحفی، یہ بات ق کہتے تھے اب کے اس کی جو مجلس میں آئیں گے

پھونکیں گے اس کے کان میں کچھ اور ہی فسول اور اس بہانے زلف کا بوسہ اُڑائیں گے"

کہنے لگا وہ شوخ کہ "کچھ ان دنوں کے بیچ

وے بے ادب ہوئے ہیں بہت مار کھائیں گے"

۷۰۲

چمن کے بیچ ہے اب تو بہارِ عبّاسی نگہ سے کیجیے بوس و کنار عبّاسی

اُگا ہے خاک سے شاید بطالعِ عاشق کہ رنگِ زر سے ہے مانا عذارِ عبّاسی

سپید و سرخ نظر آتے ہیں گل اس کے مجھے ہیں پھول سیم و طلا کے نثارِ عبّاسی

گلابی رنگ کی میں اس کے کیا کروں تعریف ہے میری آنکھوں میں اب تک خمارِ عبّاسی

چمن ہے تختۂ نقاش کی سراسر شکل وے ہوا ہوں میں اس میں دوچارِ عبّاسی

بنا ہے ان سے زبس تختۂ چمن گلدام ہوا ہے مرغِ دل اپنا شکارِ عبّاسی

گنے وہ کیونکہ بھلا داغ میرے سینے کے نہ کی ہو باغ میں جس نے شمارِ عبّاسی

بہارِ لالۂ خونیں کی خوش نہیں آتی ہوا ہے جب سے مرا دل فگارِ عبّاسی

فقط نہ اس نے کیا شیخ مصحفی کا خوں

ہے سیّدوں کی بھی قاتل بہارِ عبّاسی

۷۰۳

دردمندِ دوست بے آہ و فغاں کیونکر رہے؟ عشق ہے یہ تو چھپائے سے نہاں کیونکر رہے؟

جوشِ گل سے ساکنانِ باغ پر ہے عرصہ تنگ دیکھیے بلبل کا اس میں آشیاں کیونکر رہے؟

یوں بھی ہوتی ہے اُسے تو ہائے بے چینی زیاد ایک ہی کروٹ یہ جسمِ ناتواں کیونکر رہے؟

کیا بلا درپیش آئی اُن کو ایسی کیا ہوا پیچھے اس منزل میں میرے ہمرہاں کیونکر رہے؟

وصل کی شب ہے نہیں تدبیر بن آتی کچھ آہ! کیا کروں گردش سے اس شب آسماں کیونکر رہے؟

اک نگہ میں صبر و طاقت کا ہوا خانہ خراب
دل مرے کہنے میں اب، اے دوستاں! کیونکر رہے؟

میں تو زنداں میں پھنسا، اے جانِ عاشق! یہ کہو
بارے تم کرنے سے سیرِ گلستاں کیونکر رہے؟

جب کترنی سی چلے اس کی زباں ہر بات میں
منہ میں مجھ کمبخت کے، یارو! زباں کیونکر رہے

خلق نے میری طرف سے اس کو کچھ کچھ ہے کہا
پاس میرے رات کو وہ بدگماں کیونکر رہے

عشق کا گھوڑا نپٹ منہ زور ہے، اے مصحفی
ہاتھ میں میرے بھلا اس کی عناں کیونکر رہے

۷۰۴

مگر کہ جاذب کی طاقت گئی گریباں سے
کہ اشک گزرے ہے مانندِ چاک داماں سے

زمینِ جادہ جو ہے رشکِ کہکشاں، یارب
گیا ہے گریہ کناں کون اس بیاباں سے

ادائے شکر کروں کیا میں تیرے تیروں کا
کہ چاکِ دل کو مرے سی دیا ہے پیکاں سے

نظر تو کیجیو کن شوخیوں سے رنگِ کفک
کرے ہے جلوہ گری اس کے طرفِ داماں سے

خبر تو لیجو کوئی خستہ مر گیا تو نہ ہو
کہ آج آتی ہے آوازِ نوحہ زنداں سے

یہ کیا سلوک کیا تو نے مجھ سے دستِ جنوں
کہ سی دیا مرا دامن میرے گریباں سے

سراغِ قافلۂ اشک کیجیے کیونکر
گیا ہے دور نکل وہ دیارِ حرماں سے

زبس میں آنکھوں پہ دھر دھر کے ہاتھ روتا ہوں
ہیں آستینوں کے حلقے تنورِ طوفاں سے

نمک کو چھڑکے ہے وہ زخم پر مرے کم کم
مزہ ہو جب کہ نمک گر پڑے نمکداں سے

ذرا تو دیکھیو اس طفلِ نازنیں کی بہار
بغل میں پھول لیے آئے ہے گلستاں سے

ہوا نہ گریے سے کم سوزِ سینہ بلکہ مرا
یہ آگ اور بھی بھڑکی ہوائے باراں سے

بغیر قیس کے یاں تک یہ دشت سونا ہے
کہ وحشت آتی ہے اک سایۂ مغیلاں سے

یہ کس کے شوق میں اے مصحفی تو روتا ہے
لہو چوئے ہے جو یوں تیری چشمِ گریاں سے

۷۰۵

گڑے ہیں کشتۂ الفت جہاں زمیں کے تلے
بنے ہیں خون سے واں گلستاں زمیں کے تلے

ذرا تو گورِ غریباں میں رکھ سمجھ کے قدم
کہ ہر قدم پہ ہے یاں آستاں زمیں کے تلے

اس آسماں سے دل اپنا بتنگ آیا ہے
بنا دیں گے کوئی اور آسماں زمیں کے تلے

زمیں کے پردے نہ ہوں کس طرح سے چادرِ نور
ہوئے ہیں چاند کے ٹکڑے نہاں زمیں کے تلے

گیا میں لے کے جو داغِ فراقِ سیمبراں
جلا کریں گے مرے استخواں زمیں کے تلے

مسافرانِ عدم کی خبر نہ پوچھو کچھ
کہ گم ہوئے ہیں بہت کارواں زمیں کے تلے

جو دیکھا کھول کے میں مصحفی کی تربت کو
گڑے ہوئے تھے کئی استخواں زمیں کے تلے

۷۰۶

اگر بتوں کی تمنا سے دل مرا پھر جائے
تو وہ نہیں شعر و سخن کا مرے مزا پھر جائے

قبول ہوتی ہے زاری نہ ہے دعا میں اثر
میں ہوں وہ بندہ کہ جس بندے سے خدا پھر جائے

جو دیکھتا ہے مرا حالِ زار کہتا ہے
خدا کرے کہ کہیں اُس سے دل مرا پھر جائے

بھلا رکھے کوئی بیگانے سے توقع کیا
جب آشنا ہی سے بے پیچ آشنا پھر جائے

عجب نہیں جو تری خو کے ڈر سے اے ظالم
زباں پہ آ کے مری حرفِ مدعا پھر جائے

بغیر خشت نہ ہو ہم کو تاجِ زر روزی
ہمارے سر پہ اگر سایۂ ہما پھر جائے

کیا ہے بند خدا نے درِ اجابت کو
کہ تا ٹیک کے سر اپنا مری دعا پھر جائے

اگر میں رونے پہ آؤں برنگِ ابرِ بہار
ابھی زمانے کی اے دوستو ہوا پھر جائے

پڑا ہے اس طرح اُس زلفِ تابدار میں پیچ
کہ جس طرح کوئی نٹ کھاتے ہی کلا پھر جائے

ہمارے دل کو مشبک ہی پھر تو دیکھے خلق
گر اس طرف تری مژگاں کا رخ ذرا پھر جائے

بکو ہو شیخ جی تم آج کتنا بیہودہ
مجھے یہ ڈر ہے کہیں سر نہ آپ کا پھر جائے

تری ہی راہ میں بنوا دیں گے مزار اپنی
ہماری خاک پہ شاید قدم ترا پھر جائے

خدا خدا بھی کہا میں تو کچھ نہیں ہوتا
ہزار حیف کہ بندے سے یوں خدا پھر جائے
پکارتا ہے تجھے مصحفی جواب تو دے
کھڑا رہے یہ ترے آستاں پہ یا پھر جائے

۷۰۷

قفس میں مُرغِ گرفتار کیوں پھڑکتا ہے
خبر تو لو کوئی کیا اُس کا دل دھڑکتا ہے
نہ میری آگ پہ دامن جھپک، صبا! ورنہ
اس آگ سے ابھی شعلہ کوئی بھڑکتا ہے
کہو نہ ابر کو دل کھول کر ذرا برسے
یہ میری خاک پہ پانی سا کیا چھڑکتا ہے
کدھر چلا ہے، کھڑا رہ، ذرا تماشا دیکھ
ابھی تو خاک پہ بسمل ترا پھڑکتا ہے
میں اس کی نظروں میں اتنا ہوا ہوں خوار و ذلیل
کہ بات بات پہ میرے تئیں جھڑکتا ہے
ملوں میں مصحفی اُس خانہ جنگ سے کیونکر
کہ اُس کے ملنے سے اپنا تو جی دھڑکتا ہے

۷۰۸

واں کب سے ذقن اس نے زلفوں میں چھپالی ہے
جی دیتے ہیں ہم ناحق یہ چاہ نرالی ہے
پھولوں کی چھڑی جس کے ہاتھوں سے نہ اُٹھتی تھی
اب نامِ خدا اُس نے تلوار سنبھالی ہے
مجلس میں کوئی اس کی کیا جاوے کہ اب واں تو
ہر حرف میں جھڑکی ہے ہر بات میں گالی ہے
وہ حُسن و صفا، اے بُت! اتجھ میں ہے کہ صانع نے
تصویر تری گویا اب سانچے میں ڈھالی ہے
تیغِ خمِ ابرو کا دیتا ہے نشاں سب کو
سینے میں مرے، یارو! جو زخم ہلالی ہے
ہر گام پر اک ٹھوکر لگتی ہے مرے دل کو
ان روزوں نئی اس نے کچھ چال نکالی ہے
کب پیک کا رنگ ایسا ہوتا ہے خبر تو لے
دامن پہ ترے ظالم لوہو کی سی لالی ہے
کس طرح کوئی جھانکے، دیوارِ فلک میں تو
رخنہ ہے، نہ روزن ہے، غرفہ ہے نہ جالی ہے
نت لختِ جگر کا ہے از بس کہ ہجوم ان پر
ہر مدِّ نگہ میرے پھولوں کی سی ڈالی ہے

کیا جانے گیا ہوں میں آغوش میں کس گل کی　　آغوش مری مجھ سے اس رات تو خالی ہے

کرتا ہوں رقم کس کے وصفِ کمرِ نازک

اے مصحفیؔ جو میرا ہر شعر خیالی ہے

۷۰۹

زلف اگر دل کو پھنسا رکھتی ہے　　آنکھ پردوں میں چھپا رکھتی ہے

ساتھ فہمید کی گر ہووے تو پھر　　بت پرستی بھی مزا رکھتی ہے

چُھپھا رنگ مرے خوں کا سا　　تیرے پانو کی حنا رکھتی ہے

آرسی ہوتی ہے سمّکھ تیرے　　کچھ بھی آنکھوں میں حیا رکھتی ہے؟

کر دیا اس نے تو مجھ کو مدہوش　　کس کی بو بادِ صبا رکھتی ہے؟

خاکِ دہلی کی ذرا سیر تو کر　　کہ عجب آب و ہوا رکھتی ہے

ہائے ترچھی نگہ اس کافر کی　　کیا کہوں میں جو ادا رکھتی ہے

تیری تصویر کو لے کر شیریں　　اپنی چھاتی سے لگا رکھتی ہے

بارے اس باغ میں کیا دیکھا ہے　　نرگس آنکھوں کو جو وا رکھتی ہے

جب تلک آوے ہے تو پھر کے، یہ چال　　خاک میں مجھ کو ملا رکھتی ہے

آرسی سے نہ کرو، کج نظری　　اس کا تم سے وہ گلا رکھتی ہے

آہ میری ہے اثر سے ہمدوش　　طالعِ زلفِ رسا رکھتی ہے

کیا ہے تقصیر جو ہم کو تجھ سے　　گردشِ چرخ جدا رکھتی ہے

جھک پڑے ہے تری پابوسی کا　　زلف بھی شوق بلا رکھتی ہے

گوشت اور پوست بھی گل جاتا ہے　ق　جسم کے بیچ یہ کیا رکھتی ہے

مصحفیؔ نام ہے جس چیز کا چاہ

آدمی کو تو کھپا رکھتی ہے

۷۱۰

فندق کہیں بندھی ہے کہیں ہے حنا لگی | بے طرح ہاتھ یار کے طرزِ جفا لگی
نازک ہے میرا شیشۂ دل اس قدر کہ بس | مثلِ حباب پھوٹ گیا گر ہوا لگی
جوں سایہ لگ چلا میں تو وہ مجھ کو دیکھ کر | بولا یہ میرے پیچھے کہاں کی بلا لگی
کیوں نیچی نظریں کرلیں، میاں! یہ تو تو بتا | آئینہ دیکھتے ہی تجھے کیا حیا لگی

پھرتا ہے تو، تو گلیوں کے اندر خراب و خوار
اے مصحفی یہ کس کی تجھے بددعا لگی

رباعیات

جو اشک ان آنکھوں سے جدا ہوتا ہے
مژگاں تلک آیا کہ فنا ہوتا ہے
نظروں سے گرے نہ کوئی کسی کی یارب
نظروں سے گرا بہت برا ہوتا ہے

دردِ وغمِ یار جی کا جی ہی میں رہا
اس گل سے یہ خار، جی کا جی ہی میں رہا
روئے تو بہت سے ہم ولیکن افسوس
نکلا نہ غبار جی کا، جی ہی میں رہا

جو اچھے ہیں رکھتے ہیں سبھی منہ پہ نقاب
آنکھوں میں ہر ایک بشر کی ہوتا ہے حجاب
اے خانہ خراب! لیکن انصاف تو کر
اتنا بھی کوئی کسی کو کرتا ہے خراب؟

کر کے اس در پہ آہ و نالے کتنے
مر مر گئے ہم سے مرنے والے کتنے
اچھی طرح اس نے منہ دکھایا کس کو
ترسا ترسا کے مار ڈالے کتنے

دل شغل میں نالے کے تو کیوں رہتا ہے
اور اشک ہو آنکھوں سے تو کیوں بہتا ہے
اپنا تو جی آیا ترے ہاتھوں سے بتنگ
اے خانہ خراب! کہہ لے کیا کہتا ہے

اے کاش نہ ہم ایسی محبت کرتے
اور کرتے تو کچھ صبر و طاقت کرتے
گر ہے یہی بیکلی تو اک دن یارب
مر جاویں گے یوں ہی، عصمت، عصمت کرتے

ہے جی میں مقیمِ کنجِ عزلت ہو دیں   اور رو رو کے داغ اپنے دل کے کھو دیں
کیا فائدہ نت کی ہرزہ گردی سے بھلا   دنیا تو گئی ہے، دین کو پھر کیوں کھو دیں

ہے حیف تو یہ کہ با جمال چوں حور   عصمت اور ہو وے مائلِ فسق و فجور
یہ وہ ہے مثل کہ مصحفی کہتے ہیں   برعکس نہند نام زنگی کافور

ٹوٹا ہے پڑا ایک طرف پیمانہ   لوٹے ہے کوئی ایک طرف مستانہ
نے ذکر ہے یاں نماز، نے روزے کا   مسجد نہ ہوئی ہوا یہ قہوہ خانہ

تپ سے ہوئی بندگانِ عالی کو شفا   ہے دل میں سرور یہاں ہر اک کے پیدا
ہاں وقت ہے خرّمی کا اور عہدِ طرب   بھر بادۂ ناب سے تو، ساقی مینا

وہ شوخ ابھی تو مجھ سے رم کرتا ہے   جوں چاہیے اختلاط کم کرتا ہے
اتنا تو ستم نہیں، نہ ملنا اس کا   غیروں سے ملے ہے یہ ستم کرتا ہے

جس دم وہ بہ قصدِ دل ربائی آوے   کچھ کام نہ زہد و پارسائی آوے
گو دین سے اپنے ایک عالم پھر جائے   وہ بت نہ پھرے اگر خدائی آوے

اے دل! تو رہے گا کہ شرابی کب تک؟   جوں غنچہ بغل بیچ گلابی کب تک؟
اب ہو ہے بنائے عمر کوئی دم میں خراب   اے خانہ خراب! یہ خرابی کب تک؟

مارے تپِ غم کے میں گلا جاتا ہوں   اس داغِ جگر سے سب جلا جاتا ہوں
موقوف پہ جس نہیں ہے جانا میرا   جوں شمع کھڑا ہوں اور چلا جاتا ہوں

افسوس کہ دل کی بے قراری نہ گئی
فریاد و فغان و آہ و زاری نہ گئی
وہ کونسا روز ہے کہ تجھ بن جوں شمع
روتے ہوئے مجھ کو رات ساری نہ گئی

ہر چند کہ وہ ہو کے خفا جاتا ہے
اس بن کوئی عاشق سے رہا جاتا ہے
دل بستگی ہے دل کو زبس اس سے کمال
وہ جھڑکے ہے، یہ ساتھ لگا جاتا ہے

کیا درک کرے مدرکۂ انسانی
جوں آئینہ لازم ہو جسے حیرانی
سب دیکھا بہ چشمِ دل، بہ ایں ہمہ دید
سوجھا نہ وہ وائے غفلت و نادانی

اے عشق! کہیں آگ لگا دے مجھ کو
میں ہیزمِ خشک ہوں جلا دے مجھ کو
لے جل کے میں خاک بھی ہوا آپھی آپ
اب دیر نہ کر اس میں اڑا دے مجھ کو

اس سال کہ پھر عیدِ سعید آئی ہے
تیرے لیے پیغامِ خوشی لائی ہے
کر میر نعیم خان تو عیش و عشرت
جب تک کہ ترا جلوسِ امرائی ہے

میں دردِ دل اپنا جو نہیں اظہار کیا
پھر نام دوا کا نہ طبیبوں نے لیا
عیسیٰ کی بھی کر چکا میں کتنی منّت
اس نے بھی مجھے جوابِ شافی نہ دیا

وہ سیرِ نظارۂ درو بام کہاں؟
وہ وعدۂ صبح، وہ گرمیِ شام کہاں؟
وہ زیرِ لب خندہ و دشنام کہاں؟
دل کس سے لگائیے، دل آرام کہاں؟

دنیا پر دلو پیچ محض مفہوم ہوئی
خاطر یہاں آ کے سخت مغموم ہوئی
بندے سے نہ کیجے اب خدا کا شکوہ
بس آپ کی کائنات معلوم ہوئی

جو دم ہے سو دید اس جہاں کا کیجے
اندیشہ نہ کچھ سود و زیاں کا کیجے
کچھ واں بھی کیا تھا فکر یہاں آنے کا
پس کاہیکو یاں بھی فکر وہاں کا کیجے

گو آٹھ پہر سامنے نظروں کے رہو
یوں کوئی کسی حسین کو تک تو سکو
کیا آنکھ میں اس کی رہی ہے آنکھ گڑو
اس آرسی کا تو دھویا دیدہ دیکھو

نے شکوۂ دورِ آسمانی کیجے
نے ذکرِ شہانِ باستانی کیجے
اے مصحفیؔ! اب تو اس زمانے کے بیچ
جس طرح سے ہووے زندگانی کیجے

نوروز عجب سالِ سعید آیا ہے
نوروز نہیں یہ روزِ عید آیا ہے
بادام سے کر شگون تو اوّل یعنی
بادام کے رنگ پہ پدید آیا ہے

ہے برجِ حمل آئنہ دارِ نوروز
خورشید شرف میں ہے دوچار نوروز
لے آئنہ تو بھی ہاتھ میں تا کہ تجھے
آنکھوں سے نظر آئے بہارِ نوروز

یارب شہر اپنا یوں چھڑایا تو نے
ویرانے میں مجھ کو لا بٹھایا تو نے
میں اور کہاں یہ لکھنؤ کی خلقت
اے وائے یہ کیا کیا خدایا تو نے

یارب، تری بزم رشکِ گلزار رہے
اور بختِ جواں سدا ترا یار رہے
ہے مصحفیؔ غریب کی نت یہ دعا
جب تک کہ جہاں رہے جہاندار رہے

اس طرح سے رو کہ دل کو تسکیں ہووے
گو دامن و آستیں نہ تزئیں ہووے
اے دیدہ! لہو کی تہ نہ آنسو میں ملا
ہیرے کا عیب ہے جو رنگیں ہووے

مسدّس

اے کہ ہم بزمیِ اغیار خوش آئی ہے تجھے
کیا کسی نے کوئی ترکیب دکھائی ہے تجھے
صلح غیروں سے، مرے ساتھ لڑائی ہے تجھے
وضع کس شوخ طرحدار کی بھائی ہے تجھے

ان دنوں تجھ کو مشوّش میں بہت پاتا ہوں
بکھرے بالوں کو ترے دیکھ کے گھبراتا ہوں

کیا کسی سے تجھے ناورد ہے، کیوں خیر تو ہے؟
پھول سا چہرہ ترا زرد ہے کیوں، خیر تو ہے؟
اور دمِ گرم ترا سرد ہے کیوں خیر تو ہے؟
سچ تو بتلا تجھے کیا درد ہے، کیوں خیر تو ہے؟

اشک آنکھوں سے تری ہیں یہ رواں کس کے لیے؟
اپنا منہ دیکھ تو، روتا ہے، میاں! کس کے لیے؟

بعضے کہتے ہیں کہ آسیبِ پری ہے تجھ کو
بعضے کہتے ہیں پریشاں نظری ہے تجھ کو
بعضے کہتے ہیں کہ دردِ جگری ہے تجھ کو
بعضے کہتے ہیں زخود بے خبری ہے تجھ کو

تُہمت چند، میاں! تجھ کو لگا چاہتے ہیں
تیری آنکھیں تری پلکوں کا بُرا چاہتے ہیں

اشک آنکھوں سے تری نت جگری نکلے ہے
ساتھ اس اشک کے پھر خوں بھی ذری نکلے ہے
گھر سے تو بال کھلے جیسے پری نکلے ہے
وضع سے اک تری شوریدہ سری نکلے ہے

میں نہ مانوں گا ہوا ہے تو کسی پر عاشق
آرسی ہاتھ میں لے، ہے نہ اسی پر عاشق؟

رنگ چہرے کا ترے زرد ہے، اے غیرتِ ماہ! مجھ کو بتلا تو ترا کون ہے ایسا دل خواہ؟
کر گئی دل میں اثر تیرے یہ کس بت کی چاہ؟ حسرت آگیں نظر آتی ہے مجھے تیری نگاہ

کوفت دل کی ترے چہرے سے عیاں ہوتی ہے
چاہ بھی چیز ہے ایسی کہ نہاں ہوتی ہے؟

پر تعجب ہے یہ مجھ کو کہ بہ ایں کاہشِ غم نہیں رتبے سے گرا حسن کا تیرے عالم
اک کھلے بالوں سے تو نکلے ہے وضعِ ماتم ورنہ آنسو ترے عارض پہ ہیں گل پر شبنم

جس سے دونی نظر آتی ہے نزاکت کی بہار
گل نے پائی ہے کہاں ایسی لطافت کی بہار؟

پھول گل کھاتے ہیں اب تک تری رعنائی پر آنکھیں تاروں کی پڑیں ہیں تری زیبائی پر
وہی عالم ہے ترے حسن کی سرسائی پر تو نے باندھی ہے کمر کس لیے رسوائی پر؟

نام چاہت کا جو ہر دم تو لیا کرتا ہے
اور دن رات یہی ذکر کیا کرتا ہے

وہی چشمک ہے، وہی جھانولی، ویسی ہی نگاہ وہی منہ پھیر کے چلنا، وہی ہر بات پہ واہ
وہی انداز قدم کا، وہی رنگینیِ راہ وہی دامن کی درازی، وہی ٹھوکر کا نباہ

دیکھ سب زیر و زبر جس کو ہوئے جاتے ہیں
مردے جی اٹھتے ہیں اور زندے موئے جاتے ہیں

آستینوں کی تری مہریاں ویسی ہی تنگ وہی چولی کی مسک اور وہی بندے کا رنگ
وہی تن شیشے سا نازک، وہی دل سختی میں سنگ وہی مکھڑے کی صفا جیسے کہ تصویرِ فرنگ

اس پہ بھی قدر کو اپنی تو نہ جانے تو نہ جان
عاشقی خوب نہیں، تجھ کو کہا، میری جان!

گو تو ظاہر میں، زباں پر نہیں لاتا یہ راز پر کہے دیتے ہیں سب مجھ کو یہ تیرے انداز
کون اس کام میں ایسا ہوا تیرا انباز جس کے اغوا سے تو شاہد سے ہوا شاہباز

آنکھ تیری بھی لگی حسن و نمک پر پڑنے
تو بھی لچّوں سے لگا تیغ پکڑ کر لڑنے

خانہ جنگی کی اگر وضع خوش آئی تجھ کو
روے خوش پر نہیں زیبندہ لڑائی تجھ کو
ورنہ دو کھے گی گھڑی ہو کے خدائی تجھ کو
کوئی دینے کا نہیں اس میں بھلائی تجھ کو

شہر کے لوگ برا تجھ کو کہیں گے سارے
مان کہنے کو مرے بہرِ خدا، باز آرے

حق میں تیرے نہیں یہ خیرہ سری ہرگز خوب
کیونکہ ہے جان مری تو ابھی آپھی محبوب
عشق بازی کا یہ ہرگز نہیں ہوتا اسلوب
نیک و بد جانتے ہیں اس کے تئیں سب معیوب

کون کہتا ہے نظر باندھنی کیجے موقوف
اک ذرا تیغ و سپر باندھنی کیجے موقوف

اور بھی لوگ ہیں دنیا میں میاں حسن پرست
حوصلہ تم نے کہاں سے یہ نکالا ایک دست؟
ہاتھ میں تیغ لیے پھرتے ہو جیسے بدمست
مجھ کو یہ ڈر ہے کہیں آپ پہ آوے نہ شکست

کیونکہ دلّی ہے یہاں سیکڑوں خوں ہوتے ہیں
خانہ جنگوں کے علم جلد نگوں ہوتے ہیں

عاشقی شیوۂ خوبانِ خوش اندام نہیں
عاشقی سے کوئی معشوق تو بدنام نہیں
تو دل آرام ہے، کیا اور دل آرام نہیں؟
مصحفی کے تئیں پر اس سے بھی کچھ کام نہیں

یہ سخن محض بھلائی کو تری کہتا ہے
اور جو اس میں بھی برا مانے تو چپ رہتا ہے

مخمّس

پروانہ اور شمع میں چاہت نہیں رہی　　بلبل سے گل کی گرمیِ صحبت نہیں رہی
مجنوں کے ساتھ لیلیٰ کی سنگت نہیں رہی　　دنیا میں دل کو دل سے محبّت نہیں رہی
ہرگز کہیں دو شخص میں الفت نہیں رہی

سینے سے بہ گیا ہے یہ دل آب ہو کے سب　　دیکھوں تو میں جگر میں بھی باقی رہی ہے کب
جثّہ تھا جب تلک، میں اٹھاتا تھا یہ تعب　　اے دیدہ! زار زار نہ رو اس قدر کہ اب
مجھ کو بھی گریہ کرنے کی طاقت نہیں رہی

بعد از ہزار سعی کہ ہمّت دلیل ہو　　بالفرض ملنے کی بھی گر اس سے سبیل ہو
جاؤں نہ میں فرشتہ مرا گر کفیل ہو　　مجلس میں اس کی جا کے کوئی کیا ذلیل ہو
ہرگز موافق اپنے وہ صحبت نہیں رہی

صفحے سے دل کے حرفِ طمع کو اٹھائیے　　اہلِ دول سے ملنے کو ہرگز نہ جائیے
بہتر تو یوں ہے حالِ بد اپنا چھپائیے　　کیا جا کے اب کسی کے تئیں منہ دکھائیے
وقتیکہ وہ زمانے کی صورت نہیں رہی

مشہور ہے جہاں میں تو زور آور اس قدر　　ہاتھوں سے تیرے سیکڑوں، ظالم! گئے ہیں مر
کیا فائدہ جو ہووے مری جان کا ضرر　　اے غم! فشارِ دل میں نہ اتنی بھی سعی کر
جانے بھی دے کچھ اس میں تو حالت نہیں رہی

لائی قضا شکنجِ اسیری میں جب ہمیں　　مشقِ طپش میں ان نے رکھا روز و شب ہمیں
گو ذبح ہوویں وہ حس و حرکت ہے کب ہمیں　　پھڑکے ہیں زیرِ دام ہم اتنے کہ اب ہمیں

خنجر تلے تڑپنے کی حسرت نہیں رہی

اس شرمگیں کی بزم میں گر اب کے آئیے — اپنی بھی شرم کو نہ تو اُس کو دکھائیے
دیکھے بھی وہ تو آپ نہ سر کو اٹھائیے — کیا فائدہ ہے اس سے گر آنکھیں ملائیے
آنکھوں میں اس کی کچھ بھی مروّت نہیں رہی

واں گر کے ریزہ ریزہ ہو پھوٹی ہے آرسی — ہیبت سے نے اس کی سنگ سے کوٹی ہے آرسی
خادم کا ہاتھ کانپا ہے پھوٹی ہے آرسی — آتے ہی اس کے سامنے ٹوٹی ہے آرسی
ہرگز نظر سے اس کی سلامت نہیں رہی

ظاہر کی دوستی ہی رہی گو ہمارے ساتھ — اور نت ہم اس کے ساتھ پھریں، وو ہمارے ساتھ
پر یہ نہیں کہ گرمِ وفا ہو ہمارے ساتھ — آتنا رمیدہ خو ہے کہ اس کو ہمارے ساتھ
الفت تو اک طرف کہ خصومت نہیں رہی

بازی نہ کھائیو کہیں ان سے تو روئے سیاہ — آتے ہیں پیش بے ادبانہ یہ کج کلاہ
ہر چند ہو دیں چہرے میں مانندِ مہر و ماہ — اے مصحفی نہ کیجے سوے کودکاں نگاہ
اس کام میں بزرگوں کی حرمت نہیں رہی

مخمس برغزل آصفی

جب سے ہوا ہے مجھ سے وہ پیماں شکن جدا — آتش میں تن جلے ہے جدا اور من جدا
ہووے کس طرح سے یہ رنج و محن جدا — صورت گراں ہلاکم ازاں سیم تن جدا
سازید صورتے کہ بناشد ز من جدا

ہرگز غمِ معاش سے رکھتا نہیں میں درد — فکرِ معاد نے نہ کیا رنگِ چہرہ زرد
جورِ بتاں سے بھی نہیں بھرتا میں آہِ سرد — دارم زلالہ زارِ جہاں داغہا کہ کرد
یعقوب را ز یوسفِ گل پیرہن جدا

ہے بس کہ میری جان مجھے تجھ سے اتحاد
تیرے سوا کسی کی نہیں میرے دل میں یاد
جب تک کہ میں ہوں اور ہے تو ہے یہی مراد
دور از رخت مباد مرا دیدہ بلکہ باد
مردم ز دیدہ، دیدہ ز سر، سر ز تن جدا

جس وقت تیرے چہرے پہ کرتا ہوں میں نظر
ہوتا ہے اشتباہ مجھے دل میں بیشتر
بہرِ خدا تو میرے تئیں اس سے دے خبر
خال است زیرِ چشم سیاہت ز مشک تر
یا نافہ شد ز نافِ غزالِ ختن جدا

کی زندگی میں تجھ سے وفا میں نے گلبدن
ایسی کہ گل سے کر نہ سکے بلبلِ چمن
مرنے کے بعد بھی جو مرا خاک ہوگا تن
پیوند نگسلد ز سگت استخوانِ من
روزیکہ بند بند شود از کفن جدا

ہر دم تراست بر ہمہ یاران ترحمی
گاہے بخویش و گہہ بہ عزیزاں ترحمی
گاہے بہ مصحفیِ غزل خواں ترحمی
داری بحالِ زارِ غریباں ترحمی
جز آصفی کہ بہر تو شد از وطن جدا

دربیان ہجو پسر حجام

زبس آئینہ رو، ہے طفلِ حجّام
نہیں بن دیکھے اُس کے جی کو آرام
وہ گرچہ عاشقوں کا ہے کلیجا
پہ سر سہلائے کے کھاتا ہے بھیجا
اُسے ہر اک نے بالادست پایا
تبھی تو اس کے آگے سر نوانا
نہیں آئینہ ہی باچشمِ نمناک
ہے شانے کا بھی دل اس ہاتھ سے چاک

جو دیکھے انگلیاں وہ گوری گوری — بنے خورشید پانی کی کٹوری

ہے اس کے ہاتھ سے ہر ایک مفتوں — برنگِ شیشۂ حجام دل خوں

نہرنی لے کے جب وہ پاس آوے — مہِ نو بدرِ ناخن سے بناوے

حجامت اس سے بنواوے جو شایق — کرے یکبارگی ترکِ علایق

نہیں محتاج کسبت کا وہ لڑکا — ہے اس کے پاس سب ساماں مہیا

بہ شکلِ استرہ ہے تیغِ ابرو — نہیں کچھ فرق اس میں یک سرِ مو

بہ چشم و دیدۂ باریک بیناں — کٹوری چشم ہے اور شانہ مژگاں

حقِ عاشق میں بہر قطعِ اعراض — کرے ہے انگلیوں سے کارِ مقراض

کفِ دست اس کا تسمہ سنگ ہے دل — نہ کہیے کیونکر اس کو تیغِ قاتل

میسر از سرمۂ دنبالہ دارش — کہ ناخن گیر شد ہنگامِ کارش

وہ جس کے روبرو ناگاہ آیا — اسے حیرت نے آئینہ دکھایا

اگر آوے بہ قصدِ موے چینی — کرے بینی تلک باریک بینی

نہ کھینچے خامۂ مو اس کی تمثال — کہ ہے وہ عاشقوں کی ناک کا بال

ہے اس کے ہاتھ میں روزی کی مفتاح — خطِ خوباں کو دیتا ہے وہ اصلاح

نہیں ملتا وہ ہرگز صبح تا شام — کرے ہے گرم جوشی روزِ حمام

کرے جب خوش وہ کر کے مشت مالی — نہ ہو عاشق کا کیونکر کیسہ خالی

وہ ہے دنداں شکن باللہ مشہور — نہیں چوں دیگراں محتاجِ زنبور

کچھ اس میں غیرِ جلادی نہیں ہے — کہ اس کا کام فصادی نہیں ہے

ملا جب آئینے کو ایسا نائی — بنائی چار ابرو کی صفائی

سنے ہے مصحفی اب تو بھی فی الحال
منڈا کر سر کو ہو جا فارغ البال

دربیان ہجو چارپائی

یہ جو ہم پاس چار پائی ہے　　گور ہے یا کنواں یا کھائی ہے

پٹی پایے تمام ناہموار　　اور بانوں کی جھول جیسے کہ غار

کج دواکج ہے بس کہ وہ یکسر　　نعشِ گردوں کو رشک ہے جس پر

کیوں نہ دل داغِ غم سے ہووے تنگ　　کہ درندے ہوئے ہیں مثلِ پتنگ

ڈھانچہ ہے اس کا بس کہ اول جلول　　کہیں سل بیٹھتی نہیں ہے چوُل

پایے ہیں کہنگی سے زرد و سیاہ　　سیروں کا بھی حال پھر ہے تباہ

بس کہ ہے ڈھلڈھلی و پوچ و لچر　　چوُل کو روز چاہیے پچر

اس کی کستا ہوں جس دم ادواین　　اک ذرا اس گھڑی تو جائے ہے تن

لیک جس وقت اس پہ پانو دھرا　　جیسے کوئی کنوئیں میں آن گرا

بافت کی اس کی کیا کروں تعریف　　تھا وہ بافندہ بس کہ ذاتِ شریف

چھید رکھے ہزار بانوں میں　　گرہیں بے شمار بانوں میں

گر گدیلے کا اس پہ ہو بستر　　تو بھی چبھتی ہیں پھانس جوں نشتر

آکے جب رات اس پہ سوتا ہوں　　کر کے ضامن کو یاد روتا ہوں

یہ وہی ناتواں پلنگڑی ہے　　جس کو کہتے ہیں لولی لنگڑی ہے

نہ چھپر کھٹ سے اس کی نسل ملے　　نہ کھٹولے کی قسم کوئی کہے

بس کہ ہے تنگ گیر اس کا نانو　　اس پہ بیٹھے، پڑیں ہیں کاٹھ میں پانو

نیچے اونچے جو اس کے ہیں پایے　　ہیں معلّق زمیں پہ پروایے

بس کہ دل اس سے خوش نہیں ہوتا　　مارے غصّے کے میں نہیں سوتا

جب کہیں آدھی رات جاتی ہے ۔۔۔ اونگھ کے مارے نیند آتی ہے
کیونکہ اس پر کوئی دوگانا ہو ۔۔۔ گر رہے مجھ سا جو یگانا ہو
طول میں میرے قد سے بھی کم تر ۔۔۔ عرض میں میرے تن سے بھی لاغر
ایسی جب تنگ چارپائی ہو ۔۔۔ بس مسافر کی کیا سمائی ہو

اب بھی جائے تو گھر کو خالی کر
مصحفیؔ اس سے بوریا بہتر

در صفتِ اجوائن

کیا کروں وصف تیرے، اجوائن! ۔۔۔ تو ہے آرامِ جان و راحتِ تن
باوگولے کا تو نے سر توڑا ۔۔۔ رنج نے تیرے ہاتھ گھر چھوڑا
اشتہا تجھ سے صاف ہوتی ہے ۔۔۔ موت سر کو پکڑ کے روتی ہے
بھوک لگتی ہے تجھ سے صبح و شام ۔۔۔ تب تو ہے ناں خواہ تیرا نام
سوءِ ہضمی کو دیوے ہے تو شفا ۔۔۔ امتلا تجھ سے ہے اسیرِ بلا
تجھ سے فوراً ڈکار آتی ہے ۔۔۔ گلِ جاں پر بہار آتی ہے
تیسرے درجے ہے تری تیزی ۔۔۔ سونٹھ حدّت کو تیری کب پہنچی
گاہ کھوے تو سدّہ امعا کا ۔۔۔ گہ کرے بلغمِ لزج کو فنا
بلغمی صفرا جس کو ہوتا ہے ۔۔۔ تیرا اک دانہ اس کو کھوتا ہے
ہاتھ پانو ہیں جس کے ہو گٹھیا ۔۔۔ ہے تراتیل اس کا عقدہ کشا
تیری گرمی میں کچھ نہیں ہے قصور ۔۔۔ تجھ سے سردی کا دردِ سر ہو دور
بس کہ اس کی نفیخ کی ہے دوا ۔۔۔ دردو اورام تجھ سے پاوے شفا

وقتِ حاجت ترے عرق کا قطور / کرتا ہے دردِ گوشِ ریحی دور

ہڑ کے پانی نے کی بہت تیزی / پر نہ پہنچا وہ گرد کو تیری

نت تو لذت ہر ایک کی چکھے / عرقِ گھی کوار میں بھی تو ہی رہے

کوئی تجھ سے نہ پاوے بچلونا / باندھ لاوے کوئی ترا دونا

تو نہ چورن میں ہو اگر داخل / پھر وہ چورن بنے تو کیا حاصل

وے جو اجزا کو کوٹ چھانتے ہیں / جزدِ اعظم تجھی کو جانتے ہیں

قدر فلفل کی تیرے آگے نہیں / حق نے دی ہے وہ تیزی تیرے تئیں

تیرے دو دانے جو کوئی کھاوے / دو ہیں عمرِ دوبارہ وہ پاوے

درد دکھ میں جو ہووے تو درکار / جھاڑ اور پھونک کر تجھے یکبار

بعضے پانی کے ساتھ کھاتے ہیں / بعضے سوکھی ہی پھانک جاتے ہیں

الغرض خشک و تر ہے تو نافع / ہیضۂ محتبس کی بھی دافع

تجھ کو کب پہنچے زنگی ہڑ بھونڈی / پیپلا مور ہے تری لونڈی

بس کہ گرمی ہے تیری برسرِ کار / تر پھلے کا بھی سرد ہے بازار

گر تری منفعت کو پائے کوئی / نہ مربے کو ہڑ کے کھائے کوئی

جان تیرے عرق کی قیمت ہے / عرقِ بادیاں فضیحت ہے

بس کہ تو ہے محللِ بلغم / تجھ سے کٹتا ہے نت دلِ بلغم

منفعت تجھ میں ہیں نہفتہ ہزار / ریگِ صحرا ہے جن کا ہو نہ شمار

نخلِ صحت کو تن میں بوتے ہیں / تیرے دو دانے دکھ کو کھوتے ہیں

تو غریبوں کے کام آتی ہے / رخ صحت انھیں دکھاتی ہے

کوئی کھا جائے گر دو لقمے زیاد / اس کو کر دے ہے معدے میں تو اماد

تیرے دانے کو مرغ اگر کھاوے / سنگ دانہ ہو آب بہ جاوے

قسم تیری جو ہے خراسانی / اور ہے اس میں بھی تن آسانی

چوٹ کو اس کی سینک جو دیوے / پوٹلی اس کی درد چن لیوے

گر ستھوری میں ہو نہ دخل ترا ・ نہ زچہ کو ہو اُس سے نفع ذرا

اور جو کہتے ہیں تو، نہ ہو مخلوط ・ عقل ہووے نہ فربہ و مضبوط

بس کہ تو ہے عزیزِ دینداراں ・ از برائے شفائے بیماراں

دے جو قرآں کریں ہیں اکثر ختم ・ رمضاں میں کریں ہیں تجھ پر ختم

بعد ازاں ہاتھوں ہاتھ پیر و جواں ・ تجھ کو لے جاتے ہیں تبرک جاں

چاٹے کوئی تری جو پتّی ذرا ・ باغ کے باغ پھر تو کر دے ہوا

کھاوے حیواں اگر ترے اشجار ・ نہ نباتات کا رہے آثار

میں تو لاؤں اکھاڑ، پاؤں جہاں ・ بیخ و بن سب تری ہی داروے جاں

تے کے دو پھول جو ترے کھاوے ・ غنچۂ طبع اس کا کھل جاوے

باغِ جنّت میں گر نہ ہووے تو ・ میں تو ہرگز کروں نہ اودھر رو

کیونکہ واں کے جو کھائیے میوے ・ کون اصلاح ان کو پھر دیوے؟

ہو زباں تیز پات تا نہ مری ・ کس طرح کر سکوں میں وصف تری

مصحفی کو جِلا دیا تو نے ・ ق ・ شعر کا یہ صلا دیا تو نے

تیری ہمّت پہ آفریں کہیے
جانِ آدم ترے تئیں کہیے

اختلافِ نسخ

اشاریہ

لک : نسخۂ لکھنؤ

د : نسخۂ دیوبند

لا : نسخۂ لاہور۔ اوّل

(کلیات)

لب : نسخۂ لاہور۔ دوم

پ : نسخۂ پٹنہ

ش : ابواللیث صدیقی

(مصحفی اور ان کا کلام)

حسرت : حسرت : انتخاب سخن

کمال : (شاہ کمال) تذکرہ مجموعۃ الابیات

ہندی : مصحفی : تذکرہ ہندی

حسن : میر حسن : تذکرہ شعرائے اردو

آصفیہ : فرہنگ آصفیہ

نیاز : نگار (مصحفی نمبر)

گلزار : محمد ابراہیم خاں خلیل : گلزار ابراہیم

سرور : سرور : عمدۂ منتخبہ

شیفتہ : شیفتہ : گلشن بے خار

سحر : احمد حسن سحر : بہار بے خزاں

بیاض : بیاض ، انڈیا آفس لائبریری

(الف سے مصرعِ اوّل اور ب سے مصرعِ ثانی مراد ہے)

صفحہ نمبر	شعر نمبر	حوالہ	اختلاف
۱	۲ ب	لا، ش، د	ہے گردش میں
۱	۸ ب	لب، ش	سمن بر
		د، حسرت	میرے سر پہ ہو
۲	۳ ا	ش	گئے دن ..... سوتے تھے
۲	۳ ب	لب، ش	نالوں نے میرے
۲	۴ ا	حسرت	روز رؤمال بنا
۲	۷ ب	لب، ش، د، حسرت	ہاتھ ان نے کمر پہ رکھّا
۲	۸ ا	لب، ش	کیا برائی جو رہے
۲	۸ ا	لک	اب یاں بیٹھا
۲	۸ ب	ش	در پہ بیٹھا (سہو کتابت)
۲	۱۱ ا	د	دیداروں نے
۲	۱۲ ا	ش	لے تو، بھی
۳	۵ ا	آصفیہ	زخم سے اترا تھا کھرنڈ
		حسرت، ش	اترتا تھا کھرنڈ
		لا، لک، د	اترا تھا کھرنڈ
۳	۶ ا	لب، ش، د	کچھ ادا دیکھیں
۳	۸ ب	لا، لب، ش، لک، د	کہیں مکھڑا سنور چکا
۳	۹ ب	آصفیہ	نیمچہ یہ میرا
۳	۱۱ ا	لب	چہرہ خراشی دمے کشی (سہو کتابت)
۳	۱۱ ب	ش	تیرے ہاتھوں سے
۳	۱۲ ا	لا	میں رویا خونِ دل

صفحہ نمبر	شعر نمبر	حوالہ	اختلاف
۴	۲ ا	ش	روئے کا کھاتا ہے قسم
۴	۶ ا	لب، ش	ہو دیکھ
۴	۸ ا	لب، ش، د	یہیں نہ کر شور
۴	۱۲ ب	ش، لب	ہلے اب یہ گرم خوشی
۴	۱۳ ا	ش	یں تو سر فرہاد کار(؟)
۴	۱۴ ا	ہندی	میں تو کرتے
۴	۱۴ ب	ہندی	ہم سے دست آویز تھا
۵	۳ ا	لب	ہرگز نہ سوجھا (ہرگز "مرکر" پڑھا جاتا ہے)
		ش	مرکر (ہرگز؟) نہ سوجھا
۵	۴ ب	پ، لب، لک	خوں ریز
۵	۸ ب	ش	یں جو دکھلایا
۵	۱۲ ا	لک، لب، ش	کاہے کو بیٹھوں جا کے
۶	۲ ا	د، لک، پ، لب، ش	پھونکی یں اس کے جب وہ بات
۶	۵ ب	لک	اس کو تو
۶	۶ ا	ش	کام اپنا
۶	۸	پ	اس کافر کی
۶	۱۴ ب	لب، ش	تو رشتہ رہے گا
۶	۱۵ ا	د	خاک عدم کے
۶	۱۶ ا	ش	گر اس فصل یں
۷	۴ ا	ش	الٹا جو صبح
۷	۸ ب	ش	ایک دل کو تو
۷	۱۴ ا	د، لب، ش	دلِ بیمار
		پ	دلِ بیتاب
۸	۷ ا	پ، لب	کیوں قتل کیا مصحفیِ خستہ کو تو نے

صفحہ نمبر	شعر نمبر	حوالہ	اختلاف
٨	١٦ ب	لب	واں آکر کے
٨	١٧ ا	ش	یا تو آگے آئینہ دیکھتے
٩	٦ ا	ش	ہم بھی نہیں اب آشنا
٩	٩ ا	ش	یوں کب آتے تھے غش
٩	١١ ا	د، لک، لا	اس کو یہ تلوار
٩	١٣ ا	د، لب	یاں جن کو ہے یہ عشق کی
٩	١٤ ا	د	کھینچے ہے اپنی اپنی طرف
٩	١٥ ا	لب، ش	اک نگہ میں
٩	٢٠ ا	ش	وہ بھی ہے یک بیک
	٢٠ ب	ش	خوبانِ کج کلاہ کی دستار
١٠	١ ا	لا	ہم جیسے
١٠	٥ ا	ش	تجھے ہے مری قسم
		حسرت	تجھے میری ہی قسم
١٠	١٣ ب	حسرت، د	کوئی اور طرحدار
١٠	١٧ ا	د	بحر اشک کا
١١	٦ ب	ش	جس جا کہ
١١	١٨ ا	ش	تا سحر صداغ
١١	١٩ ا	ش	تو بھی فرد نہ ہوئی (؟)
١٢	١ ا	لا، لب، لک، د	کیا اب تو عشق کو
١٢	٨ ب	لک	بس توٗ، توٗ د دہی
١٢	١٦ ا	ش	آ گلے سے لگ
١٢	١٧ ا	لب	ہر بوالہوس سا ہرجائی
١٢	١٧ ب	ش	ہے مصحفی تو گردیدہ
١٣	١ ب	لب	روؤ مت

اختلاف	حوالہ	شعر نمبر	صفحہ نمبر
گردن نہیں کھلتا	لک	۲ ا	۱۳
دل نہیں لگتا	لب		
دمِ مرحوم (؟)	ش	۸ ا	۱۳
وصل میں ایسے سے	حسرت	۱۶ ا	۱۳
منہ کو شیراز کیا	ش	۳ ب	۱۴
ہم نے ذرا قصدِ حب کیا	حسرت، نیاز	۴ ا	۱۴
اگر وعدہ شب کیا	لب، ش، د	۹ ب	۱۴
باتنِ گریہ (؟)	ش	۱۲ ا	۱۴
انساں نہیں کوئی	لک	۱۴ ا	۱۴
ماہ جبیں کی	لب، ش	۱۷ ا	۱۴
زندہ نہیں کوئی مگر اک دم ہے ہمارا "لا" میں پہلے متن کے مطابق تھا بعد میں "زندہ" کا اضافہ کیا گیا۔	پ، لک	۱۷ ب	۱۴
کیا جامۂ صد چاک کو	لک	۳ ا	۱۵
مصرعوں کی ترتیب غلط ہوگئی ہے	اصل	۸	۱۵
زہر بھی مجھ کو	سرور	۸ ب	۱۵
حشر تک	لک	۱ ب	۱۶
غنیمت ہے	ش	۴ ا	۱۶
زخم سینہ پر	لب، ش	۸ ا	۱۶
کدھر کہاں وہ کنج قفس (سہو کتابت)	حسرت	۲ ا	۱۷
باہم ہوئی یوں تو دید وادید	لا	۸ ا	۱۷
وہ بھی خانہ خراب ہی نکلا	نیاز	۱۲ ب	۱۷
اک کاٹ سی ہے	لا	۴ ا	۱۹
نالہ مرا کرتا تھا ہے	لا، پ	۶ ا	۱۹
جاؤ کہیں	لا	۱۲ ب	۱۹

صفحہ نمبر	شعر نمبر	حوالہ	اختلاف
۱۹	۱۳ ب	لا، لک، پ، د	تم سیرِ گلستاں میں
۱۹	۱۴ ا	شیفتہ	میرے ہاتھ موت
۲۰	۱۲ ا	لب	صبا برگِ گل
۲۱	۲ ا	د	جب خاک تری
۲۱	۳ ا	لا	زلفوں سے میں نے اس کی
۲۱	۸ ا	لک	فلک کا ہوتا نہیں گزارا
۲۱	۱۲ ا	حسرت	میں دیوانہ ہوں
۲۲	۱ ا	حسرت	جو اس کوچے میں پہنچنا
۲۲	۱ ب	د	مرے پیغام
۲۲	۱ ب	حسرت	اپنی ہی کہنا
۲۲	۷ ا	لب	حلق میں گیا (سہو کتابت)
۲۲	۱۶ ا	لب، لک	داغِ عشق
۲۵	۳ ا	لا، لب، لک، د	صورِ اسرافیل سے
۲۵	۴ ا	حسرت	میرے جی میں رات
		لک	دہن (؟) میں رات
۲۵	۱۰ ا	حسرت	جو میں اے مصحفی
۲۵	۱۸ ب	د، حسرت	اس باب میں
۲۶	۱ ب	لک	تکیۂ پہلو کیا
۲۶	۳ ا	لب	جی سے اترتا
۲۶	۳ ب	لب	رفتہ رفتہ اس نے ہے
۲۶	۸ ا	حسرت	چین ہی جاتا رہا ہے
۲۶	۱۰ ا	لب	جس کو نہ لگا
۲۶	۱۷ ا	لب	نت فرشِ گلیم
		لک	فرشِ گلیم لکھ کر قلم زد کیا گیا ہے

صفحہ نمبر	شعر نمبر	حوالہ	اختلاف
۲۷	۶ ب	د، حسرت، نیاز	پسِ پردہ سے
۲۸	۱۵ الف	د	اس شوخ نے دو ہیں
۲۸	۱۶ الف	د	ترے عود کے مانند
۲۹	۱۴ الف	د	مژدہ پہنچا
۳۰	۸ ب	لا	اب تیری زباں دانی کا
۳۰	۱۶ الف	لب	چمن میں چیں بجبیں
۳۱	۳ الف	حسرت	ملنے کا مانع
		لا	ملنے میں مانع
۳۱	۵ الف	د، لا، لب	ضعف تر
۳۱	۷ الف	حسرت	اس چمن میں
۳۱	۷ الف	لک، لب	لباسِ عشق
۳۱	۸ الف	لب	مطرب پسر کی دست درازی کو دیکھیے
		حسرت	مطرب پسر کو دست درازی کی مشق ہے
۳۲	۱۲ الف	لا	تجھے جب کہ ہم راہِ اغیار دیکھا
		لب	تجھے جب سے
۳۲	۱۲ ب	د	منہ اپنا
۳۳	۲ الف	د	سمجھے وہ نہ مومن
۳۳	۵ الف	د	دیکھ کر وہ بولا
۳۳	۷ الف	حسرت	زلفوں کی برہمی نے
۳۳	۸ ب	حسرت	بے گمان مارا
		لب	بے تکان
۳۳	۱۳ ب	د	خبر تھی جی رات
۳۴	۶ الف	لا	نہ قطرہ اشک نے
۳۴	۱۷ الف	د	تیز تیغ آیا نظر

صفحہ نمبر	شعر صفحہ	حوالہ	اختلاف
۳۵	۸ ا	لک	آہ جاتی ہے
۳۶	۳ ا	د	موجہ (؟) اس کام کا تو ہے
۳۷	۲ ب	لب	پانو کا بھی دھمکانا
۳۷	۲ ا	د	مل گیا
۳۷	۱۰ ا	لب	کوئی دار پر چڑھا ہے کوئی تیغ تک رہا ہے
۳۷	۱۳ ب	د	کیا جانیے گیا ہے
۳۷	۱۴ ب	لب	نقشا بھی ہم وہاں کا
۳۷	۱۶ ب	د	ہاتھ اٹھا
۳۷	۱۷ ا	لا	منہ چھپایا
۳۸	۱۵ ا	لب	مشتاق یہ دل برسوں
۳۸	۱۴ ب	حسرت	نقشا کچھ
۳۹	۱ ب	حسرت د، لب	جو صید گہ میں تیری آیا قضا کا مارا
۳۹	۴ ب	حسرت	ٹکڑے پڑا ہوا تھا
۳۹	۹ ا	لب	بیاباں کی تو دیکھے
۳۹	۱۲ ب		وہ کشتۂ غم
۴۰	۱۲ ا	حسرت	آتا ہے مجھ کو یاد
۴۰	۱۸ ا	د	لیکن اک دن
۴۱	۱۶ ا	لب	عشق تو کیا
۴۲	۱۰ ا	د	انگلیاں جن کی (؟)
۴۲	۱۱ ب	د، لب	بے کسوں کا
۴۲	۱۳ ب	د	صحرا کے کرگسوں کا
۴۳	۲ ا	د، پ، لب	جوں دیا منہ ان نے کھول
۴۳	۶ ب	د	جب خدا ے دوست (سہو کتابت)
۴۳	۱۴ ا	ش	تب کرتے ہو رم کیا

صفحہ نمبر	شعر نمبر	حوالہ	اختلاف
۴۳	۱۷ ب	د	زیادہ موقلم کیا
۴۵	۲ ب	د	گردش میں ہی
۴۵	۳ ا	لک	بستہ بوں کے
۴۵	۳ ب	پ، لا	حکم اس کی دم تیغ کو ہے آب رواں کا
۴۵	۸ ب	لک، د	حسن بتاں کا
	۱۰ ا	لک، پ	دوٗر پہنچی ہے
	۱۶ ا	د	باتوں میں کوئی اس کی
	۱۷ ب	پ، لب، د	خم مارا
۴۶	۳ ا	پ، لک	لبِ جاناں
	۹ ا	پ، لک	کہتا تھا
	۱۲ ا	پ	نہ کوئی بولو
۴۷	۱ ب	د، لب	جو شانے کے ہاتھ سے
۴۸	۷ ب	لک	بیاں کیا کیجیے البتہ
۴۸	۸ ا	لک، پ	سیج کو بنا
۴۸	۱۰ ا	لک، لب	سنگیں دلاں
۵۰	۱ ب	د	سوئی تاگا
۵۰	۱۵ ا	لک	چرخ پر
۵۰	۱۷ ب	لک، د	سیج تو کہہ
۵۲	۲ ب	لب، د	رسوا کر دیا
۵۲	۵ ا	لک، د	دی ملی ساقی نے
۵۲	۱۸ ا	د	مارے ڈر کے کچھ اس سے
۵۴	۳ ا	لب، د	ساتھی ہو
۵۴	۱۴ ب	د	نہ کبھی تارا
۵۴	۱۵ ا	لب	آئینے کا

صفحہ نمبر	شعر نمبر	حوالہ	اختلاف
۵۵	۲،۶	لا، لب، د، حسرت	بالش سر سے گزرا
۵۵	۸ ا	حسرت	اے مصحفی
۵۵	۱۲ ا	حسرت	رکھے گا واں قدم کو
۵۶	۸ ا	د	رہتے ہیں کیا بلا واں
۵۶	۱۵ ا	د	جفا کی کریں
۵۷	۸ ا	حسرت	آوارہ پڑا رہتا ہوں
۵۷	۱۶ ا	د	کوئی گبرو کوئی مسلماں کوئی جمع کوئی پریشاں
۵۹	۱۲ ا	د	اور تو بیٹھے بھی
۵۹	۱۴ ا	د	باقی نہ رہی
۵۹	۱۵ ا	لب، لک، د	اب تو کچھ مجھ کو یہ پھیکا سا نظر آتا ہے
۶۰	۵ ا	آصفیہ	حمام کی طرف جو گیا بہر غسل تو
۶۰	۶ ا	لا	دشتِ عشق میں
۶۰	۹ ب	حسرت	دیدۂ رخسار
۶۰	۱۲ ب	لب	ان آنکھوں سے
۶۱	۳ ا	لب	بھلا اے دوستوں
۶۱	۴ ا	حسرت	کبھی اشک
۶۱	۱۳ ا	لک	آخر کو مہتاب (؟)
۶۱	۱۵ ا	لب، د	روز سجدہ کریں تھے
۶۲	۱ ا	ہندی	وہ صیدِ رسن بستہ
۶۲	۱۳ ا	حسرت	خجلت سے ہاتھ میں
۶۲	۱۴ ب	حسرت	دامان رہ گیا
۶۲	۱۱ ب	حسرت	ہم الم اپنا
۶۴	۲ ب	د	مرے سینے ہی میں
۶۵	۵ ا	لک	اک اس زمیں میں ہی تو اور اے مصحفی کہہ جا

صفحہ نمبر	شعر نمبر	حوالہ	اختلاف
۶۵	۸ ا	حسرت	غمیں (؟) ہم کو دکھاتا ہے
۶۵	۱۱ ا	لب، حسرت، د	نت اے عشق
۶۵	۱۳ ا	حسرت	کیا گزرا اسیروں پر
۶۵	۱۴ ا	د	ہم امید رکھتے تھے
۶۵	۱۷ ا	لک	یہ روشن
		د	یہ یارب
۶۵	۲۰ ب	د، حسرت	نہ لے تو آگے میرے نام
۶۶	۱۰ ا	د	قبول، اٹا
۶۷	۴ ا	لب	ہرگز نہ تاب لایا
۶۷	۱۲ ا	حسرت	کیا دیکھتا ہے لے بھی
	۱۲ ب	حسرت	ہو آپ یار ساقی شراب جام لایا (؟)
۶۸	۱۰ ا	لب، د	یہ کہتے
	۱۰ ا	لا، د	ہو جاگی صبح روشن
		لب	ظالم یہ وصل کی شب
۶۹	۳ ا	لا، لب، د	شب ہجران میں میری
۷۰	۸ ب	د	نامۂ آمال (سہو کتابت)
۷۰	۱۰ ا	د	عذاب جحیم تھا
۷۰	۱۵ ا	حسرت	کہ باغ میں
۷۰	۱۷ ب	حسرت	مارے اشک (؟) کے
۷۱	۱۵ ا	د	پار کیسے شتاب
۷۱	۱۳ ا	د	رفتار تو دیکھو
۷۳	۱۱ ا	سرور	وہ جوانی تھی (؟)
۷۳	۲ ا	لا: لالی، لک: لالہ، د: لعلی	
۷۴	۲ ا	د	جاگتے تھے یہ نصیب اپنے

صفحہ نمبر	شعر نمبر	حوالہ	اختلاف
۷۵	۵ ا	حسرت	تم نہ کہتے تھے
	۱۱ ب	لب	مر گئے ، چھوٹ گئے
۷۶	۱۰ ب	لک	عرش ناساز (؟)
	۱۲ ا	لب، لک، دل	دیتا ہی نہیں
۷۷	۷ ب	لب، لک	یہ بھی ہوتی ہے
۸۰	۱ ب	د	کہیں میں
	۲ ا	ش	رہا پر دل
۸۱	۸ ا	د	نہ کر مجھ سے تو
۸۱	۱۴ ا	لا، د	رنگ و رخ سے
۸۳	۵ ب	لا	جھڑ پڑے
۸۴	۹ ا	لب، د	عرق آلودہ یار
۸۶	۱ ب	د	صورت پرست
۸۶	۸ ب	د	دیکھی ہے
۸۷	۶ ب	د	اس باغ سے
۸۷	۱۱ ب	د	ہم پھریں
۸۸	۱۲ ا	د	عاشق ترسا کا
۸۹	۹ ا	د	اس گلِ بیتاب کو
۸۹	۱۷ ا	د	ہے لاش پہ
۹۰	۱۲ ب	د	ہے کیا علاج
۹۱	۳ ا	لا، لب، د	سو آگے ہی پڑھ چکے
۹۲	۸ ا	د	جھکے پھرتے ہو تو
۹۲	۱۱ ا	د	شور بیجا نہیں مرزائی کا
۹۲	۱۷ ا	د	نہ کیوں خون میں لوٹیں
۹۳	۱ ا	د	اپنے جی پر

صفحہ نمبر	شعر نمبر	حوالہ	اختلاف
۹۳	۱ أ	حسرت	اپنی جن نے
۹۳	۴ أ	لا، د	کیا چھپے کریں تھے
۹۳	۷ أ	د	نکل پڑے ہے
۹۳	۱۲ أ	د	زخمیِ تیغِ زبانِ شمع
۹۴	۲ ب	د	محل کے بیچ
۹۴	۴ ب	لا، د	اپنا دیوانہ کی طرح
۹۴	۱۳ ب	لا	بس کہ لتی تھی
۹۵	۸ أ	د	تھی دیدنی
۹۸	۴ ب	د	مشہور غلط ہے یہ
۹۸	۱۳ ب	د	تپ والے کو
۹۹	۲ ب	د	ہوا تو تو میاں سرد
۹۹	۱۳ أ	د	ہم اس کا عجب نہیں
۹۹	۱۶ أ	لا	چہرے پہ ایک کے بھی
۱۰۰	۱۲ ب	لا	شب سے سحر سفید
۱۰۲	۴ ب	لا	ہوئیں آخر کو ہم
۱۰۳	۶ أ	لب	اُس نے یارب
۱۰۵	۸ أ	د، لا	چوبِ قفس کو بنا کر
۱۰۶	۷ ب	د	یوں ہی ہو جاویں گے
۱۰۶	۱۶ أ	د	افسوس کہ ہوئے تڑئیں
۱۰۸	۸ أ	لا	اُنکو تو یار ذبح کیا
۱۰۹	۴ أ	لک، لا	جیتا کوئی نہ آیا
۱۰۹	۴ ب	لک،	جائے تو جا سمجھ کر
۱۰۹	۸ أ	حسرت	بے (بے ؟) دیدۂ تر
۱۱۰	۱۵ أ	د	رنت تو رہ رواں

صفحہ نمبر	شعر نمبر	حوالہ	اختلاف
۱۱۳	۴ ا	سرور	میری جان اُتارا
۱۱۳	۱۰ ب	د	اب اُس کے سبھی رہتی ہے
۱۱۴	۱۲ ا	حسرت، د	عجب ڈھنگ دیکھا
۱۱۵	۹ ب	لک	اک پڑے تھے
۱۱۵	۱۰ ا	د	کہیں خدا
۱۱۶	۱۰ ا	د	خوب رُوتو
۱۱۶	۱۱ ب	حسرت	پھرتا ہے ہر گلی میں
۱۱۷	۲ ب	حسن	قابل خیز
۱۱۸	۳ ا	لا	آنکھیں جب سے کھلیں
۱۱۸	۱۵ ا	گلزار	آگیا خط
۱۱۸	۱۵ ب	گلزار	ڈھپ پہ
۱۱۹	۱ ب	لب، د، لک	لگا رہتے ہیں
۱۱۹	۱۴ ا	لب	مرے پر ہے وہ سارا
۱۲۰	۳ ب	لب	بر سر طاؤس
۱۲۱	۱ ا ب	لب، د	شعر کی ترتیب الٹی ہے
۱۲۲	۹ ا	د، لب، لک، سرور	کیوں نہ یہ زلف پھنسے
۱۲۳	۱ ب	لک	لوگ سب جمع ہوئے
۱۲۳	۲ ا	حسرت	رنگِ معشوقیِ صیاد
۱۲۳	۶ ا	د	ایسے عالم سے
۱۲۳	۷ ب	لک	دیکھتے کب تلک
۱۲۳	۱۳ ا	لب	خواہشِ رخسار میں جاں دیتا ہوں
۱۲۴	۲ ب	لب	واں دل سے ہی افزائش
؍؍	؍؍	حسن	واں اتنی ہی افزائش
۱۲۴	۶ ب	حسن	اُس سے بھی فرمائش

صفحہ نمبر	شعر نمبر	حوالہ	اختلاف
۱۲۴	۹ ا	لب، حسن	دیکھئے کیا صورت ہو
۱۲۵	ب	د	دیکھی نہیں
۱۲۵	۷ ا	حسرت	صرف میں لاؤ
۱۲۵	۱۵ ب	د	ے ہاتھوں پہ
۱۲۶	۹ ا	لا، د	تیرے جی سے اخلاص
۱۲۷	۳ ا	د	کیا عیب کوئی دیکھ کے بتلادے
۱۲۷	۱۴ ب	د	اُس کا غبار عارض
۱۲۸	۱۱ ا	د	کھینچا ہے گرچہ
۱۲۸	۱۲ ا	پ، د	شراب سرخ
۱۲۹	۴ ا	د	نے بار شمع
۱۳۱	۲ ب	د	کچھ کچھ کھلا رہے گا
۱۳۲	۴ ب	د	اب پھر مدام تیغ
۱۳۲	۷ ا	پ	ابرو مژگاں سے
۱۳۲	۱۱ ب	حسرت، د	چھنائی تیغ
۱۳۳	۱۲ ا	د	بیٹھے ہیں بجاں آمدہ
۱۳۳	۱۳ ب	د	ترے خوں میں
۱۳۴	۸ ب	لب، د	جاوے کہی
۱۳۴	۱۰ ا	لب، د	جب لعلِ لب سے ہو ہے تو اپنے گہر فشاں
۱۳۴	۱۶ ب	پ	کم بخت ایک ہم ہی
۱۳۵	۷ ا	د	برگشتہ بختی پر نہ ہنسو میری دیکھو تم
۱۳۵	۷ ب	لب	میاں نام کی طرف
۱۳۶	۷ ا	د	ان باتوں کے تئیں
۱۳۸	۱ ا	لا، د	خلق اگر
۱۳۸	۷ ب	د	ہو جاہے

صفحہ نمبر	شعر نمبر	حوالہ	اختلاف
۱۳۹	۳ ا	لا	کوچے پہ اُس کے
۱۳۹	۱۳ ب	د	پھر ہوئی ہے رسائی ہم کو کمر تلک (؟)
۱۳۹	۱۷ ا	د	جو میں لکھ لکھ کے
۱۴۰	۱ ب	د	تیرے جگر تلک
۱۴۱	۳ ا	آصفیہ	اے شوق
۱۴۱	۲ ب	آصفیہ	نہ آتے جاتے تو لانگھ
۱۴۱	۱۰ ب	لب	خنجر قاتل
۱۴۱	۱۶ ا	د	جائے سپند عود جلانا
۱۴۲	۵ ب	حسرت	زخموں میں چرا تا ہے
۱۴۳	۴ ب	د	اور رہا تھ ہیں دونوں
۱۴۳	۵ ا	د	نمود کم تھی
۱۴۳	۸ ا	لا	کبھی تیرے دام تک
″	″	لب	کوئی تیرے دام تک
۱۴۴	۵ ب	د	آتی ہے ان کے رنگ میں
۱۴۴	۱۲ ا	د	میری تربت کو (؟)
۱۴۵	۱ ب	د	آنکھوں میں ہی پھرتی
۱۴۵	۴ ا	د	ہو چکے وہ دِل
۱۴۶	۱۱ ا	حسرت	لب بستہ
۱۴۶	۱۵ ا	حسرت	ہو گئے خاموش
۱۴۷	۶ ب	د	ہے مصحفی یہ ہی تو مری
۱۴۷	۱۱ ا	د	سُنی نہ دیکھی
۱۴۹	۱۱ ا	د	ترے حسن لب نے؟
۱۴۹	۱۳ ب	د	مسکنے سے
۱۵۰	۲ ب	سحر	لب سے میں اپنا

صفحہ نمبر	شعر نمبر	حوالہ	اختلاف
۱۵۰	۱۷ ا	د	ازبس کہ ڈال رکھے ہیں
۱۵۱	۴ ا	د	جو اہلِ جوش
۱۵۲	۸ ا	لا، لب، د	دل کی نافہمی سے اپنا جی تو اب گھبرا گیا
	۱۸ ا	د	باغ سے جاتے
۱۵۳	۲ ب	لک، د	رات میں دامن میں کر بہم
۱۵۴	۱۲ ا	د	خوش ہونے کا نئیں
۱۵۵	۷ ا	لا، لب، د، لک	کسی سے
	۸ ا	حسرت	گر مجلسِ خوباں میں ذرا سیر کی باہم
	۱۴ ا	لا، لب، د	کیا وصل شب کا میں کہوں
۱۵۶	۱ ا	حسرت	پیش ازیں
	۴ ا	د	یہ بھی کوئی انصاف ہے
	۵ ا	د	وائے بے خبری
	۱۱ ا	لب	ہائے کوئی پیچھے
		د	ہائے گو پیچھے
۱۵۷	۱۲ ب	لب	بند کب کی
۱۵۸	۲ ب	لا، لب، لک	اپنی جان
۱۵۹	۷ ب	د	سو پھر ساماں کہاں
	۱۱ ا	د	اس شوخ سے کھا رہتے ہیں
۱۶۰	۲ ب	د	خلق بسمل
	۵ ب	پ	شمارِ آستین
	۷ ا	ث	کیا کیا ہوں (؟)
۱۶۱	۶ ب	آصفیہ	یہ خوش جنھوں کی
	۷ ب	د	طفلوں میں

صفحہ نمبر	شعر نمبر	حوالہ	اختلاف
۱۶۱	۱۶ ا	د	اے یارد
	۱۶ ب	لب	مت پوچھ تیرے روبرو
		لک	مت پوچھ، تجھ سے
۱۶۲	۷ ب	لا	بٹھار کھے کون
۱۶۳	۱۳ ب	د	کھولی کبھی سو ہم نے
	۱۴ ا	لب	سر کو پیٹتا ہوں
۱۶۵	۵ ب	د	ہاتھوں کے تئیں
	۶ ا	د	کبھی کھاتا ہے وہ گریبان
	۱۵ ا	د	اک جلوہ
۱۶۶	۱۷ ا	لب	کوئی داد
۱۶۷	۱۶ ا	حسرت	تجھ کو بتاؤں کیا
۱۶۸	۱ ب	حسرت	غضب کی ہوتی ہیں
۱۷۰	۲ ب	د	کون وہ مرغِ چمن ہے
	۱۱ ا	د	روتا چلا ہے
۱۷۱	۵ ا	د	مشکل ہووے
	۱۱ ب	لب	کبھی ہوتا ہے
۱۷۳	۱۰ ب	د	یا کہ اب
۱۷۶	۱۴ ب	د	جو مرضیِ اللہ ہی نہیں
۱۷۷	۱۳ ب	حسرت	یہی تو
	۱۴ ب	حسرت	میں جب ناچار ہو کر
۱۷۹	۲ ب	پ	سو ہووے ہے
		د	سو ہووے یہ شفائی کہاں
۱۸۰	۴ ا	حسرت	سن بعد مرگ (؟)
۱۸۱	۱۰ ا	د	ایک دن در پہ کھڑا

صفحہ نمبر	شعر نمبر	حوالہ	اختلاف
۱۸۲	۴ ب	سرور	کردن چشم میں
۱۸۴	۱۴ ب	د	کرزرافشاں
۱۸۵	۱۹ ا	پ	مجھ سے ہر دم
۱۸۷	۱۴ ا	پ	جان اپنی
۱۹۱	۹ ب	لک	پھر جو کوئی
۱۹۴	۱۱ ب	پ	یا خود ہی میں شاہد ہوں (یہی قرین قیاس ہے)
۱۹۵	۴ ا	پ، لک، لب	کس طرح میں نہ باندھوں
۱۹۵	۱۵ ا	د	آنسوؤں کا ہے مجھے اپنے
۱۹۶	۱۱ ب	آصفیہ	آپ نے دیکھے تو نہیں
۱۹۶	۱۲ ا	پ	میں قربان کہیں
۱۹۷	۶ ا	لک	درد محبت کی دوا
۱۹۷	۱۷ ب	د	لہروں کے ہاتھ میں ہے جو تلوار ننگیاں
۱۹۹	۳ ا	د	کبھی اُس پر
۱۹۹	۱۵ ب	د	اُس کی خانماداروں سے مت پوچھ
۱۹۹	۱۶ ب	پ	خرابی شہر کی
۲۰۰	۶ ب	د	ہائے اُس روز
۲۰۰	۹ ب	اصل	فساد (سہو کتابت)
۲۰۰	۱۱ ا	پ، د	ہر نخل جو آ
۲۰۱	۱۵ ب	حسرت	بہتے دو
۲۰۱	۱۷ ا	د	آپ ہی پھر
۲۰۲	۱ ا	پ	فتنہ نہیں ہے کہ وہ
۲۰۳	۱ ا	پ	اور نہ بام پر آوے
۲۰۳	۵ ب	د	گی بحال تباہ (سہو کتابت)
۲۰۳	۶ ا	پ	تم کہو سو بار اگر

صفحہ نمبر	شعر نمبر	حوالہ	اختلاف
۲۰۳	۱۲ ا	پ	تو بھی مر نہیں جاتا
۲۰۳	۱۵ ب	د	آستاں سے دور ہو
۲۰۴	۸ ب	پ	چل بے یاں سے دور ہو
۲۰۴	۹ ا	د	لیک گر آیا
		پ	منہ سے منہ اُس کے لگا
۲۰۴	۱۰ ا، ب	سرور	ادھر دیکھو، کدھر دیکھو
۲۰۴	۱۰ ا	پ	آؤ نہ ادھر کاٹ لو تن سے مرے سر کو
۲۰۵	۷ ب	پ	دیکھ دل
۲۰۶	۹ ب	پ	بے طرح پہ
۲۰۶	۱۲ ب	لک، د، لب	تو ہاتھ سے
۲۰۷	۱۱ ا	د	خامے کو لیجائے (سہو کتابت)
۲۰۸	۹ ا	د	برسر دل تیری ہے (؟)
۲۰۹	۶ ب	د	وہیں میاں چرا لو
۲۱۰	۱ ب	د	دل بے جگر
۲۱۰	۱۷ ا	د	چھپائے ہوئے تم جاتے ہو
۲۱۰	۱۸ ب	د، پ	نہیں ہونے کی صلح
۲۱۱	۱ ب	سرور	کس گشتنی پہ یار بتا خشمگیں ہے تو
۲۱۱	۹ ب	پ	خاتم پہ چشم میری کے
۲۱۱	۱۱ ب	پ	جو اس قدر ہے اندوہ گیں
۲۱۱	۱۶ ب	پ	کچھ اُس کی جیب تنگ تو
۲۱۳	۱۲ ب	پ	جا بے کیوں آیا
۲۱۳	۵ ب	پ	آئے ہم بھی تو ہیں
"	"	د	آئے ہم بھی تو ہیں
۲۱۴	۱ ا	پ	تب تو شب سے

صفحہ نمبر	شعر نمبر	حوالہ	اختلاف
۲۱۴	۵ ا	پ	اُس نے چمن کے
۲۱۴	۷ ب	پ	تم ہمارے پاس بھی ایک شب کو
۲۱۵	۶ ا	د	رگ نیچے (سہو کتابت)
۲۱۵	۹ ا	د	دل سے تصویر (سہو کتابت)
۲۱۵	۱۷ ب	پ	کس بات پہ چیں بہ جبیں
۲۱۵	۱۸ ا	پ	باندھو تو سر میرا
۲۱۶	۱ ا	د	کچھ مجھ کو نہیں کام کسی سے
۲۱۷	۲ ب	د	مجلس سے تیری رفع
۲۱۷	۵ ا	ہر نسخے میں	دے ڈالو (ڈالیو) دل مصحفی
۲۱۷	۶ ا	د	ہم نے چاہا تھا کرنیکو
	۶ ا	سرور	آج جاناں پہ نگاہ
	۶ ب	سرور	اکثر سرِ مژگاں پہ نگاہ
۲۱۷	۱۳ ا	د	ہم تو مدت ستی
۲۱۷	۱۴ ب	پ	ان اوراقِ پریشاں
۲۱۷	۱۵ ا	د	ڈرپے اُس چشم سے
۲۱۸	۲ ب	پ	نرگسِ چشم کے
	۶ ا	سرور	جس جاکہ
۲۱۹	۷ ا	گلزار	وہاں کلفتِ دل
۲۱۹	۸ ا	د	شہیدوں کو ترے
"	"	حسرت، پ	شہیدوں کو مرے
۲۱۹	۸ ب	د	جوشِ خوں سے ہے یہ خود
۲۱۹	۹ ب	د	سو شرار آلودہ
۲۲۰	۱ ا	پ	دل کہ خون شیشۂ مے
۲۲۰	۴ ا	پ	ہم کو حیرت

صفحہ نمبر	شعر نمبر	حوالہ	اختلاف
۲۲۱	۶ ا	د، لا	اُس کا شکست
۲۲۱	۱۲ ب	د	دو چار آئنہ (سہو کتابت)
۲۲۲	۳ ا	د	قاتل ہے کون
۲۲۲	۱۲ ب	پ	ٹک بھی تو میاں
۲۲۲	۱۳ ب	پ	ہے یہ بھی کوئی چال
۲۲۳	۷ ا	د	گر اُس کا
۲۲۳	۱۶ ا	لک، ب، لب	ڈوبے دل دیکھ
۲۲۵	۱۷ ا	د	کبھاوے اُس کو
۲۲۶	۵ ا	پ، لک	دنیا سے سفر کرتا ہے
۲۲۶	۹ ا	پ	جلی شب
۲۲۶	۱۰ ا	پ	ہرگز نہ اُٹھیں گے یاں سے
	۱۷ ا	آصفیہ	دمبدم سینے میں نالہ ہے دم سرد ہے آہ سر اٹھانے نہیں دیتا ہے یہ کچھ درد ہے آہ
۲۲۷	۱ ا	سرور	جگہ تھا پیکاں (پیکاں ہی قرین قیاس ہے)
۲۲۷	۱ ا	لا، لب، پ، د	گئے وے دن
۲۲۷	۲ ا	د، پ	کو نصیب
۲۲۷	۵ ا	پ، د	میں دکھلایا
۲۲۷	۱۴ ا	پ	دونوں جہاں ہم
	۱۷ ب	سرور	اور ظالم مرے جگر کو
۲۲۸	۶ ب	پ	دل تو ٹک خوش ہے
۲۲۸	۱۶ ا	بیاض، زیبا	جو آنکھ
۲۲۹	۴ ب	پ	ہماری بھی چشم زار
۲۲۹	۱۷ ب	پ	اک دل خستہ میں
۲۲۹	۸ ا	سرور	آخری ہم سے سنو

صفحہ نمبر	شعر نمبر	حوالہ	اختلاف
۲۳۲	۱۳ ا	د، لا	برقعہ ہے یا
۲۳۳	۱۷ ا	د	ڈھٹائیاں اُس کی
۲۳۳	۶ ا	د	کہو تم کدھر اور کہاں بیٹھے
۲۳۳	۸ ا	پ، لک	یاں آئیے
		د	یہ آئیے
۲۳۳	۱۲ ا	پ، لک، الب	تم آنکھوں میں بیٹھے ہوئے ہو
۲۳۳	۱۵ ب	سرور	پردے سے (دل سے ؟) ہیں اس
۲۳۴	۲ ا	د	یہی نکلے ہے آواز
۲۳۴	۳ ب	لک	اللہ کے ہیں
۲۳۴	۴ ا	د	کبھو کا ہے
۲۳۴	۱۷ ا	پ	جس رہ میں
۲۳۵	۱ ا	پ	ہم کو رہنا تھا
۲۳۵	۴ ب	پ، لک	اک بدلی
۲۳۵	۱۶ ا	د، لک	عجب مزا ہو
۲۳۶	۵ ا	لا، پ، د، حسرت	خط لکھ لکھ
۲۳۶	۱۳ ب	لک	اُس کو کوئی
۲۳۷	۱۷ ب	پ	کنوئیں میں
۲۳۸	۱۱ ب	پ	کیا کیا جھمکے
۲۳۹	۸ ب	د	قرض عام
۲۳۹	۱۳ ا	لک	کیوں آنکھ جھکے
۲۳۹	۱۵ ب	لک، د	دے خوں کے
۲۳۹	۱۸ ا	لا، لک، د	دے میاں
		پ	وہ میاں
۲۴۰	۲ ا	پ، لک	کیا عہد وفا

صفحہ نمبر	شعر نمبر	حوالہ	اختلاف
۲۴۰	۹ ا	حسرت	شاعر وہ ہے جو ایسی زمیں پر
۲۴۰	۱۱ ا	د	ٹک دلِ بسمل
۲۴۱	۳ ب	د	رگِ فتراک
۲۴۲	۷ ب	پ	درپے صد جستجو
۲۴۳	۸ ب	پ	سب پانو پھیلائے ہوئے
۲۴۳	۷ ب	سرور	کھپڑ کاٹے ہوئے
۲۴۵	۸ ا	لک	اِس آنے میں جانے میں
۲۴۵	۱۴ ب	پ	گلُ سے کلی
۲۴۸	۳ ا	ہندی	نزاکت کو نظر کیجیو
۲۴۸	۶ ا	ہندی	میرے پہلو سے
۲۴۸	۱۰ ا	پ	کیا حصول ہے
۲۵۰	۶ ب	پ	بلائے جاں ہے ہوتی
۲۵۲	۱۵ ا	د	کھینچ اُس کو اک دن
			(حاشیہ پر لڑکے)
۲۵۳	۳ ب	د	سدا (سہوِ کتابت)
۲۵۳	۵ ب	د	تو اب مار اُٹھا ہے
۲۵۴	۸ ا	لا، د	گریہ وزاری کرتے
۲۵۶	۱۲ ا	اصل، لا، پ	اب تلک آنکھوں سے
۲۵۷	۴ ا	اصل اور ہر نسخے میں	اگر ٹک کی ہے ہم نے جنبش (ناموزوں)
۲۵۷	۱۲ ا	پ، لک	اُسی کو کہتے ہیں سنا ہوئے گا
۲۵۸	۳ ب	اصل، د	جو اک ہم
۲۵۸	۶ ا	د	باندھتے ہو تو کیا
۲۵۸	۱۴ ب	اصل، د، لا	ہیں ایسے کہاں
۲۵۹	۲ ا	د	نہ اُس سے ملیے

صفحہ نمبر	شعر نمبر	حوالہ	اختلاف
۲۵۹	۸ ا	د	پھیری نہ ہرگز
۲۶۰	۲ ا	حسرت	ہم نے لالہ (؟)
۲۶۰	۵ ب	د	جیسے شب چراغ
〃	〃	حسرت	مثلِ چراغ
۲۶۰	۷ ا	حسرت	کون آیا ہے
۲۶۲	۶ ب	د	میں ادھر ترسوں ہوں
۲۶۲	۹ ب	د	دعویِ محشر
۲۶۳	۱ ا	پ	اُس بے گناہ پر
۲۶۳	۱ ب	پ	غوغائے خلق ہے
۲۶۴	۸ ب	لا، د	صحبت کہاں رہی
			(اصل میں۔ صوبت پڑھا جاتا ہے۔ صحبت ہی ہونا چاہیے)
۲۶۵	۴ ب	د، لب	ہم ایک ہی اُس کی
۲۶۶	۱۳ ب	د	زباں نہ ایک دن
۲۶۸	۱۶ ا	حسرت	جُز درد و غم
۲۶۹	۱۲ ا	حسرت	اُس شوخ کو عاقل
۲۷۰	۹ ب	پ	نعش گردی ہے
۲۷۱	۵ ب	پ	کیسے ہی بنے
۲۷۱	۱۵ ا	د	نامے کو یوں مت
۲۷۳	۸ ا	حسرت	آغازِ صبح
۲۷۴	۹ ا	حسرت	جانفشانی
۲۷۶	۱۰ ا	پ	اُس شمائل کا
۲۷۶	۱۴ ا	د	عین آفت میں
۲۷۷	۱۵ ا	د	اے دلِ دیوانہ
۲۸۰	۱۳ ا	پ	ماریوں ڈالتے نہیں

صفحہ نمبر	شعر نمبر	حوالہ	اختلاف
۲۸۰	۱۵ ب	د	جاتا ہے کہاں
۲۸۴	۱۷ ب	د	کرتے ہیں یوں صفا
۲۸۷	۱۰ ا	پ	نرگس پہ تم نگاہ
۲۸۸	۳ ب	د	دیکھا جواب
۲۸۸	۱۳ ب	د	خاکِ کربلا سے ہی
۲۹۰	۵ ب	پ	رہنے کا ٹھکانا
۲۹۰	۷ ب	پ	بہانہ چاہیے
۲۹۰	۱۲ ا	د	اے عشق اب کے وہ تری
۲۹۱	۲ ا	پ	عشق کی ہم کو کھلاتا ہے قسم
۲۹۱	۱۲ ا	د	جوں ہی ڈالی
۲۹۲	۱۶ ا	پ	نہ آتا تھا جن کو خواب
۲۹۵	۱۷ ا	د	یار کے قابو میں
۲۹۷	۷ ا	د	شیریں تو دیکھ کر
۲۹۸	۱۳ ب	د، پ، لا	عاشق کو وقت وقت
۲۹۸	۱۶ ا	پ	اجل لگائے ہوئے گھات
۲۹۹	۵ ب	د	اور مسی پر ہے
۲۹۹	۱۶ ا	پ	نہ کچھ سراغ
۳۰۰	۱ ا	پ	جو مجھ کو یار
۳۰۰	۱۵ ب	پ	مگر خدا سے
"	"	لب	گہر خدا سے
۳۰۱	۹ ا	لب، پ	کہا تھا میں بوسہ
۳۰۲	۴ ا	د، لا، لب	خالی ہی گزرے
۳۰۴	۴ ب	پ	وہ بھیجے گا
۳۰۵	۵ ا	لا، لب	گریباں کے تئیں ہے

صفحہ نمبر	شعر نمبر	حوالہ	اختلاف
۳۰۵	ا ۷	لب	رسم ہے یہ
۳۰۶	ا ۵	پ	آ مصحفی کی بہرِ عیادت
۳۱۰	ا ۶	د	ہم نام لے چکے ہیں
	ا ۳	سرور	صاحب کا نام کیا ہے
۳۱۱	ا ۸	حسرت	عبرت نے ابھی سے
۳۱۱	ا ۹	حسرت	مجھ کو ہنسونا
۳۱۱	ا ۱۷	د	ہرجائی ہو
۳۱۳	ب ۵	سرور	کی تر ہوتی ہے
۳۱۵	ب ۱۶	پ	شعلہ سر بلند کرے
۳۱۷	ب ۱۱	د	آئنہ رہے
۳۱۷	ب ۱۵	د	مرے منہ سے
۳۱۸	ا ۱۳	آصفیہ	کھنار لنا ہاے
۳۱۹	ا ۱۰	پ، لک، لب	ہے تجھ پہ تو
۳۲۰	ا ۸	حسرت	اُس کے جرم میں (سہو کتابت)
۳۲۱	ا ۱۱	لب	اوروں سے ہے یہ
۳۲۳	ب ۴	اصل، د	تم کو گلے لگا کے
۳۲۴	ا ۸	د	نعش پر ناصح کی
۳۲۶	ا ۱۲	حسن	ہے نہاں
〃	〃	پ	ہیں یہاں
۳۲۶	ا ۱۳	حسن	نہ کر ہم کو ہوس
۳۲۶	ب ۱۳	حسن	کسی دیوار گلستاں
۳۲۷	ا ۱۶	د	جیسے تصویر دکھائی
۳۲۸	ا ۴	لا، لب، پ	حنا کے ساتھ ہی
۳۲۹	ا ۱۰	لب، پ	کیوں نہ کروں

صفحہ نمبر	شعر نمبر	حوالہ	اختلاف
۳۲۹	۱۳ ب	پ، لا، لب، د	اکثیر (؟)
۳۲۹	۸ ا	سرور	جب سے کہ شمشیر طلا کی
۳۳۵	۱ ب	پ	چاہ اپنی دکھا گئے
۳۳۵	۲ ا	پ	صبح آنے
۳۳۵	۴ ب	اصل (حاشیہ پر) لا، لب، پ، د	نظریں چرا گئے
۳۳۶	۶ ب	پ	عیش کو کیا کیا نہ چاہیے
۳۳۷	۱۵ ب	لب	پر چشم ناتواں
۳۳۹	۲ ا	د	اب دل بتنگ آیا ہے
۳۳۹	۵ ا	لب، د	فراقِ سیم تناں
۳۳۹	۱۰ ب	لا، حسرت	دل ترا پھر جائے
۳۳۹	۱۷ ب	پ	گر اس طرح
″	″	لا	کہ اس طرف
۳۴۲	۸ ا	لک	دکھایا کس کو
۳۴۲	۱۱ ب	پ	زور و طاقت کرتے
″	″	لک	صبر بہ طاقت کرتے
۳۴۶	۲ ب	لا	پس یاں بھی نہ کچھ فکر
″	″	د	پس یاں بھی فکر
۳۵۰	۵ ا	د	جس سے تھا
۳۵۳	۲ ا	گلزار	جو دیکھیں
	۲ ب	گلزار	بنا خورشید

فرہنگ

اپجنا: (ہ) پیدا ہونا، جی میں آنا

اَٹّی: (ہ) سوت کی لچھی

اٹیرن ہونا: (ہ) چکرا جانا

اچپلا: شوخ اچپلاہٹ، اچپلائی: شوخی

چتون میں وہ لگاوٹ، سرے کی وہ گھلاوٹ
پھر قہر یہ سجاوٹ، یہ اچپلائیاں ہوں
—— انشا

اچان چک: (ہ) اچانک، دفعتاً

اچوک: (ہ) خطا نہ کرنے والا

احتیاج: (ع) ضرورت، حاجت

احتیاط: (ع) حفاظت،

جوشِ جنوں کے ہاتھ سے فصلِ بہار میں
گل سے بھی ہو سکی نہ گریباں کی احتیاط
—— درد

احسنت: (ع) خوب، آفریں

ارنڈ: (ہ) بڑے بڑے پتوں والا ایک درخت، جس کے پتے مہندی لگا کر باندھے جاتے ہیں۔

اشتباہ: (ع) گمان، شبہ

آشتی: (ف) صلح، دوستی

اغوا: (ف) ورغلانا

افتاد: (ف) طرز، مصیبت

افترا باندھنا: (ا) بہتان لگانا

اک ڈال: (ہ) بے جوڑ

اکتانا: (ہ) دل برداشتہ ہونا، گھبرانا

اگلنا: (ہ) نکالنا، تلوار کا نیام سے باہر نکل پڑنا

الجھیڑا: (ہ) جھگڑا، مصیبت

تیری زلفوں کے نہ الجھیڑے میں جو کوئی پھنسے
وہ جہاں جائے کسی طرح نمودار نہ ہو
—— انشا

الّا: (ع) سوا، مگر

الی الان کما کان: (ع) اب تک ہے جیسا کہ تھا

امچور: (ہ) بمعنی لاغر، سوکھا ہوا

امڈنا: (ہ) جمع ہونا، نکلنا

امتلا: (ع) بدہضمی، جی متلانا

امعا: (ع) انتڑی

انباز: (ف) ساتھی

اولی الابصار: (ع) بصیرت والا

اول جلول: (ہ) لاطائل، بے معنی

اورام: (ورم)

اوگھٹ: (ہ) ناہموار، دشوار

ادجھڑ: (ہ) ضرب

امین: (ع) بے خوف

اینٹھنا: (ہ) روٹھنا، خفا ہونا، اکڑنا

بالاپوش: (ف) لحاف، پلنگ پوش

بان: (ہ) تیر، ایک قسم کی ہوائی

باجنا: (ہ) مشہور ہونا، موسوم ہونا (گنوار: فرہنگ آصفیہ)

لیک یہ کر گیا ہے ایسا کام
کہ سدا باجتا ہے اس کا نام
—بیان

بالادست: (ف) زبردست، غالب

بافندہ: (ف) بننے والا

بادگولے کا درد (ہ) تلّی کا درد

بالا (ہ) چھوٹا

بار (ف) اجازت، دخل

بدنا (ہ) شرط لگانا

برن (س) بھیس

بسارنا (ہ) بھلانا

بسرنا (ہ) گزرنا

ماہِ گزشتہ کا حال انشاؔ کہوں سو کیونکر
مر مر بسر گئے ہیں دن اور رات تیسوں
—انشا

بسان (ف) مانند

بسان نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنّا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں ناچار بیٹھے ہیں
—انشا

بلوا: ہنگامہ۔ حملہ

جان و دل پر لشکر آرائی تھی جوشِ یاس کی
مفت اس بلوے میں شب خونِ تمنّا ہو گیا
—مومن

بندھنا (ہ) سوراخ ہونا۔ چھدنا۔ پرو دیا جانا

بھڑنا، جا بھڑنا (ہ) مقابل ہونا، لڑنا

جا ہی بھڑا اس صفِ مژگاں سے آج
دل تو بڑا سا ہی جگر کر گیا
—سودا

بھچک (ہ) حیران

بھگواں (ہ) گیروا

بھال (ہ) تیر کی نوک، برچھی

بھڑا دینا (ہ) لڑا دینا

بھبوکا (ہ) شعلہ، چمک

فیضِ صحبت سے جویاں دل کے بھبوکا نہ ہوا
خلوتِ داغ میں کب مرہم کافور گیا
—قائم

بہ شدن (ف) اچھا ہونا

بہلہ (ف) چمڑے کا دستانہ

بیمِ گسستن (ف) ٹوٹنے کا خوف

بے نقط گالیاں سنانا (ا) بے محابا گالیاں دینا

بے سروبن (ف) بے سروپا، ناپید اکنار

بیژن گیوین گودر کے بیٹے کا نام جو دخترِ افراسیاب پر عاشق ہونے کے جرم میں کنوئیں میں قید کیا گیا۔

بیر (ہ) مخاصمت، دشمنی

بے ہیچ (ف) بیکار، بے سبب

پانو توڑنا (ہ) دوڑنا، پریشان کرنا

پاستاں (ف) قدیم

پات (ہ) پتّا

پٹ ہیٹھ (ہ) محلل، ملاوٹ

ٹھنڈک کو انکھڑیوں کی وہ ترپھلا لگا دو
جس میں کہ آنولے کی پٹ ہو نہ ہو بہیڑا
—انشا

پَیچ (ہ) ضد، جانب داری

پیچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے
— غالب

پَچّپر (ہ) میخ ۔ کھپّچی

پدید آنا (ا) ظاہر ہونا

پرچنا، پرچانا (ہ) دل موہ لینا

پدر کی یاد بھولا کیونکہ اس کو پرچاؤں
الٰہی اس کا نہ دو دکھ دیکھوں کاش مرجاؤں
فضلی: کربل کتھا/۲۷۶

پُرا (ہ) قطار

تسلیم کے سواروں نے گھوڑے دیے ملا
اور ان میں پیدلوں کا بھی آکر پرا ملا
— دبیر

پَرچھا کر دینا (ہ) بھیڑ کم کر دینا، مختصر کرنا

ہنس کے بولا یار، میں مارے خوشی کے مر گیا
قصہ طولانی تھا، دو باتوں میں پرچھا کر دیا
— آتش

پرکالہ (ف) صحیح پرگالہ: آصفیہ/اول: ۶۰۱، چنگاری

پروایا (ہ) زیر پایہ، چارپائی کے پایوں کے نیچے رکھنے کی چیز (اصل میں پر پایہ تھا)

پلنگی کرنا (ا) لڑنا؟ بے سبب الجھنا

پل (ف) نقدی، پیسہ

پنڈا (ہ) جسم

پَنپنا (ہ) سرسبز ہونا، موٹا، صحت مند ہونا

پوچ (ہ) کمزور

پھینٹا (ہ) سرپیچ، چھوٹی پگڑی (فرہنگ اصطلاحات)

پھٹکار (ہ) بددعا (فرہنگ آصفیہ)

پھبن (ہ) زیبایش

پھبنا (ہ) زیب دینا

پھکیت (ہ) پٹے باز

پیزار (ف) جوتی

پیپلامور: پیپلا موڑ (صحیح پیپلا مول: آصفیہ ۱/۲۴۲) دار فلفل

پے لینا (ا) پتا لگانا

"نعمان لعین نے گھوڑے کے پاؤں کی پے لی"
فضلی، کربل کتھا/۱۰۹

تاو (ہ) حرارت، غصہ، تختۂ کاغذ

تاپاک، تپاک (ف) اضطراب، بے چینی

تبخالہ (ف) چھالا

تردستی (ف) مہارت

ترسانا (ہ) للچانا، جھوٹی امید دلانا

ترسا (رومی) اصطلاحی، نصرانی آتش پرست "چونکہ یہ لوگ عموماً خوبصورت ہوتے ہیں اور نیز اہلِ اسلام کے عقائد کے موافق کافر، پس اس وجہ سے شعرا اکثر معشوق کو اس نام و صفت سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔" آصفیہ ۱/۶۷۴

ترپھلا (ہ) ہڑ، بہیڑا، آنولہ

تڑقنا، تڑخنا (ا) پھٹنا

تزئین (ع) آرایش

تطاول (ع) ظلم ۔ غرور ۔ گستاخی

تعب (ع) رنج، تکلیف

تجبیہ کرنا (ا)، ملا دینا

تف (ف)، بھاپ

تفحص (ع) تلاش، جستجو

تلاشی: کوشش سے کہی گئی

تودہ (ف) نشانہ بازی کے لیے بنایا گیا مٹی کا ڈھیر

توتیا باندھنا، توتیا جوڑنا (ہ) الزام لگانا

میں نے چلایا جو تجھ کو اے رنگیں — مجھ سے ہر ایک بدگمان ہوا
توتئے جوڑتی ہے کیا کیا خلق — جی لگانا بلائے جان ہوا

— رنگین

تھمانا (ہ) روکنا۔ باز رکھنا

تھان (ہ) روضہ، مزار

تھانا مارنا (ہ) سپاہیوں کا چڑھ آنا

تھپکانا (ہ) آہستہ آہستہ چوٹ لگانا

تھانک (ہ) پرندوں کی کمیں گاہ

تئیں (ہ) واسطے لیے " یہ لفظ اپنے کے ساتھ مستعمل ہے۔ جیسے اپنے تئیں کچھ غرض نہیں۔ پہلے غیر کے ساتھ بھی بولتے تھے جیسے تیرے تئیں، اس کے تئیں وغیرہ" آصفیہ

تیورانا (ہ) چکر آنا، غش آنا، آنکھوں کے آگے اندھیرا آجانا

تیمار: توجہ، علاج

ٹک (ہ) کچھ، ذرا

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

— میر

ٹلنا (ہ) جگہ سے ہٹنا۔ سرکنا

ٹوکنا (ہ) تعرض کرنا، سوال کرنا، نظر لگانا

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

— مظہر جانجاناں

ٹھٹکنا (ہ) اچانک رک جانا، تامل کرنا

ٹھٹک کر وہ گھوڑے کا چلنا سنبھل
ہما کے وہ دونوں طرف مورچھل

— میر حسن

ٹھٹھولیاں (ہ) تمسخر، چھیڑ چھاڑ

جاں کن (ف) اذیت دینے والا

جریب (گریک کا معرب: آصفیہ ۲/۳۹) پیمائش کی زنجیر، لاٹھی

جعد (ع) گھونگریالے بال، چوٹی

جگردار (ف) بہادر

جنجال (ع) مصیبت، وبال

جوشش (ف) جوش

جھمکا (ہ) چمک، جھمکنا (ہ) چمکنا

جھونک (ہ) لچک

جھپکی (ہ) جھلک

جھیلنا (ہ) برداشت کرنا

جھانولی (ہ) جھلک، آنکھ کا اشارہ

جھکجھولا، جھکجھورا (ہ) چمک، ہچکولے

مت دوپٹے سے میاں چہرے کو اتنا کھول موند
لائے گا اس ڈھب کے جھکجھوروں کی کب مہتاب تاب

— قائم

جی چلنا (ہ) خواہش ہونا، جی چلانا = دلیری کرنا، خواہش کرنا۔

جی چلا: دلیر

آزاد نے منجملہ اور محاوروں کے اسے بھی مقامی محاورہ بتایا ہے۔ لیکن اس محاورے کو اکثر اساتذہ نے استعمال کیا ہے:-

ہوسِ جمالِ حبیب ہو تجھے کچھ، دلا تو کلیم وش
نہ وہ لن ترانی ادھر کی سن، ارنی ہی کہنے پہ جی چلا
— انشا

جی چلا بوسے پہ یاں ہم سے طلبگاروں کا
اڑ گیا رنگ وہاں یار کے رخساروں کا
— نصیر

بن بلائے ہم تو اس کوچے میں جا سکتے نہیں
دل تو چلتا ہے بہت پر جی چلا سکتے نہیں
— معروف

آہ ظالم نے کچھ نہ مانی بات
میں تو اپنا سا جی چلا گزرا
— سوز (بحوالہ صادم)

چارشانا (ف) مضبوط، تندرست

چت (ہ) نظر، خیال، دل

چت چڑھنا: دل میں کھبنا

یہ کون تیرے چت پہ چڑھا ہے بتا مجھے
جرأت کچھ ان دنوں ترا منہ سا اتر گیا
— جرأت

چترنی (ہ) چالاک عورتوں کی چار قسموں میں سے ایک (پلیٹس)

چٹکلا باندھنا (ہ) شگوفہ چھوڑنا

چٹّی (ہ) دھونس۔ نادان۔ ضرر

چٹیلا (ہ) زخمی، چوٹ کھایا ہوا

چشم رکھنا (ا) امید رکھنا

چگل: ترکستان کا ایک شہر جہاں کا حسن مشہور ہے۔

چلبلاہٹ (ہ) شوخی، شرارت

چمپی (ہ) جسم کی مالش

چمال (ف) ناز سے چلنے والا

چمک (ہ) کسک، درد

چمّنی (ہ) سرخ چھوٹا نگ

چنگا (ہ) تندرست

چنت (ہ) چین جامہ

چونا، چو پڑنا (ہ) ٹپکنا

چوکنا (ہ) خطا کرنا، بھولنا

چورنگ: نشانہ، برش شمشیر کی ایک قسم

نگاہِ یار یوں دل پر مرے ہر بار پڑتی ہے
پیا پے جس طرح چورنگ پر تلوار پڑتی ہے
— شیدا

چھلنا (ہ) فریب دینا

ہے تری چشم وہ غزال کہ شوخ
جن نے لاکھوں شکاریوں کو چھلا
— قائم

چھپنا (ہ) لیپا جانا۔ مٹّی سے بند کرنا

چھب (ہ) حسن، آرائش

چھلاوا (ہ) غولِ بیابانی، شہابہ

چھن جانا (ہ) چھلنی ہو جانا

چہچہا (ہ) خوش الحانی

چہچہا: شوخ سرخ رنگ

چیتنا (ہ) ہوش میں آنا، جاگنا

چیرا (ہ) بعض فارسی کے شعرانے بھی چیرہ باندھا ہے: آصفیہ
ایک قسم کی منقش پگڑی۔

حدّت (ف) تیزی

حرمت (ع) عزّت، عظمت

حرز (ع) تعویذ

حکّاک (ع) مہر کن، کھودنے والا

حلقہ بگوش (ف) غلام

حلّہ (ع) لباس

خارخار (ف) خواہش۔ بے کلی

خروس (ف) مرغا

خشونت (ف) سختی

خصومت (ع) دشمنی، عداوت

خصم (ف) دشمن

خمیازہ (ف) انگڑائی

خوش ڈول (ا) خوش وضع

خوں دار (ف) قاتل

خوندار کشتگانِ وفا غیر بار نیست
خونم حنائے پائے تو شد پا ئمال شد
تاثیر (آنند راج)

دانگ (ہ) درم کا چوتھا حصّہ

دائر (ع) گھومنے والا

دادخواہ (ف) فریادی

داڑ مارنا (ہ) زور زور سے رونا

مستی میں شرم گنہ سے میں جو رویا داڑھیں مار
گر پڑا بیخود ہو واعظ جمعے کو منبر سمیت
—میر

داعیہ (ع) دعویٰ

دبکنا (ہ) چھپنا

در تنگ (ف) تامّل، ڈھیل

درک (ع) عقل، دریافت

درّاج (ع) تیتر

دغدغہ (ع) خوف

دلو (ع) ڈول

دم کھانا (ہ) دم نہ مارنا، خاموش ہو جانا
مرغانِ باغ سے نہ ہوئی میری دل کشی
نالے کو سن کے وقتِ سحر دم ہی کھا رہے
—میر

دم باز (ا) فریبی
کیا کیا دیے دم اس نے باتیں بنا بنا کر
دم باز کے تصدّق، اس گفتگو کے صدقے
—جرأت

دم دینا (ا) بہکانا
یا تو دم دیتا تھا وہ یا نامہ بر بہکائے تھا
تھے غلط پیغام سارے کوں یاں تک آئے تھا
—مومن

دنبال (ف) پیچھے

دوالمیان، دلمیان: پٹکے میں لگی ہوئی تھیلی
کاش اس تاش کی دلمیان کے بدلے انشا
وہ پھرا کر مجھے اک سنگِ فلاخن مارے
انشا

دولاب (ف) رہٹ

دوگانا (ف) دوہرا، جڑواں

دوش (ہ) الزام

دوکھنا (ہ) دوشنا، عیب لگانا

مجھ کو دوکھا جو کسی نے تو وہ بولے واے
ایک میرا ہے وہ لاکھوں کے برابر عاشق
— انشا

دوسار ہونا (ہ) تیر کا ترازو ہونا

دھج (ہ) طرز، انداز

دھویا دیدہ ہونا (ا) شوخ چشم، بے باک، بے غیرت ہونا

دھڑکا (ہ) خوف

ڈانک (ہ) نگینے کے نیچے لگایا گیا سنہری یا روپہلی ورق

کیا چمک لختِ جگر کی ہے بہ زیرِ اشکِ چشم
عشق نے اچھا دیا یہ ڈانک گوہر کے تلے
— جرأت

ڈانڈنا (ہ) تاوان لینا

ڈھلڈھلی (ہ) ڈھیلی ڈھالی

ڈنڈ (ہ) بازو

ڈول (ہ) وضع، انداز

رام کرنا (ا) قابو میں لانا، مسخر کرنا

رباط (ع) سرائے، عمارت

رکیک (ع) ذلیل، کمزور

رکھائی (ہ) بے التفاتی

جی چاہتا ہے بولیں پر بولتے نہیں ہیں
ہو دیں اگر تو باہم ایسی رکھائیاں ہوں
— انشا

رلنا، رل جانا (ہ) مل جانا۔ آزاد نے اس محاورے پر

بھی اعتراض کیا ہے مستند لغات کے علاوہ اساتذہ کے کلام سے اس کی سند مل جاتی ہے۔

ہر ذرّہ خاکِ تیری گلی کی ہے بے قرار
یاں کون سا ستم زدہ ماٹی میں رل گیا
— میر

چاہے ہے اگر کل کو تری نشو و نما ہو
دل کھول کے دانے کی طرح خاک میں رل آج
— قائم

رمنا، رم کرنا (ا) بھاگنا، نفرت کرنا

جوشِ قلق نے اس کو بھی دیوانہ کر دیا
پہلے تو اس کی طبع و تحمل میں رم نہ تھا
— مومن

رنڈی (اصل لفظ رانڈی تھا: آصفیہ) عورت

روزر (ف) روزینہ، اجرت

ریس (ہ) مقابلہ، حرص

ریو (ف) دھوکا، فریب

زور:۔ بہت۔ غضب۔ خوب

زہِ داماں (ف) دامن کا کنارا

ستھراو پڑنا (ہ) مقتولوں کا فرش ہونا

انداز سے جدھر وہ قدم پا و پڑ گیا
کوسوں ادھر دلوں ہی کا ستھراو پڑ گیا
— ظفر

ستھوری (ہ) زچہ کو پلایا جانے والا ایک طرح کا مشروب

سری (ہ) خدنگ

سرول (ف) چوکھٹ

سزا (ف) سزاوار
سم لینا (ا) گھوڑے کا ٹھوکر کھانا
سمیت (ف) زہریلا ہونا
سمکھ (ہ) سامنے
سندران (ف) نہائی
سیانا ہونا (ا) سنِ تمیز کو پہنچنا۔

شست و شو (ف) دھونا
شط (ع) دریا
شلائیں: شوخ

صداع (ع) دردِ سر
صرفہ (ف) خست
صعب (ع) دشوار، سخت

طرف ہونا (ا) مقابل ہونا
طعمہ (ع) رزق، لقمہ
طمّاع (ع) لالچی
طولِ امل (ع) درازیِ امید

عاریت (ع) مستعار
عبیر (ع) ایک خوشبودار سفوف
عبّاسی: گلِ عبّاسی (ایک پھول)

عسل (ع) شہد
عسس (ع) کوتوال
علف: سبز چارہ
علوئے چشم (ف) آنکھوں کا اٹھنا

غرّہ (ع) غرور
غرفہ (ع) جھروکا، برآمدہ
غمیں (ف) غمگین، آزردہ (پلیٹس)
غش (ع) کھوٹ

فتّان (ع) فتنہ انگیز
فرو (ف) کم رتبہ
فضیحت (ع) بدنامی
فندق (ع) بیر کی برابر ایک سرخ پھل
مجازاً سرِ انگشتِ حنائی

قابیل (سریانی) حضرتِ آدم کے بیٹے کا نام جس نے اپنی
بہن اقلیما کے حسد میں ہابیل کو مار ڈالا۔
قلیاں (ف) حقّہ
قفا (ع) پیچھے
قمرغہ (ف) شکار گاہ (اسٹین گاز)
قور (ع) خدم و حشم
قوس (ع) آسمان کی نویں برج کا نام، جس کی شکل
کمان جیسی ہے۔

قہ (ت ۹) بڑے استاد، بہت گہرے

ہیں گین باز ایک کھلاڑی بڑے ہی قہ
آسان نہیں ہے مارنا کچھ ان کی گوٹ کا
—— انشا

کبادہ (ف) نرم کمان

کٹھالی (ہ) چاندی، سونا گلانے کی پیالی
(پنجاب میں کٹھالی کہتے ہیں۔ آصفیہ ۳/۴/۴۷)

کٹّی (ہ) دھار دار، نیمچہ

کُڈھب (ہ) بے ڈھب، بے طور

پامالیِ عاشق کو منظور رکھے جانا
پھر چال کڈھب چلنا ٹھوکر نہ لگانا بھی
—— میر

کُرنڈ (ہ) دھار تیز کرنے کا پتھر

یہ باڑہ میری کاٹ کی دی کس نے اس قدر
جو تم رگڑ رہے ہو سر دہی کرنڈ پر
—— انشا

کر (ف) بہرا

کسبی (ع۔ف) پیشہ ور، ہنر والا

کسوت (ع) لباس

کسمسانا (ہ) بل کھانا، انگڑائی لینا

کُلنا (ہ) ٹیسیں مارنا، درد ہونا

کم بغل (ف) مفلس

کماچی (ہ) بربط

کوس (ہ) آستیں کا کف

کوکنار (ف) پوست، خشخاش کا دوڈا

کولی (ہ) آغوش

لے لوں اسے کولی میں اگر میں تو عجب کیا
بے مرہم ابھی زخم مرے دل کا بھر آئے
—— جرأت

گات (ہ) بدن، چھاتی

جس نے باندھے ہوئے گاتی تجھے دیکھا پھڑکا
دل رباشے تھی، مری جان! تری گات نہ تھی
—— آتش

گچ (ف) چونا

گدیلا (ہ) روئی کا گدا

گردہ (ف) نقاش کا خاکا

گرد باندھنا (ا) شرط کرنا

گلِ خورشید (ف) سورج مکھی

گل تکیہ (ا) رخسار کے نیچے رکھنے کا تکیہ

کیا نیند آئے ہو جو یہی رات بھر خیال
گل تکیہ کے عوض کوئی مخمل سا گال ہو
—— ناسخ

گل اندود کرنا (ا) لیپا جانا

گہار، گوہار (ہ) ہجوم کا حملہ

گہنا (س۔ گرہن) پکڑنا

اب جی کے ڈر سے اس کو یہاں تو نہ چھوڑیو
ہیں مرد دے کہ بانہہ کو جس کی گہا گہا
—— بیاں

لال : بمعنی گنگ

زباں لال کہاں اور مدحِ تاجِ خروس
گرا ہے خاک پہ کیا حلِ افسرِ طاؤس
—— مومن

لاگ (ہ) نفرت

لائی (ف) درد، تلچھٹ

لانگنا (ہ) عبور کرنا، اوپر سے گزرنا

لٹنا، لٹ جانا (ہ) کمزور، دبلا ہو جانا

شب میر سے ملے ہم، اک وہم رہ گیا ہے
اس کے خیال میں ہے، اب تو گیا بہت لٹ
—— میر

لٹ پٹی (ہ) ٹیڑھی بانکی، بے قرینہ

لچھن جھڑنا (ہ) رونق نہ رہنا

لزج (ع) چپکتا ہوا

لولی (ف) رقاصہ، لولیِ فلک : وینس

لونی (ہ) شور

مانا (ف) مانند

مبنّت (ع) منقّش، ابھرے ہوئے نقش رکھنے والا

مبصّر (ع) بینا

مبتذل (ع) حقیر، بے قدر

متّہم (ع) تہمت لگایا گیا

متصل (ع) متواتر

محرمات (ع)، ایک قسم کا کپڑا ؛ فارسی والے بالتشدید بروزن مقدمات استعمال کرتے ہیں ؛ آصفیہ ۴/۳۰۵

محرّف (ع) ٹیڑھا

محبوس (ع) مقیّد

محضر (ف) حکم نامہ، عرض داشت

مخدوش : کٹا پھٹا، جلا ہوا

مخطّط (ع) خط نکلا ہوا

مدّعی (ع) دشمن، مخالف

مدرکہ (ع) عقل

مزمن (ع) پرانا مرض

مسکانا (ہ) پھاڑنا

مشبّک (ع) جالی دار۔ سوراخ رکھنے والا

دکھ کے تیشوں سے مشبّک ہے مرا دل اے عشق!
چھیڑنے کو تو عبث خانۂ زنبور گیا
—— قائم

مصدر (ع)، منبع، صادر ہونے کی جگہ

معاد (ع) جائے بازگشت، عقبیٰ

مفتاح (ع) کنجی

مقرنس۔ بلند عمارت

مُمیّز (ع)، نیک و بد میں تمیز کرنے والا

منفک (ع) جدا

منہنال (ہ) سرہنے

مُنعقد (ع) پروئے ہوئے
مہوس (ع) کیمیاگر
مہلت (ع) بمعنی اجازت

ناجی (ع) نجات پانے والا
نافرماں (ف) ایک پھول
"گلی است کہ از زبان بقفا گویند"
ا۔ ر

نالش (ف) گریہ وزاری
نادِ علی : ایک دعا جو کندہ کرا کے بچوں کے گلے میں ڈالتے ہیں۔ فضلی کہتے ہیں :

نازل اوس حق ہوئی ہے نادِ علی
حلِّ ہر مشکل ہیگی یا دِ علی
کربل کتھا/۳

ناوُرد (ف) جنگ وجدل
نافع (ع) فائدہ مند
ناتمام (ف) خام
نبڑنا (ہ) ختم ہونا
نبات (ع) مصری
نپٹ (ہ) بالکل، نہایت
نخست (ف) اوّل
ندان (ہ) آخرکار

نعوذ باللہ (ع) پناہ مانگتے ہیں ہم خدا سے
نسر طائر : اڑتے ہوئے پرند کا ہم شکل ستاروں کا ایک جھرمٹ
نفیخ = نفخ (ع) اپھارا، پیٹ پھولنا
نکتوڑا (ہ) نخرا
نوچہ : نوجوان
نہرنی (ہ) ناخن گیر

دام (ف) قرض
داشد (ف) کشادگی، شگفتگی

ہابیل :۔ دیکھیے قابیل
ہاموں (ع) میدان۔ جنگل
ہدف (ع) نشانہ
ہرزہ گردی (ف) آوارہ گردی
ہرزہ درائی (ف) بیہودہ گوئی
ہنر کرنا (ا) کرتب دکھانا
ہیزم (ف) جلانے کی لکڑی

یک دست (ف) ایک داؤ کا نام
یکّہ یاز (ف) شہسوار

مرتبہ:۔ نورنقوی

بہ:۔ ڈاکٹر محمد حسن

نوشت سوانح)

تبہ: حفیظ عباسی

ڈاکٹر محمد حسن

:۔ نورنقوی

ہلی

نہ، دہلی